۱۸۵۷ء کے مجاہد

یہ اسلامیہ دہلی

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن بہادر ا
اولوالعزم مجاہدوں نے اپنی جان کی باز
لگائی اُن کے مفصل و مستند سوانح حیات

غلام رسول مہر

کتاب منزل لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کوئی صاحب ناشر کی اجازت کے بغیر اس کتاب کا کلی یا جزوی حصہ بھی شائع نہ کریں

۹۲۱٫۳۲۵۴
م ۹۴۱

۲۱۷۳۵

مصنف ——— غلام رسول مہر

طابع ——— شیخ نیاز احمد

مطبع ——— ملی پرنٹنگ پریس لاہور

ناشر ——— کتاب منزل لاہور

اشاعت ——— دوسری بار ۱۹۶[illegible]ء

۱۸۵۷ کے مجاہد

جن بہادر، جانباز اور اولوالعزم مجاہدوں
نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو کامیاب
بنانے میں نمایاں حصہ لیا اور وطن کو
آزاد کرانے میں جان کی بازی لگائی،
ان کے مستند اور مفصل سوانح حیات۔

•

غلام رسول مہر

فہرست

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۱	مقدمہ	۷
۲	حضرت محل	۱۲
۳	رانی لکشمی بائی	۳۰
۴	عظیم اللہ خاں	۷۶
۵	سید احمد اللہ شاہ مدراسی	۱۰۱
۶	ڈھونڈو پنت نانا	۱۳۷
۷	جنرل بخت خاں	۱۶۳
۸	شہزادہ فیروز شاہ	۱۸۶
۹	مولانا فضل حق خیرآبادی	۲۰۰
۱۰	مولانا لیاقت علی الہ آبادی	۲۲۲
۱۱	تانتیا ٹوپے	۲۲۳

نمبر شمار		صفحہ نمبر
۱۲	مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں	۲۳۸
۱۳	بزرگانِ دیوبند	۲۵۰
۱۴	نواب علی بہادر اور نواب تفضل حسین	۲۵۸
۱۵	خان بہادر خاں	۲۶۹
۱۶	نواب محمود خاں	۲۷۸
۱۷	کنور سنگھ اور امر سنگھ	۲۸۵
۱۸	نواب مموخاں	۲۹۲
۱۹	مولانا پیر علی اور سید اکبر زماں	۲۹۷
۲۰	مولانا فیض احمد، مولانا کافی اور حکیم سعید اللہ	۳۰۵
۲۱	مختلف اصحاب	۳۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

۱۸۵۷ء کی ترتیب و تسوید شروع کی تھی تو اس کتاب کا خواب و خیال بھی نہ تھا جسے اب پیش کر رہا ہوں۔ یقیناً بعض ممتاز مجاہدین آزادی کے حالات سامنے تھے۔ لیکن یہی تصور کرکے بیٹھا تھا کہ عام واقعات کے سلسلے میں وہ حالات بھی آجائیں گے یا ضرورت محسوس ہوئی تو مناسب مقامات پر چند سطروں کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

نصف سے زیادہ کتاب مرتب ہو چکی تو احساس ہوا کہ اس میں افراد و رجال کے سیر و سوانح کو شامل کرنا سراسر نامناسب ہوگا، اس لیے کہ اصل کتاب اپنے موضوع اور اسلوب بیان کے لحاظ سے تاریخی ہے اور سیر و سوانح کا دائرہ بالکل جداگانہ ہے۔ دونوں میں پیوند کی حیثیت وہی ہوگی جیسے دو مختلف المزاج جسموں میں امتزاج پیدا کیا جائے۔

بالآخر فیصلہ کرنا پڑا کہ افراد و رجال پر الگ کتاب لکھی جائے۔ جن عزیمت دوست اور حمیت پرور شخصیتوں نے اپنی بیش بہا زندگیاں مقصد آزادی کے لیے وقف کیں، ان کی ایک بڑی یادگار یہی ہو سکتی ہے کہ ان کے سوانح مرتب ہو جائیں اور عام لوگ ان سے عزیمت و حمیت کے سبق لیں۔ یہ حقیقت بھی محتاج تصریح نہیں کہ سیر و سوانح کے ذریعے سے قوموں کے

لیے بصیرت و موعظت کا جو سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعے سے غالباً فراہم نہیں ہو سکتا۔

ناانصافی ہوگی اگر میں اعتراف نہ کروں کہ مجھ سے پیشتر بھی بعض اصحاب نے اس کام کے سرانجام کی کوشش کی، لیکن اول معلومات کا سرمایہ بہت معمولی تھا۔ دوم انداز ترتیب شخصیتوں کی عظمت کے شایان شان نہ تھا۔ سوم شخصیتوں کے انتخاب میں ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی پر حصر نہ کیا گیا بلکہ بعض ایسی شخصیتوں کو بھی شامل کر لیا گیا جو یقیناً حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا پا کر انڈیمان پہنچیں، تاہم یہ ابتلاء ۱۸۵۷ء کے سلسلہ میں پیش نہ آئی تھی، بلکہ وہ معاملہ بالکل جداگانہ تھا مثلاً :

۱:۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری یقیناً انڈیمان بھیجے گئے اور وہاں انھوں نے اٹھارہ سال گزار دیے، تاہم یہ سزا سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کو امداد دینے کے سلسلے میں ہوئی تھی، نہ کہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں۔

۲:۔ مولانا احمد اللہ صادق پوری، مولانا یحییٰ علی صادق پوری اور مولانا عبدالرحیم صادق پوری بھی محولہ بالا جرم میں سزایاب ہوئے تھے۔ نہ کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں شرکت کے باعث، اگرچہ مولانا محمد جعفر کے متعلق ایک روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ ۱۸۵۷ء میں چند آدمیوں کے ساتھ دہلی پہنچے تھے اور چند روز وہاں لڑے نیز مولانا احمد اللہ ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں کچھ مدت نظر بند رہے تھے۔

۳:۔ منیر شکوہ آبادی کو بھی یقیناً انڈیمان بھیجا گیا تھا، لیکن انھیں یہ سزا اس لیے ملی تھی کہ مصطفیٰ بیگ نام ایک شخص نے نواب جان طوائف کو قتل کر کے تزویر سے منیر کو الجھا لیا تھا چنانچہ منیر اپنے طویل قصیدۂ ابتلائیہ میں کہتے ہیں :

مصطفیٰ بیگ ایک صاحب ان میں تھے
کج روی میں بڑھ کے چرخ پیر سے ،

کر کے خونِ ناحق نواب ہمان
مجھ کو بھی پھنسوا دیا تزویر سے

۴۔ اسی طرح مولانا امام بخش صہبائی، مفتی صدرالدین آزردہ اور نواب مصطفےٰ خان شیفتہ یقیناً ہدفِ ستم بنے۔ لیکن انھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ غرض میرا مقصد یہ تھا کہ صرف انھیں اصحابِ عزیمت کے حالات لکھے جائیں، جن کی سرگرمیاں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو کامیاب بنانے کے لیے وقف رہیں۔

صحیح اور مستند حالات کی فراہمی جتنی مشکل اور پریشان کن تھی، اس کے بارے میں کیا عرض کروں؟ شاید اربابِ علم و فضل کتاب کے ملاحظے سے ایک حد تک اندازہ فرما سکیں کہ مجھے کیا کیا زحمتیں اٹھانی پڑیں اور یہ کام کس درجہ دشوار و مشقت طلب تھا۔ یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ میں نے لکھ دیا ہے اُسے حرفِ آخر سمجھنا چاہیے۔ اپنی کم سوادی کا تہِ دل سے اعتراف کرتا ہوا صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ ان اوراق میں آگیا ہے، اس سے پیشتر غالباً کسی بھی زبان میں یکجا نہیں ہو سکا۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نہ تمام مجاہدوں کے پورے حالات فراہم کر سکا، نہ میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ تھا اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کے سوا جن لوگوں نے مختلف حصوں میں کام کیا اور ان کا ذکر نہیں آیا، وہ صفِ مجاہدین میں شامل ہونے کے حقدار نہ تھے۔ جو سرمایۂ معلومات تاحال فراہم ہو سکا، اُسے اپنے تصور کے مطابق لباسِ ترتیب پہنا دیا، آئندہ جو کچھ معلوم ہوگا اس کی روشنی میں اضافہ و ترمیم کا عمل جاری رہے گا۔

بعض اہم شخصیتیں اس تذکرے میں دانستہ شامل نہ کی گئیں مثلاً بہادر شاہ ظفر یا زینت محل یا بعض دوسرے اکابر۔ وہ اس لیے کہ ان کے زیادہ تر حالات تذکرۂ دہلی کے ضمن میں بیان ہو چکے تھے اور تکرار مناسب نہ تھی۔ بعض شخصیتوں کے نام یا کام سرسری طور پر ضمناً درج ہو گئے اور ان کے لیے الگ عنوانوں کے تحت مستقلاً کچھ نہ لکھا گیا، اس لیے کہ زیادہ معلومات

دستیاب ہی نہ ہو سکیں۔

۱۸۵۷ء کے مجاہدوں کی سیرتوں کا مرقع اس انداز میں پہلی مرتبہ پیش ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہیں کہیں فرو گزاشتیں محسوس ہوں یا بعض پہلو تشنۂ تکمیل نظر آئیں تاہم امید ہے کہ خوانندگان کرام اس کتاب کو مختلف حیثیتوں سے اپنی نوعیت کا بالکل نیا مرقع پائیں گے۔

یہ ان بلند ہمت اور اولوالعزم شخصیتوں کے سوانح ہیں، جنھوں نے اس دور میں آزادی کے لیے جان کی بازی لگائی، جب اصل مقصد کے لیے تحسین و ستایش کا اندازہ بھی عوام کے ذہنوں میں صورت پذیر نہ ہوا تھا۔ انھوں نے جو کچھ کیا، اس کی غرض یہ نہ تھی کہ دنیا کی زبان پر ان کے کارناموں کی مدح کے ترانے جاری رہیں وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ملک آزاد ہو جائے۔ اور اجنبی حکومت کا نقش باطل حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے۔ انھوں نے شدید تاریکی میں زندگی کے چراغ روشن کرنے کی کوشش کی اور اس غرض سے اپنا خونِ حیات اس بے پروائی سے بہایا کہ دوسروں کو شاید اس طرح پانی کے چند چلو بہانے میں بھی تکلف ہو۔

ان کے کارناموں پر ایک سو سال کی مدت گزر چکی ہے۔ ان میں سے بیشتر کے نام بھی غالباً اکثر اصحاب کو معلوم نہ ہوں، انگریزوں نے اقتدار و تسلط بحال ہو جانے کے بعد ان سابقین کی بے مثال قربانیوں کے موازنے کا موقع ہی نہ آنے دیا، لیکن خلوص و بےنفسی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی قدرت ضائع نہیں ہونے دیتی۔ انھوں نے تو بہت بڑے عمل کے لیے قدم اٹھایا تھا اور جو خواب دیکھا تھا، اس کی تعبیر آج سب کے سامنے ہے۔ حق و انصاف کی میزان کا فیصلہ یہی ہے کہ انھوں نے جو بیج ۱۸۵۷ء میں بویا تھا اور اسے اپنی زندگی کے لہو سے سینچا تھا، وہ نوے سال کے بعد پھل لایا۔ انگریزی حکومت اپنی بے پناہ قاہری کے باوجود مٹ گئی۔

آج ہر احسان شناس قلب میں ان مجاہدین کی یاد تازہ ہونی چاہیے، جو ایک سو سال پیشتر انتہائی مشکلات میں اپنا فرض احسن طریق پر بجا لاتے ہوئے خوفناک صبر آزمائیوں کی منزل سے کامیاب و کامگار گزر گئے۔

میں اداے فرض کے سلسلے میں فرقہ وار تفریقات کا قائل بھی نہیں اور انھیں پسندیدہ بھی نہیں سمجھتا، لیکن آپ دیکھیں گے کہ اس جہاد میں سب سے بڑھ کر اور صد درجہ ممتاز حصّہ مسلمانوں نے لیا۔ بلاشبہ وہ تعداد میں بہت کم تھے۔ لیکن جوش آزادی کی بیکرانی اور قربانیوں کی فراوانی کا یہ عالم تھا کہ دوسرے لوگ باوجود کثرت تعداد ان سے منزلوں پیچھے رہ گئے۔ یہ اس دور میں مسلمانوں کی شان امتیاز تھی، جب اس ملک پر بے بسی کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں جس قوم کا حصہ سب سے بڑھا ہوا تھا اور جس نے عارضی ناکامی کے بعد نقصان بھی سب سے زیادہ اٹھائے، کیا یہ امید بے جا سمجھی جائے گی کہ اس جہاد کی یادگار منانے کی سب سے بڑھ کر حقدار قوم وہی ہے؟

مسلم ٹاؤن۔ لاہور

۱۷- مارچ ۱۹۵۶ء

مہر

حضرت محل

واجد علی شاہ کے حرم میں

نواب حضرت محل کے ابتدائی حالات کی نسبت اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ ان کا نام "امراؤ" تھا۔ ۲۳ رجب ۱۲۶۱ھ (۲۸ جولائی ۱۸۴۵ء) کو حضرت علیؓ کے میلاد کی مجلس میں، واجد علی شاہ نے کہ ابھی ولی عہد تھے امراؤ کو دیکھا اور داخل محل کر لیا۔[1] وہ خود لکھتے ہیں کہ امراؤ:

> امن و امان کے ذریعے سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پسند خاطر ہو کر میرے گھر پڑ گئی۔ حسب معمول "مہک پری" خطاب دے کر تعلیم رقص و سرود میں مشغول کر دی گئی ہے۔

واجد علی شاہ نے ولی عہدی کے زمانے میں ایک "پری خانہ" قائم کیا تھا جس میں خوبصورت عورتیں داخل کی جاتی تھیں اور وہ رقص و سرود کی تعلیم پاتی تھیں۔ امراؤ بھی پہلے اسی پری خانے میں پہنچی۔

برجیس قدر کی پیدائش

شعبان ۱۲۶۲ھ میں امراؤ کے بطن سے فرزند پیدا ہوا۔ واجد علی شاہ کا بیان ہے:

> مہک پری کے حاملہ ہونے کا مژدہ میں نے سنا۔ ہزار ہزار سجدۂ شکر قاضی الحاجات کی درگاہ میں ادا کیے اور مہک پری کو پردے میں بٹھا کر "افتخار النساء خانم صاحبہ" خطاب عنایت فرمایا۔[2]

---

[1] تاریخ اودھ حصہ پنجم ص ۶۹ ، [2] ایضاً ص

بعد انقضائے ایام مقررہ فرزند ارجمند لخت جگر اس کے بطن سے پیدا ہوا۔ لڑکے کے دادا امجد علی شاہ نے بصد ہزار خوشی و خرمی گیارہ ضرب توپ سلامی اور مبارکباد کی چوکیاں بٹھائیں اور لڑکے کو مرزا برجیس قدر بہادر کا خطاب مرحمت فرمایا۔[1]

اس سے واضح ہے کہ مہک پری کا اعزاز بھی کا پہلا عقب تھا۔ اسی لیے افتخار النساء خطاب ملا اور وہی برجیس قدر کی والدہ تھیں۔ مولوی نجم الغنی رامپوری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہک پری افتخار النساء کوئی اور خاتون تھی، جس کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہوا اور دو چار ہی دن زندہ رہ کر مرگیا۔[2]

برجیس قدر کی تاریخ پیدائش کہیں نظر سے نہیں گزری۔ چونکہ شعبان ۱۲۷۳ھ میں اس کی گیارھویں سالگرہ منائی گئی، لہٰذا میں نے اس کی تاریخ پیدائش شعبان ۱۲۶۲ھ (جولائی و اگست ۱۸۴۶ء) قرار دی۔ امجد علی شاہ اس وقت زندہ تھے۔ وہ صفر ۱۲۶۳ھ (فروری ۱۸۴۷ء) میں فوت ہوئے اور برجیس قدر خطاب انھیں کا تجویز کردہ تھا۔ لہٰذا میری قرار دادہ تاریخ عین قرین صواب ہے۔ برجیس قدر کا اصل نام رمضان علی تھا۔ واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو بعض دوسرے محلات کے علاوہ افتخار النساء خانم امراؤ، والدۂ برجیس قدر کو بھی "محل" کا درجہ عطا کیا اور "حضرت محل" کا خطاب تجویز ہوا۔[3]

قدرت کے عجائبات

ظاہر ہے کہ حضرت محل کے ان حالات میں کوئی بھی بات ایسی نہ تھی جس سے اس کی آئندہ عظمت و عزت کی کوئی کرن یا کوئی جھلک نمایاں ہوتی۔ وہ بالکل معمولی ماحول میں پیدا ہوئی۔ وقت کے عام اوضاع و اطوار کی رو میں بہتی ہوئی شاہی محل کے اندر پہنچی۔ زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ حسن ظاہری سے اُسے

---

[1] محل خانہ شاہی ص۸۰ ، [2] تاریخ اودھ حصہ پنجم ص۱۱۵

[3] محل خانہ شاہی ص۱۲۷، ۱۲۸

حصۂ وافر ملا ہوگا۔ شاہی محل میں داخلے کے لیے اس کے پاس یہی ایک دستاویز تھی۔ پھر اُس زمانے کے لکھنؤ خصوصاً شاہی محل کے احوال وظروف میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو حضرت محل کے خداداد عقلی اور اخلاقی محاسن کے لیے مہمیز بن سکتی۔ ان احوال وظروف میں عشرت آرائیوں اور کامجوئیوں کے سوا کیا رکھا تھا؟ "ناسزا" کاموں کے کرنے کا بھی ایک "سزاوارانہ" طریقہ ہوتا ہے۔ وہاں کی تو عشرت آرائیاں بھی عام روایتوں کے مطابق "ناسزا" انداز میں کی جاتی تھیں۔ نہ احوالِ روزگار سے آگاہی، نہ حکمرانی کی ذمہ داریوں کا احساس، نہ یہ خیال کہ خدا نے جو بلند ترین منصب عطا کیا ہے، اس کے فرائض و واجبات ٹھیک ٹھیک ادا نہ کیے گئے تو مآل و انجام کیا ہوگا۔ حضرت محل کے قلب و جگر کی حرارت بڑی ہی بے پناہ ہوگی۔ جو اس برفستان میں پہنچ کر بھی مائل بہ افسردگی نہ ہوئی اور بارہ سال تک برابر ملتہب و شعلہ زن رہی۔ جب سازگار وقت آیا تو حضرت محل نے عورت ذات اور پردہ دار ہونے کے باوجود اس گرمجوشی اور بلند ہمتی سے میدانِ عمل میں قدم رکھا کہ جوانمردوں کو بھی اس پر رشک آنا چاہیے۔ پھر بڑی بڑی ترغیبات کے باوجود وہ رجعت پر آمادہ نہ ہوئی اور محکومی کی فارغ البال زندگی کے بجائے غربت و بے وطنی کی تنگ حالی خوشی خوشی قبول کرلی۔ یہ قدرت کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ تھا، جو لکھنؤ کے شاہی محل کی اُس خاتون کے پردے میں حیرت افزائے عالم ہوا۔

جنگِ آزادی

حضرت محل نے قصرِ شاہی میں زندگی کے دس بارہ سال چُپ چاپ گزار دیے۔ واجد علی شاہ نے تخت نشینی کے بعد خاص محل کے لیے پانچ ہزار، بعض محلات کے لیے تین تین ہزار اور باقی کے لیے دو دو ہزار روپے مقرر کر دیے تھے۔[1] حضرت محل آخری گروہ میں شامل تھی۔ گویا اُسے دو ہزار ماہوار ملتے تھے۔ ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۲ھ (۷ فروری ۱۸۵۶ء) کو واجد علی شاہ معزول ہوئے اور کلکتہ کا سفر اختیار کیا، حضرت محل، ان بیگمات میں شامل نہ تھی جنھیں شاہ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ وہ بدستور قیصر باغ میں رہی

۱؎ محل خانہ شاہی ص ۱۲۵؛

محلات کے لیے جو وظیفہ مقرر ہوئے تھے، ان میں سے حضرت محل کا حصہ اُسے مل جاتا۔ محل محمد خاں، عرف ممو خاں اس کا داروغہ اور منتظمِ امور تھا۔

۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں جنگِ آزادی کا پہلا شعلہ نمودار ہوا۔ پھر پے در پے جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھی اور لکھنؤ تک بھی اس کی لپیٹ جا پہنچی۔ اس کی ابتدا فوج سے ہوئی تھی، پھر عوام شامل ہوئے۔ حضرت محل بے چاری محل نشین اور پردہ دار۔ ان کے لیے بطورِ خود کیوں کر ممکن تھا کہ باہر نکل کر سپاہ کی تنظیم کرتی یا کسی جیش کی قیادت سنبھال لیتیں؟

نظامت امور کا مسئلہ

چند روز تک فوج کے مختلف دستے اور ان کے ساتھی عوام یا مختلف رؤسا و امرا ہنگامہ آرائی میں مشغول رہے۔ پھر خیال آیا کہ نظمِ امور کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔ بعد غور و مشورہ قرار پایا کہ نواب سعادت علی خاں کی اولاد میں سے کسی کو مسندِ حکومت پر بٹھایا جائے لیکن کوئی موزوں شخص نہ ملا۔ ایک رکن الدولہ نواب محمد حسن خاں تھے جو سب کچھ چھوڑ کر بیلی گارد میں محصور انگریزوں کے پاس جا بیٹھے تھے۔ پھر امجد علی شاہ کے فرزند میرزا رضا علی بہادر "دارا سطوت" کا نام تجویز ہوا۔ انھوں نے جواب دیا کہ انگریزوں سے تو نواب شجاع الدولہ بھی عہدہ برآ نہ ہو سکے، ہم اپنی عافیت کیوں تنگ کریں؟ آخر سوچا گیا کہ واجد علی شاہ کے فرزندِ اکبر میرزا محمد علی حیدر بہادر "نوشیرواں قدر" کو بادشاہ بنا لیا جائے لیکن وہ معذور و مصروع تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی جگہ واجد علی شاہ میرزا محمد حامد علی خاں بہادر کیواں قدر کی ولی عہدی کا اعلان کیوں کرتے؟

برجیس قدر کا انتخاب

جب ہر طرف سے ناکامی کا سامنا ہوا تو ممو خاں اور شیخ احمد حسین نے راجا جے لال سنگھ نصرت جنگ سے کہا کہ میرزا رمضان علی بہادر برجیس قدر کو کیوں نہ مسند نشین کر لیا جائے؟ راجا نے جواب دیا کہ فوج تو برجیس قدر کو بھی منظور کر لے گی لیکن یہ ضروری ہے کہ شاہی محل کی تمام بیگمات اس پر رضامندی کی مہر ثبت کر دیں۔

چنانچہ بیگمات کو جمع کیا گیا۔ گفتگو چلی تو کوئی بیگم واضح بات نہ کرتی تھی۔ حضرت محل نے سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہہ دیا کہ یہ تمھارا لڑکا ہے، جیسا تم سب مناسب جانو، کرو۔ نواب خورد محل نے کہا کہ

ہمیں تو راضی نامے پر مُہر کر دینے میں تامل نہیں، لیکن اگر کلکتے میں انگریز واجد علی شاہ کو اس بنا پر موت کی سزا دے دیں تو کیا ہوگا؟ ساتھ ہی ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ برجیس قدر نہ ہو۔ جیسا مناسب جانو خود کرو، دوسری بیگمات کو اس میں نہ الجھاؤ۔

غرض یہ مشورہ بیچ میں رہ گیا۔ ادھر ممو خان نے تجویز سوچ لی کہ ہم فوج کے افسروں کو جمع کرتے ہیں۔ اگر وہ بہ طور خود اتفاق کر لیں تو بیگمات سے راضی نامہ حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ سمجھی گئی۔

شاید خیال ہو کہ حضرت محل اپنے بیٹے کو بادشاہ بنانے کے لیے مضطرب تھی حقیقت یہ ہے کہ بیگمات کا اتفاق عمل مقصد کے لیے کام کے بہترین مواقع پیدا کر سکتا تھا، ورنہ اندیشہ تھا کہ قدم قدم پر تفرقہ رونما ہو جائے گا گویا اتفاق اصل کام کے احسن سرانجام کا وسیلہ تھا۔

شرائط اور مسند نشینی

۱۲- ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ (۵ جولائی ۱۸۵۷ء) کو اتوار کا دن تھا۔ سارا دن شدت کی بارش ہوتی رہی۔ شام کے چھ بجے راجا جے لال سنگھ فوجی افسروں کے ہمراہ قصر خاقانی میں آئے اور میرزا برجیس قدر کو دیکھا۔ اس وقت میرزا کی عمر دس سال کچھ مہینے کی تھی۔ بعض افسروں نے کہا کہ بچہ بہت چھوٹا ہے، فوجوں کی قیادت کیا کرے گا؟ بعض نے کہا کہ بہت خوب صورت ہے، رزم و پیکار کی سختیاں برداشت نہیں کر سکے گا۔ آخر انھوں نے مندرجہ ذیل شرطوں کے ساتھ برجیس قدر کی مسند نشینی منظور کر لی:

۱- شاہ دہلی کے پاس عرضداشت بھیجی جائے۔ وہ منظور کر لیں تو یہ رئیس رہیں گے، خواہ[1] ان کے لیے بادشاہی تجویز کریں یا وزارت[2]

۲- فوجیوں کو تنخواہ دُگنی ملے گی یعنی چھ روپے کی جگہ بارہ روپے۔

---

[1] نوابان اودھ کا ابتدائی لقب نواب وزیر تھا۔ مارکوئیس ہیسٹنگز نے شاہ دہلی کی قدر و منزلت کم کرنے کی غرض سے غازی الدین حیدر کو بادشاہ بنایا۔ فوجیوں کا مدعا یہ تھا کہ برجیس قدر کے لیے بادشاہی یا غازی الدین حیدر سے پیشتر کی طرح وزارت کا عہدہ تجویز کرنا شاہ دہلی کی رائے پر موقوف رہے۔

[2] شاہ دہلی کی منظوری اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ جو تحریک جاری ہوئی تھی اس میں مرکزی حیثیت شاہ کی تھی۔ لکھنؤ کو دہلی سے الگ کرنے کے ذمہ دار انگریز تھے۔

٣۔ ہر پلٹن کے افسر فوجی تجویز کریں گے۔

٤۔ نائب دیوان کے تقرر و برطرفی کا معاملہ بھی فوجیوں کی صواب دید پر موقوف رہے گا۔

٥۔ فوجیوں کی جو تنخواہ انگریزوں کے ذمے رہ گئی ہے، وہ بھی ادا کی جائے گی۔

یہ شرطیں منظور کر لی گئیں۔ شہاب الدین خاں اور سید برکت احمد نے مسند پر میرزا برجیس قدر کو بٹھانے کی رسم ادا کی اور مبارکباد دی۔ فوجی افسروں نے نذریں دکھائیں۔ فیض آبادی توپ خانے کے صوبیدار جواہر سنگھ نے انہیں توپ سلامی کی سر کیں۔ شرف الدولہ کو وزیر اعظم، ممو خاں کو نائب ریاست بنایا گیا اور ناصر الدولہ خطاب دیا۔ درحقیقت بیگم حضرت محل تمام امور کے متعلق خود مشورے کرتیں اور سب احکام ان کی منظوری سے جاری ہوتے۔ شہر میں منادی کرا دی گئی "خلق خدا کی، ملک بادشاہ دہلی کا، اور حکم میرزا برجیس قدر بہادر کا"۔[1]

دوسرا بیان

مولوی نجم الغنی فرماتے ہیں کہ شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ بہت سے رئیسوں کے گھر بار ویران ہو چکے تھے، راجا جے لال سنگھ نے ان بے اعتدالیوں کو روکنے کی غرض سے حکومت کا انتظام ضروری سمجھا۔ جب وہ حضرت محل کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور میرزا کی مسند نشینی کی استدعا کی تو حضرت محل بہت مضطرب ہوئیں اور سوچا کہ جس فوج نے آقائے قدیم کے متعلقین کو اذیت پہنچانے میں تامل نہ کیا، وہ خدا جانے ہمارے ساتھ کیا سلوک کرے۔ نیز برجیس قدر کی کم عمری کا ذکر کیا۔ ممو خاں اور حسام الدولہ کی رائے بھی یہی تھی۔ جب دیکھا کہ سپاہ فتنے کی طرف مائل ہے تو مناسب یہی سمجھا گیا کہ استدعا قبول کر لی جائے ورنہ جس امر کا اندیشہ ہے، وہ اسی وقت ظہور میں آجائے گا، یعنی فوج ہنگامہ برپا کر دے

---

[1] یہ تمام حالات قیصر التواریخ جلد دوم سے ماخوذ ہیں۔ (ص۲۲۱ - ص۲۲۲)۔ سین نے لکھا ہے کہ شرف الدولہ وزیر اعظم، مہاراجا بالکشن وزیر مال، راجا جے لال وزیر جنگ اور ممو خاں چیف جسٹس مقرر ہوئے لیکن تمام امور کی باگ ڈور خود بیگم کے ہاتھ میں تھی "اٹھارہ سو ستاون" انگریزی مصنفہ سریندر ناتھ سین ص۲۱۔

[2] تاریخ اودھ حصہ پنجم ص۲۴۲ - ص۲۴۵

گی اور جیز ابر جیس قدر کو حاکم بنا لے گی۔

اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ حضرت محل نے مجبوری کی حالت میں برجیس قدر کا حاکم بننا منظور کیا اگر مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی نہ مانتی۔

اگر یہ درست تھا تو انگریزی فوج کے آتے ہی حضرت محل کیوں سوالگی پر آمادہ نہ ہوئی؟ جب انگریز لکھنؤ پر قابض ہو گئے اور حضرت محل نے باہر نکل کر جنگ شروع کی یا نیپال بھاگ گئیں تو انگریزوں نے بار بار پیغام بھیجے تھے کہ واپس آجاؤ اور یہاں چاہو رہو، باقی عادہ وظیفہ ملے گا۔ ان پیغامات کو کیوں قبول نہ کر لیا؟ میرے نزدیک یہ بیان حالات کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا۔

دہلی دربار سے تعلق برجیس قدر کی حکومت ۵ جولائی ۱۸۵۷ء سے ۱۶ مارچ ۱۸۵۸ء تک رہی یعنی آٹھ مہینے اور گیارہ دن۔ اس اثنا میں جو کچھ ہوا ان میں بہت قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ مرکز دہلی سے رشتہ تعلق استوار کرنے کی کوشش کی گئی اور فوج کے ساتھ یہ بھی عہد ہوا تھا کہ دہلی سے برجیس قدر کے لیے منظوری حاصل کی جائے گی۔ چنانچہ احمد کے فرزند عباس میرزا سفارت کے لیے تجویز ہوئے۔ وہ حضرت محل کی مقربہ خاص میرزائی بیگم کے داماد تھے۔

ایک عرضداشت لکھی گئی اور اس کے ساتھ مندرجہ ذیل تحائف سفیر کے حوالے کیے:

ایک تاج مع کیسۂ زریں میں، ایک مروارید کی مالا، ایک جوڑی نورتن، گلے کا ایک زیور، جسے دھکدھکی کہتے ہیں، دست بند (دیدنی)، ایک سو اکیس اشرفی، ایک ہاتھی جس کا حوضہ نقرئی اور جھول کارچوبی تھی، دو گھوڑے مع ساز نقرہ۔ دو ہزار روپے سفیر کو خرچ راہ کے لیے دیے گئے۔ ساتھیوں میں سوا سو پیادے تھے، پچیس سوار، دو چوبدار تھے، آٹھ ہرکارے، دو شتر سوار، سولہ کہار، چار فراش مع خیمہ وغیرہ۔

سفیر ۲۳ ذی حجہ ۱۲۷۲ھ م ۱۴ اگست ۱۸۵۶ء کو براہ جہ نپا بادر روانہ ہوا۔ مراد آباد میں ڈپٹی ولایت حسین خاں نے دوستانہ مشورہ دیا کہ انگریز جرنیل سے مل لیا جائے۔ عباس میرزا نے جواب دیا کہ یہ خیانت مجھ سے نہ ہوگی

سفیر پہلے شاہدرہ میں اترا اور شہر میں خبر بھیجی۔ وہاں استقبال کا انتظام ہوا۔ مظفر الدولہ نواب سیف الدین حیدر خاں کے مکان میں قیام کیا۔ اس لیے کہ ان سے دوستانہ تعلق تھا۔

دربار میں حاضری

دہلی کا نظم و نسق اس وقت ابتر تھا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ سفیر اس کے توسط سے پیش ہو۔ پہلے نواب حامد علی خاں اس کام کے لیے تجویز ہوئے۔ سفیر کو یہ منظور نہ تھا لہذا خستگی راہ کا عذر پیش کر دیا۔ پھر نواب احمد قلی خاں اور زینت محل کے توسط سے سفیر پیش ہوا۔ مظفر الدولہ بھی ہمراہ تھے۔ بادشاہ نے دستخط خاص پر اپنے قلم سے لکھا کہ آفرین ہے ہم میں قدر بہادر تم نے چھوٹے سے سن میں بڑا کام کیا دودھ میں اخلاص قدیم ہے۔ آئندہ اور عطا ہوگا۔

سفیر نے تحائف پیش کیے، جن کی تفصیل سے واضح ہے کہ بعض بادشاہ کے لیے تھے اور بعض زینت محل کے لیے۔ دست بند مرصع خود حضرت محل نے زینت محل کیلیے بھیجے تھے

یہ وہی زمانہ ہے، جب دہلی پر انگریزوں کی گولہ باری شدت سے جاری تھی۔ سفیر ابھی رخصت نہ ہوا تھا کہ انگریزوں کا حملہ ہوا اور وہ شہر کے اندر داخل ہو گئے۔ ملکی فوج اور اہل شہر باہر نکلنے لگے۔ اس افراتفری کی حالت میں سفیر دہلی سے نکلا اور بہزار خرابی لکھنؤ پہنچا[1]

---

[1] سفارت کے حالات قیصر التواریخ جلد دوم میں ص ۱۲۰ ۔ ص ۲۲۲ اور ص ۲۴۲-۲۴۹ پر مرقوم ہیں میرزا غالب نے تحائف کی کیفیت یوں بیان کی ہے: ایک سواکیس اشرفی دو گھوڑے، دو ہاتھی، اچھوتے موتیوں کا ایک مرصع تاج، بازو بند الماس کی ایک جوڑی زینت محل کے لیے (کلیات نثر فارسی ص ۳۰) میرزا غالب مظفر الدولہ سیف الدین حیدر خاں کے عزیز دوست اور ہم نشین تھے جن کے مکان پر سفیر ٹھہرا تھا انھیں یقیناً مفصل حالات معلوم ہوں گے۔

رزم و پیکار

رزم و پیکار کی تفصیلی کیفیت پیش کرنے کا یہ محل نہیں، اس کا اصل مقام جنگ آزادی کی تاریخ ہے۔ لیکن یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ حضرت محل خود پردے سے نکل کر نہ فوجوں کی قیادت کر سکتی تھیں اور نہ براہ راست انتظامات اپنے ہاتھ میں لے سکتی تھیں۔ اس کا سارا کاروبار مشیروں کے ہاتھ میں تھا۔ البتہ اس میں شبہ نہیں کہ نازک سے نازک موقع پر بھی حضرت محل کے عزم و ہمت میں فرق نہ آیا اور ایک موقع پر وہ پردہ داری کے باوجود میدان جنگ تک بھی پہنچیں۔

برجیس قدر کی مسند نشینی کے وقت اس کے پاس چوبیس ہزار روپے نقد موجود تھے۔ وہ بے نام مشیروں کے حوالے کر دیے کہ ضروری خرچ چلائیں۔ پھر مختلف امرا اور دوسرے اصحاب سے روپے لیے گئے۔ لیکن سپہ میں نظم بالکل ناپید تھا۔ کوئی ایسا شخص موجود نہ تھا جو سپہ گری میں ماہر ہوتا۔ احمد اللہ شاہ موجود تھے لیکن دربار لکھنؤ کے متوسلین کو کسی اجنبی کی قیادت پسند نہ تھی۔ خود ان میں سے جو لوگ تھوڑی بہت صلاحیت رکھتے تھے، وہ باہمی رقابتوں کے چکر میں پھنس کر بے بس ہو گئے تھے۔

تلنگوں کی یہ حالت تھی کہ باتیں بہت بناتے، کام کچھ نہ کرتے۔ جب سنتے کہ انگریز پیچھے ہٹ رہے ہیں تو پیشقدمی میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے۔ جب دیکھتے کہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے تو مراجعت و اپس پائی میں بھی سبقت کا دامن نہ چھوڑتے۔

بیگمات کی حالت

بیگمات کی حالت حد درجہ عجیب و غریب تھی۔ تمام حالات سامنے رکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں دل سے برجیس قدر کی مسند نشینی پسند نہ تھی، لیکن کھلم کھلا مخالفت بھی نہ کر سکتی تھیں۔ جب خطرے کی خبر سنتیں تو بعض نکل جانے کے لیے سواریاں منگوا لیتیں، بعض کو غش آجاتا، بعض حضرت محل اور ممو خاں کو گالیاں اور کوسنے دینے لگتیں۔[1]

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۰۷

ایک موقع پر فوج نے فیصلہ کیا کہ جو انگریز بیلی گارد میں محصور ہیں، ان پر حملہ کر کے سب کو قتل کر دیا جائے۔ بیگمات میں سے فخر محل، سلیمان محل، فرخندہ محل، بیاتیں محل، محبوب محل، خورد محل، سلطان جہاں محل وغیرہ نے حضرت محل سے کہا۔

تم سب طرح سے اچھی رہیں۔ تمہارا بیٹا بادشاہ ہوا۔ مبارک ہو۔ مگر ہم سب بے وارث ہوئی جاتی ہیں۔ سب فوج کا یہ ارادہ سنا ہے۔ اب تمہیں انصاف کرو۔ کچھ بادشاہ اور محلات وغیرہ جتنے قید ہیں، سب زندہ بچائیں گے یا سب پھانسی دے جائیں گے؟ اپنی سلطنت کو چولہے میں ڈالو۔ جناب عالیہ حضرت محل نے برہم ہو کر جواب دیا۔ معلوم ہوا تم سب ہمارا برا چاہتی ہو بلکہ اس سلطنت کے ہونے سے جلتی ہو۔ مختصر یہ کہ اس وقت آپس میں ایسی چل گئی ہوئی کہ جناب عالیہ برجیس قدر کو لے کر اندر کے دالان میں چلی گئیں۔[1]

ظاہر ہے کہ اس قسم کے احوال و ظروف میں کسی زبردست مجاہدانہ اقدام کے لیے کیا گنجائش تھی۔ جو لوگ مخلص تھے، وہ بہت پریشان ہو گئے۔ مذکورہ بالا جھگڑا ان کے کانوں تک پہنچا تو حضرت محل کی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور کہا کہ معلوم ہوتا ہے، سب بیگمات انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں۔ اس میں ہماری تمہاری خرابی ہے۔ پھر کہیں ٹھکانہ نہ ملے گا۔[2]

بہترین فرصت

جنگ آزادی میں کسی بھی مقام کو اصلاح احوال، نظم امور، ترتیب عساکر اور استحکام وضعیت کے ایسے مواقع نہ مل سکے، جیسے لکھنؤ کو ملے۔ سرسری نقشہ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ آغاز میں انگریزی فوج بیلی گارد (ریزیڈنسی) کے اندر محصور ہو گئی تھی، اس وقت

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص۲۱۲ ۔ [2] ایضاً ص۲۶۴، ۲۶۵

سر ہنری لارنس تمام معاملات کا مالک و مختار تھا۔ وہ ۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو مہلک طور پر زخمی ہوا اور مر گیا۔ اس کے بعد محصورین سے یلی گارد خالی کرا لینا قطعاً مشکل نہ تھا، کیونکہ وہاں کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

۲۔ جنرل ہیوے لاک نے اواخر جولائی میں فتح کان پور کے بعد لکھنؤ کی طرف پیش قدمی شروع کی، لیکن پہلی ہی منزل سے اس کے لیے لوٹ جانے کے سوا چارہ نہ رہا۔

۳۔ ۴۔ اگست اور ۱۲۔ اگست کو ہیوے لاک نے پھر پیش قدمی شروع کی، لیکن دونوں مرتبہ مراجعت ہی پر مجبور ہوا۔

۴۔ ہیوے لاک کی جگہ آؤٹرم مقرر ہوا۔ یہ دونوں اواخر ستمبر میں لکھنؤ پہنچے، لیکن نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ نکلا کہ یہ لوگ بھی محصورین کے ساتھ محصور ہو گئے۔

۵۔ نومبر میں سرکالن کیمبل نے پیش قدمی کی۔ کامیاب بھی ہوا لیکن کان پور کے حالات اتنے نازک تھے کہ لکھنؤ کو سنبھالے رکھنے کی ہمت نہ پڑی اور محصورین کو نکال کر واپس چلا گیا۔

۶۔ فروری ۱۸۵۸ء میں دوبارہ پیش قدمی کی اور مارچ میں لکھنؤ فتح ہوا۔

گویا اہلِ لکھنؤ کو کم و بیش نو مہینے کی مہلت مل گئی تھی، لیکن حضرت محل کی کوششوں کے باوجود کچھ بھی نہ ہو سکا۔ کاش حضرت محل عورت کی جگہ مرد ہوتی یا اس کے اثر و رسوخ اور عزم و ہمت کا کوئی مرد قیادت کے لیے موجود ہوتا!

فوج کی دل دہی

مختلف لڑائیوں میں سب سے بڑھ کر مردانگی اور استقامت احمد اللہ شاہ اور شہزادہ فیروز شاہ نے دکھائی۔ حضرت محل برابر فوج کا دل بڑھاتی رہتی تھی۔ ایک جھڑپ میں جنرل بخت خاں کی توپیں چھن گئیں اور اسے بہت رنج ہوا۔ حضرت محل نے فرمایا: توپوں کے چھن جانے کا رنج نہ کرو، میں تمھیں اور دوں گی۔[1] ۲۳ ستمبر ۱۸۵۷ء کو ہیوے لاک اور آؤٹرم کی پیش قدمی کے وقت نگلے کے پیچھے سے نو راجا مان سنگھ نے آٹھ نو ہزار

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۱۲۔

سپاہی لے کر مقابلہ کیا۔ دست بدست لڑائی میں گورے بھی بہت کام آئے اور راجا کی سپاہ میں سے بھی دو ہزار کھیت رہے۔ حضرت محل نے اس جانفشانی وجاں نثاری پر راجا کو خطاب فرزندی و عطائے خلعت، دوشالہ، رومال کے علاوہ ملبوس خاص میں سے دوپٹا عطا کیا جو سب سے بڑا اعزاز تھا۔ نیز اس کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ بعد فتح روپیہ اور جاگیریں دے کر خوش کروں گی۔[2] فوج کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ایک مرتبہ بیگم عالم باغ کے سامنے نمودار ہوئی جہاں انگریز بیٹھے تھے اور ان پر پے در پے یورشیں ہو رہی تھیں لیکن افسوس انتہائی کوشش کے باوجود لڑائی کا رنگ بگڑتا گیا اور حالات ناسازگار ہوتے چلے گئے۔

انگریزوں کے پیغامات

آؤٹرم نے اس دوران میں بار بار حضرت محل کے پاس پیغامات بھیجے کہ لڑائی چھوڑ دیجیے:

۱۔ پہلے پیغام کا مفاد یہ تھا کہ ملک محروسہ سرکار کے موافق عہد شجاع الدولہ ملے گا۔

۲۔ پھر کہلوا بھیجا کہ لڑائی چھوڑ دو، ملک حوالے کر دیا جائے گا۔

۳۔ آخری مرتبہ کہا کہ پچیس ہزار روپے ماہوار ملیں گے۔

معلوم نہیں حضرت محل تک یہ پیغام پہنچے یا نہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آخری پیغام پر نواب ممو خاں اور ارکان دولت نے کہلوا بھیجا، ہمیں کیونکر یقین ہو کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے یہ درست ہے اور فریب نہیں؟ معلوم ہے لڑائی میں دھوکا اور فریب جائز سمجھا جاتا ہے۔ اگر اپنا وعدہ انجیل پر لکھ کر مُہر کر دو، نیز کسی مسلمان بادشاہ کی گواہی اس پر کرا دو تو ہم سمجھیں گے کہ قابل توجہ ہے۔ کسی نے کہا کہ مسلمان بادشاہ یہاں کہاں ہے، جس کی گواہی کرائی جا سکے؟ ممو خاں نے جواب دیا کہ راجا جنگ بہادر وزیر اعظم نیپال تو انگریزوں کے ساتھ فوج لیے لکھنؤ میں بیٹھا ہے۔ ہم اسی کی گواہی کو کافی سمجھ لیں گے۔[3] آخر یہ تجویز بھی بیچ ہی میں رہ گئی۔

---

۱ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۶۲ - ۲۶۷ ۲ بیہن کی کتاب ص ۲۲۹،

۳ " " ص ۲۲۴، ۲۲۵

لکھنؤ میں آخری اوقات

انگریزی توپوں کی گولہ باری بڑے زور سے جاری تھی لیکن حضرت محل نے مقابلہ جاری رکھا۔ ایک موقع پر اُن کی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ سید کمال الدین حیدر لکھتے ہیں:

> اگر گورے اس وقت سیدھے مکان فرحت افزا میں قریب چوکھی کے چلے آتے تو کیا عجب ہے کہ اس وقت جناب عالیہ، برجیس قدر مع صاحبات محل سب کو گرفتار کر لیتے۔[1]

خان علی خان نے زبردست مقابلہ کیا۔ گورے قیصر باغ میں داخل ہو چکے تھے:

> چمن پر نہر خون جاری تھی۔ ہر طرف لاشوں کا انبار تھا۔ گورے سمٹ کر سنگین بارہ دری میں ہو رہے تھے۔ پیچھے سے جنگ بہادر کی فوج نے آکر باڑھ ماری۔ سیکڑوں گر پڑے۔ آخر سب بھاگے۔ خان بھی زخمی ہوئے۔[2]

قیصر باغ سے روانگی

آخر حضرت محل کو قیصر باغ چھوڑنا پڑا۔ اور کس حالت؟ ۱۴ مارچ کو وہ دوسری بیگمات اور شاگرد پیشہ عورتوں کے ساتھ ملازمین باغ کے کوٹھوں پر سے ہوتی ہوئی گھسیاری منڈی کے پھاٹک سے باہر نکلی۔

> حلقۂ عورات صف بستہ ان کے پیچھے، برجیس قدر ایک ہیکل گود میں لدے چمٹے ہوئے، اوپر غالیچہ اور چاندنی رفع احتمال کو ڈالے ہوئے۔ جس نے راہ میں قافلہ ناموس شاہی کو دیکھا بے اختیار پیٹنے اور رونے لگا . . .

بہرحال گلیوں میں گرتی پڑتی ٹھوکریں کھاتی، ہر قدم پر الجھتی ہوئی ٹیلہ شاہ پیر جلیل سے گزر کے پل مولوی گنج پر پہنچیں۔ جواہر علی خاں نے اپنی پینس

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۲۳ ۔ [2] ایضاً ۔ ایضاً ۔

کہار آگئے ہوئے وہاں بھیج دیے تھے۔ قریب زوال شمس جناب عالیہ مع برجیس قدر اسی پینس میں سوار ہوئیں۔ باقی اور صاحبات محل وہاں سے متفرق ہو گئے۔

غربت کی پہلی منزل

یعنی گنج نخاس اور چوک ہوکر نس دروازے میں غلام رضا خاں کے گھر اتریں۔ اس میں مصلحت یہی تھی کہ خود بھی خطرے سے محفوظ رہے اور حضرت محل کو بھی محفوظ رکھے۔ چنانچہ عرض کیا کہ گورے میرے مکان سے بہت قریب ہیں۔ اگر خدانخواستہ کوئی خلاف امر پیش آئے تو میری روسیاہی کا باعث ہو۔ یہ سن کر حضرت محل وہاں سے نواب شرف الدولہ کے گھر گئیں۔ وہاں وسوسہ پیدا ہوا کہ شاید نواب اپنا رسوخ بڑھانے کے لیے گرفتار کرا دے۔ یہ خیال آتے ہی محل سرائے حسین آباد میں پہنچیں۔ اسی طرح دو راتیں مختلف مکانوں میں گزار دیں۔[1]

لکھنؤ سے رخصت

غرض بتاریخ ۲۹۔ رجب ۱۲۷۴ھ (۱۹۔ مارچ ۱۸۵۸ء) شام کے وقت برجیس قدر کو ساتھ لے کر پینس میں سوار ہوئیں۔ کچھ جواہرات لے لیے تھے کہ راستے میں ضرورت کے وقت کام دیں۔ موسیٰ باغ کے ناکے سے سواری نکلی۔ سریندر ناتھ سین کا بیان ہے کہ جو فوج ۱۹۔ مارچ تک موسیٰ باغ میں گرم پیکار رہی، اس میں زبردست جوش حمیت غالباً بیگم ہی نے پیدا کیا تھا۔[2]

لکھنؤ میں ایسے بے فکر لوگ بھی موجود تھے جنھیں احوال کی حد درجہ غم افزائی سے کوئی سروکار نہ تھا اور جو کچھ پیش آتا تھا، موقع محل کے مطابق تاریخیں کہتے رہتے تھے۔ چنانچہ قومی قوت کی پسپائی کی تاریخ بھی کسی نے کہہ دی جو صرف اس لیے پیش کی جاتی ہے کہ یہ اصل واقعہ کی یاد تازہ کرتی ہے:

مرزا رمضان علی ناکام، شد جانب کوہ چپل بیک تاز

---

[2] سین کی کتاب ص ۲۳۹۔ سین لکھتا ہے بیگم نے کبھی ہمت نہ ہاری (۲۴۰)

تاریخ روانگی بجستم   نیپال شناخت   ۶ آمد آواز

کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مسافت کیوں کر طے ہوئی۔ رات بھر کے سفر کے بعد صبح بھراؤں پہنچی۔ انگریزی دباؤ کے ماتحت لکھنؤ چھوڑ دینے کے بعد ان لوگوں سے اعانت کی کیا امید ہو سکتی تھی جو مرغ باد نما کی طرح صرف ہوا کے رخ پر پھر جانے کے عادی تھے۔ بھراؤں کا زمیندار راجا مردان سنگھ بھی غالباً ایسا ہی شخص تھا۔ اس نے اچھا برتاؤ نہ کیا، چوپال میں ٹھہرایا جو عام مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ تھی۔ کھانا طلب کیا گیا تو کہا پکنے پر پہنچا دیا جائے گا۔ آخر میں کہلا بھیجا کہ تمھارا ساتھ کیوں کر دیں۔ ہر طرف بینڈک کی طرح انگریز پھیل رہے ہیں۔ پیچھے پیچھے انگریز سانپ کی طرح لہرائیں گے۔

ایسی مصیبتیں ہر اس شخص کو پیش آتی ہیں جو راہ عزیمت میں قدم رکھے۔ مشکل کے وقت اپنے بیگانے بن جاتے ہیں جن کی نگاہیں پہلے گوشہ چشم التفات پر بھی رہتی تھیں، وہ طوطا چشمی اختیار کر لیتے ہیں۔ حضرت محل نے اس سلوک کو صبر سے برداشت کیا۔ پھر محمود آباد اور بسواں بازی ہوتی ہوئی خیرآباد پہنچی۔ ہر پرشاد ناظم قسمت خیرآباد اور مولوی عماد الدین عرف مولوی محمد، ناظم بسواں باڑی نے تین کوس باہر نکل کر استقبال کیا۔ بڑی دھوم دھام اور نقارہ و نشان کے ساتھ سواری کو شہر میں لے گئے اور مرزا بندہ علی بیگ کے امام باڑے میں اتارا۔ راستے میں دو ہزار روپے حضرت محل پر سے نچھاور کیے۔ سواری شہر میں داخل ہوئی تو سلامی کی توپیں سر کی گئیں۔[1]

اس طرف جانے کی غرض یہ تھی کہ بریلی پہنچیں جہاں انگریزوں کے خلاف محاذ قائم تھا۔ شاہ جہان پور میں مولانا احمد اللہ شاہ کے لیے امداد کا انتظام کیا۔ جب ادھر سے بھی ناساز گار خبریں ملیں تو بیگم نے نیپال کا رخ لیا اور تلسی پور ہوتی ہوئی نیپال کے مقام نیا کوٹ میں چلی گئیں۔

---

[1] یہ اور اوپر کی تمام تفصیلات قیصر التواریخ میں ماخوذ ہیں جلد دوم

غربت کی زندگی

نیاکوٹ میں قیام کی اجازت رانا جنگ بہادر نے پہلے دے دی تھی اور انگریزوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ بیگم کو حوالے نہ کروں گا۔ کچھ معلوم نہیں کہ گزارا کیوں کر ہوتا رہا۔ بتایا جاتا ہے کہ رانا جنگ بہادر نے پانسو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور یہ بھی کہہ دیا تھا کہ نیپال سے جانا صرف آپ کی مرضی پر موقوف ہے، ہم اس میں کبھی دخل نہ دیں گے۔

انگریزوں نے ایک مرتبہ اپنے ایک ہم قوم کو برجیس قدر کی تصویر اتارنے کے لیے نی
ت یوں پیش آئی کہ اندیشہ تھا کہیں کوئی شخص جعلی طور پر برجیس قدر
ے واجد علی شاہ نے اپنے جلاوطن بیٹے کی تصویر منگوائی ہو۔
س کے علاوہ بیگم کو یہ پیغام بھی دیا کہ فیض آباد یا لکھنؤ میں جو مقام پسند
مزا خور حال ملے گا۔ تعلیم و تکریم میں فرق نہ آئے گا۔ البتہ
نہ ہوگی۔ حضرت محل نے جواب دیا:
لیں گے تو وہ روپیہ کس مصرف میں آئے گا؟ مجھے یہاں رہنے
؟ آئندہ خدا کو اختیار ہے۔[1]
تھ گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ واپس آتے گئے۔ بعض گرفتار ہو کر آئے
ں کے دامن سے وابستہ رہی اور نیاکوٹ ہی میں ان سے وفات پائی۔ خود حضرت محل کی وفات ۱۸۷۹ء میں ہوئی۔ گویا اکیس سال جلاوطنی میں گزارے۔[2]

256
30
निया...
वि. प. नि

سین نے لکھا ہے کہ حضرت محل کے لیے واجد علی شاہ سے الگ موزوں وظیفہ تجویز ہوا تھا اور کہا گیا تھا کہ بیگم کی حیثیت کے مطابق اعزاز قائم رہے گا، مگر وہ واپسی پر راضی نہ ہوئی۔[3]
برجیس قدر غالباً آخری عمر میں کلکتہ آ گیا تھا، وہیں ۱۸۹۳ء میں وفات پائی۔ ایک روایت یہ ہے کہ اسے

---

۱ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۶۵، ۲ تاریخ اودھ جلد پنجم ص ۲۸۶،
۳ سین کی کتاب ص ۲۷۰،

زہر دیا گیا۔

مولانا شرر کا بیان مولانا عبدالحلیم شررؔ نے لکھا ہے،

لوگ حضرت محل کی مستعدی اور نیک نفسی کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ سپاہیوں کی نہایت قدر کرتی اور ان کے نام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھی، مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کر فوج کی سپہ سالاری کرتی، مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا۔ [1]

یہی مصیبت سلطانہ رضیہ کو بھی پیش آئی تھی۔ اس نے پردہ چھوڑا تو مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا ہوئی۔ حضرت محل پردے سے نہ نکل سکی اور اصل کام مرضِ اختلال میں پڑ گیا۔

ضروری گزارش مولانا شررؔ نے مشیروں اور سپاہیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر بحث کا موقع نہیں۔ تاہم یہ کہہ دینا چاہیے کہ کہیں سپاہی اچھے تھے اور ان سے کام لینے والے اچھے نہ تھے، کہیں کارفرما اچھے تھے اور سپاہی ان کے برابر نہ پہنچ سکے۔ یہ مصیبت اس لیے پیش آئی کہ جنگ آزادی کی آگ اچانک بھڑک اُٹھی۔ نہ سپاہ کو اصلح سالار چننے کا موقع مل سکا اور نہ اعلیٰ درجے کے کارفرماؤں کو سپاہ کی تربیت کے لیے فرصت میسر آئی۔ اس جنگ میں ناکامی کا اصلی اور بنیادی سبب یہی تھا۔ حضرت محل کے لیے اس سلسلے میں دوہری مشکلات تھیں۔ رفیقوں کی بے صلاحیتی کے علاوہ وہ مجبور تھی کہ اُنھیں پر بھروسا کرے، اس لیے کہ خود باہر نکل کر صحیح کارکنوں کا انتخاب نہیں کر سکتی تھی۔

---

[1] ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص۵۹،

مولانا فضل حق کے تاثرات

مولانا فضل حق خیرآبادی نے بھی "الثورۃ الہندیہ" میں حضرت محل کے متعلق اپنے مشاہدات اور تاثرات درج کیے ہیں۔ ان کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ جو لشکری پہلے سے لکھنؤ میں موجود تھے اور جو دہلی سے بھاگ کر آئے تھے، بیگم نے اُن سب کو اپنی پناہ میں لے لیا اور انھیں قدر و منزلت کے ساتھ جود و بخشش سے نوازا۔[1]

۲۔ قومی مخالفین کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ ایسی بُری طرح بھاگے کہ سرحدوں پر بھی نہ ٹھہر سکے۔ ملکہ اور اس کے لڑکے کو تن تنہا میں چھوڑ گئے۔ ان دونوں سے وقت پر بہت سے ارکان اور امیران سلطنت نے دغا کی[2]

۳۔ نصاریٰ اور ان کی پوری فوج اور مددگاروں نے اس محل شاہی کا، جس میں ملکہ تھی محاصرہ کر لیا۔ بیگم اپنے ولی عہد اور دو مصاحب عورتوں کو لے کر محصور محل کی پشت سے نکل کر دوسرے محلے میں پیدل تیزی سے پہنچ گئی۔[3]

۴۔ تین دن شہر میں رہ کر بھاگے ہوئے لشکر کو واپس لانے اور اس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ وہ لشکر دست گیری کو تیار نہ ہوا۔ آخر بیگم اپنے اعوان و انصار سے مایوس ہو کر ولی عہد اور چند ساتھیوں کو ہمراہ لیے چٹیل میدان کی طرف چل کھڑی ہوئی۔[4]

۵۔ پھر والیہ یعنی حضرت عالیہ اس لشکر کو جو بھاگ کر اس کی پناہ میں آ گیا تھا اور دوسرے ساتھیوں کو لے کر ایسے دریاؤں اور ندیوں سے گزری جن سے بغیر کشتی عبور دشوار تھا۔ وہ شمالی ملک میں دریا کے کنارے ایک گاؤں میں پہنچے

---

[1] باغی ہندوستان ص ۲۹۳-۲۹۱، [2] ایضاً ص ۲۹۵۔

[3] " " ص ۲۹۶، [4] " " ص ۲۹۷،

ساتھیوں کے ہمراہ اقامت گزیں ہوگئی اور دریا کے گھاٹوں پر سوار پیادے بٹھا دیے کہ تمام کشتیوں پر قبضہ کرلیں [1]

۶۰۔ اس نے انتظام رعایا اور حصول خراج کے لیے شہروں، قصبوں اور دیہات میں عامل بھیج دیے۔ لشکروں کو آراستہ کرکے اپنے دارالسلطنت کے قریبی مورچوں پر بھیج دیا، اس لیے کہ دارالسلطنت پر اب نصاریٰ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ [2]

گویا حضرت محل نے آخری وقت تک انگریزوں کے مقابلے میں بلکہ ان کی سرکوبی میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

وکٹوریہ کے منشور کا جواب

کمپنی کا راج ختم ہوگیا اور ہندوستان کو براہ راست تاج برطانیہ کی نگرانی میں لے لیا گیا۔ یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو ملکہ وکٹوریہ نے ایک منشور شائع کیا، جس میں مجرمین و معاونین قتل کے سوا سب کے لیے عفو کا اعلان کیا گیا تھا نیز والیان ریاست کے حقوق و احترام کی حفاظت کا وعدہ درج تھا۔ اس میں یہ بھی مرقوم تھا کہ سب کو قانون کی پناہ حاصل ہوگی۔

بعض طبقوں نے اس اعلان کی بڑی تعریف کی۔ بیگم حضرت محل نے اپنے فرزند برجیس قدر کی جانب سے اس کا جواب شائع کیا، جس کے بعض مطالب کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ [3]

۱۔ انگریزوں کے وعدۂ عفو پر ہرگز اعتبار نہ کرو۔ ان کا شیوہ ہی یہ ہے کہ کسی کا جرم معاف نہیں کرتے۔

۲۔ ملک کو کمپنی کی نگرانی سے نکال کر ملکہ کی نگرانی میں لے لینے سے اصل صورت حال

---

[1] باغی ہندوستان ص ۳۹۶، [2] ایضاً ص ۴۰۰، ۴۰۱،

[3] پورے اعلان کے لیے ملاحظہ فرمایئے کتاب کا ضمیمہ م ۱۔

میں کیا تبدیلی ہوئی جبکہ کمپنی کے قوانین اس کا بندوبست، اس کے ملازم اور اس کا عدالتی نظام بدستور باقی ہے؟

۳۔ ملکہ کہتی ہے کہ کمپنی کے تمام معاہدوں کو پورا کیا جائے گا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ لیا جا چکا ہے وہ بدستور انگریزوں ہی کے قبضے میں رہے گا۔ اسی سلسلے میں حضرت محل نے اودھ کے نقصانات، ضیاع سلطنت، انگریزوں کے تصرفات وغیرہ کی تفصیل بیان کی۔

۴۔ انگریزوں سے عفو جرم کی کوئی مثال کسی کے خواب میں بھی نہ آئی ہوگی۔

۵۔ کہا ہے کہ قیام امن کے بعد ہندوستانیوں کو رفاہ عامہ کے کاموں میں لگایا جائے گا۔ سڑکیں بنیں گی، نہریں کھدیں گی۔ گویا ہندوستانی صرف اسی کام کے لائق رہ گئے ہیں۔[1]

ٹائمز کے نامہ نگار کا بیان،

لندن ٹائمز کے نامہ نگار ڈبلیو ایچ رسل نے کہا حضرت محل کو لکھنؤ کے دفاع میں روح و رواں کی حیثیت حاصل تھی۔ اس نے پورے اودھ کو اپنے فرزند کی حمایت پر آمادہ کر لیا تھا۔ تمام امراء و زعما اس کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھا چکے تھے۔ ایسی سرگرمی عمل اور جوش و ہمت کی مثالیں ہر جگہ نہیں مل سکتیں،

بیگم نے انگریزوں کے خلاف لامتناہی جنگ کا اعلان کر دیا تھا اور انگریزوں نے فرمانروایان اودھ سے کیا سلوک کیا تھا؟ کیا اس حقیقت میں کوئی شبہ ہے کہ یہ بادشاہ نہایت نازک مواقع پر انگریزوں کو مالی امداد اور قرض دیتے رہے؟ مگر اس احسان کو یک قلم پس پشت ڈال دیا گیا، لہذا بیگم کا غصہ بے جا نہیں سمجھا جا سکتا۔[2]

---

[1] سین کی کتاب صفحہ ۳۵۷، ۳۵۸، [2] رسل کی ڈائری جلد اول صفحہ ۲۷۴، ۲۷۵،

[3] سین کی کتاب صفحہ ۳۷،

بے شک بیگم جنگ میں ہار گئی، مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اپنے شوہر و سرتاج کے مقابلے میں وہ مردانگی کے بدرجہا بہتر اوصاف سے مزین تھی۔ [1]

بصیرت و موعظت یہ حضرت محل تھی۔ اس نے وہ کام کر دکھایا، جو اس کے با اختیار شوہر سے نو سال کی شاہانہ زندگی میں نہ ہو سکا۔ کامیابی یا ناکامی سے بحث نہیں لیکن مجاہدین آزادی کے لیے حضرت محل نے عمل کا ایک نہایت قابل قدر نمونہ تو پیش کر دیا۔ یہ تو بتا دیا کہ عورت کی زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ کیا ہوتے ہیں۔ وہ عورت تھی، پردہ دار عورت۔ رزم و پیکار کے آداب و فنون سیکھنے کا اُسے کوئی موقع نہیں مل سکا تھا لیکن خدا نے اس کے پہلو میں ایک غیرت مند دل رکھ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ حریت و حمیت کے تقاضے کیا ہیں؛ آزادی تو ایسی شے ہے کہ تہمت کے طور پر بھی اس سے کسی کا انتساب ہو تو اس پر رشک ہی آنا چاہیے۔ عرفی کیا خوب کہہ گیا ہے:

حسد تہمت آزادی سر و دم بگداخت!
ایں مژدہ است کہ بر تہمت آں ہم حسد است

حضرت محل نے تو واقعی آزادی کے لیے جان کی بازی لگائی تھی۔ مشہور ہے کہ:

زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند!

لیکن حضرت محل نے پردے میں بیٹھے بیٹھے بھی وہ کارنامہ انجام دیا جس کی توفیق مردوں میں سے بھی بہت کم کو ملی۔ [2]

---

[1] سین کی کتاب صفحہ ۳۶۲،

[2] باغی ہندوستان صفحہ ۲۴۰،

پہلے باب کا ضمیمہ

بیگم حضرت محل کا منشور

(من جانب برجیس قدر)

بہ جواب منشور وکٹوریا

آج کل بعض ضعیف العقل اور سقیم العقل آدمی کہہ رہے ہیں کہ انگریزوں نے باشندگان ہند کے تمام قصور اور تمام جرم معاف کر دیے ہیں۔ یہ قول بڑا ہی حیرت افزا ہے۔ انگریزوں کا مسلمہ شیوہ یہی ہے کہ وہ کوئی قصور معاف نہیں کرتے، خواہ بڑا ہو یا چھوٹا یہاں تک کہ اگر کوئی جرم ناواقفی اور غفلت سے بھی سرزد ہو جائے تو اسے فراموش نہیں کرتے،

۱۰ نومبر ۱۸۵۸ء کا شائع کردہ جو منشور ہمارے سامنے آیا ہے، وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ بعض ضعیف العقل لوگ اس کے حقیقی مقصد کو سمجھے بغیر اس کی ستائش کر رہے ہیں، لہٰذا ہم جو حکومت پائندہ کے مالک اور باشندگانِ اودھ کے سرپرست ہیں۔ یہ منشور شائع کرتے ہیں تاکہ زیرِ غور منشور کے اہم نکات کا حقیقی مقصد آشکار ہو جائے اور ہماری رعایا خبردار رہے۔

۱۔ منشور میں مرقوم ہے کہ ہندوستان پہلے کمپنی کی تحویل میں تھا۔ اب اس کا انتظام ملکہ نے سنبھال لیا ہے۔ اور آئندہ ملکہ کے قوانین کو ماننا چاہیے۔ ہماری مذہب دوست

رعایا کو اس پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ کمپنی کے قوانین، اس کا بندوبست اس کے انگریز ملازم، اس کا گورنر جنرل اور اس کا عدالتی نظام، غرض ہر شے اپنے حال پر قائم ہے بھلا کون سی چیز نئی ہے، جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنے کا امکان ہو سکتا ہے یا جس پر وہ اعتماد کر سکتے ہیں؟

۲۔ منشور میں مرقوم ہے کہ کمپنی نے جو معاہدے اور میثاق کیے تھے، ملکہ ان سب کو منظور کرتی ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ اس فریب کی تہہ تک پہنچیں۔ کمپنی نے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ اگر مذکورہ بالا وعدے کو قبول کر لیا جائے تو اس میں کون سی نئی بات ہوئی؟ کمپنی نے بھرت پور کے رئیس سے فرزند کا سا سلوک کرنے کا عہد کیا، پھر اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔ رئیس لاہور[1] کو کمپنی لندن لے گئی۔ پھر واپسی اس کے نصیب میں نہ ہوئی۔ نواب شمس الدین خاں[2] کو ایک طرف پھانسی پر لٹکایا گیا۔ دوسری طرف وہ اس کے سامنے ٹوپیاں اتار اتار کر سلام کر رہے تھے۔ پیشوا کو کمپنی نے پونا ستارہ سے نکالا اور اسے بٹھور میں زندگی بھر کے لیے قید کر کے بٹھا دیا۔ میر سلطان کے ساتھ ان کی عہد شکنی سب پر آشکارا ہے۔ بنارس کے راجا[3] کو انھوں نے آگرہ میں قید کر دیا۔ رئیس گوالیار کے ملک کا انتظام بہتر بنانے کے پردے میں انھوں انگریزی طور طریقے جاری کر دیے۔ بہار، اڑیسہ اور بنگال کے رؤسا کا نام و نشان تک باقی نہیں چھوڑا۔ رئیس فرخ آباد کو ماہانہ وظیفہ دے کر اس کا ملک قبضے میں لے لیا۔ شاہ جہان پور بریلی، اعظم گڑھ، جون پور، گورکھ پور، اٹاوہ، الہ آباد، فتح پور وغیرہ ہمارے مقبوضات جو ادائے تنخواہ کے بہانے ہم سے لے لیے گئے اور اودھ کے ساتھ معاہدے کی

---

[1] اشارہ ہے دلیپ سنگھ کی طرف، جو پہلے فتح گڑھ (یوپی) میں رہا، پھر لندن میں چلا گیا۔

[2] والی فیروز پور جھرکا جس پر فریزر کے قتل کا الزام لگا اور پھانسی کی سزا ہوئی۔

[3] اشارہ ہے چیت سنگھ کی طرف جس کی زندگی کے آخری دن آگرہ میں گزرے۔

ساتویں دفعہ میں انھوں نے کہا کہ اودھ کی علاقہ نہ لیا جائے گا۔ اگر کمپنی کے اس قدم انتظامات
کو قبول کر لیا گیا ہے تو سابقہ صورت حال اور موجودہ صورت حال میں کیا فرق ہوا؟

یہ پرانے واقعات ہیں، لیکن ماضی قریب میں انھوں نے تمام قسموں اور عہد ناموں کے برعکس بلا وجہ بدنظمی اور عوام کی بے چینی کا بہانہ پیش کرکے ہمارا ملک لے لیا اور ہماری کروڑوں کی جائیداد پر قبضہ جما لیا حالانکہ وہ ہمارے کروڑوں روپے کے قرضدار تھے۔ اگر ہمارے عوام ہمارے سابق بادشاہ واجد علی شاہ پر مطمئن نہ تھے ہماری حکومت پر کیوں مطمئن ہو گئے ہیں؟ کسی حکمران کو ایسی وفاداری اور اس پیمانے پر جان و مال کی قربانی پر آمادگی کا تجربہ نہیں ہوا جیسا ہمیں ہوا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں دیا جاتا؟

منشور میں مزید بتایا گیا ہے کہ اب مزید توسیع مقبوضات مطلوب نہیں، یا اپنی مگر وہ الحاق سے باز نہیں رہے۔ اگر ملکہ نے نظام حکومت سنبھال لیا ہے تو وہ ہمارا ملک ہمیں واپس کیوں نہیں دیتی حالانکہ ہمارے عوام کی خواہش یہی ہے؟ سب پر واضح ہے کہ کسی بادشاہ یا ملکہ نے پوری فوج اور پوری رعایا کو بغاوت کی سزا کبھی نہیں دی۔ سب کو معاف کر دیا جاتا تھا۔ عقلمند لوگ کبھی اس امر کو برقرار نہیں دے سکتے کہ پوری فوج اور رعایا کو سزا دی جائے۔ جب تک سزا کا لفظ باقی ہے، بدامنی ختم نہ ہوگی مشہور مثل ہے مرتا کیا نہ کرتا۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک ہزار کروڑوں پر حملہ کریں اور خود بچ نکلیں۔

۴۔ منشور میں بتایا گیا ہے کہ مسیحی مذہب سچا ہے۔ مگر کسی دوسرے مذہب کو دبایا نہ جائے گا اور سب کے تعلق میں قانون کی پابندی کی جائے گی۔ عدل کو کسی مذہب کے سچا یا جھوٹا ہونے سے کیا تعلق ہے؟ جو مذہب خدا کو ایک مانتا ہے اور اس کے سوا کسی کا قائل نہیں، وہ یقیناً سچا ہے۔ جس مذہب میں تین خدا ہوں، اسے مسلمان یا ہندو ہی نہیں یہودی، آفتاب پرست یا آتش پرست بھی سچا نہیں مان سکتے۔ سور کا گوشت

کھانا، شراب پینا، چربی والے کارتوس دانتوں سے کٹوانا، سؤر کی چربی آٹے اور مٹھائی میں ملانا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو سڑکیں بنانے کے بہانے ڈھانا، گرجے تعمیر کرنا، پادریوں کا گلیوں اور بازاروں میں مسیحی مذہب کی تبلیغ کے وعظ کہنا، انگریزی سکول جاری کرنا۔ انگریزی کے سیکھنے کے لیے ماہوار وظیفے دینا، حالانکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہیں اب تک بے توجہی کی نذر ہو رہی ہیں ان سب باتوں کے باوجود لوگ کیوں کر یقین کر سکتے ہیں کہ مذہب میں مداخلت نہ کی جائے گی؟ بغاوت مذہب کی بنا پر شروع ہوئی اور اس میں لاکھوں مارے گئے۔ ہماری رعایا کو دھوکے میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔ علاقہ شمال و غرب میں ہزاروں مذہب سے محروم ہو چکے ہیں، اور ہزاروں ترک مذہب کے بجائے پھانسی پا چکے ہیں۔

۴ - منشور میں مرقوم ہے کہ جن لوگوں نے باغیوں کو پناہ دی یا جو باغیوں کے لیڈر تھے یا جنھوں نے بغاوت پھیلائی، ان کی جانیں محفوظ رہیں گی اور سزا غور و فکر کے بعد دی جائے گی، البتہ قاتلوں اور قتل کے معاونوں پر ہرگز رحم نہ ہوگا۔ باقی سب معاف کر دیے جائیں گے۔ احمق بھی جان سکتا ہے کہ اس منشور کے مطابق کوئی سلامت نہ رہے گا۔ خواہ وہ گنہگار ہو یا بے گناہ۔ سب کچھ لکھا دیا گیا پھر بھی کچھ نہیں لکھا گیا -- کم از کم یہ تو واضح کر دیا گیا کہ جو ملوث ہوا، وہ بچ نہ سکے گا، اور کسی گاؤں یا جاگیر میں فوج ٹھہری ہو گی وہاں کا کوئی آدمی محفوظ نہ سمجھا جائے گا۔

اس منشور کے پڑھنے کے بعد ہمیں اپنے لوگوں کے بارے میں سخت تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ یہ منشور دشمنی سے لبریز ہے۔ ہم اب واضح حکم شائع کرتے ہیں، اس پر سب کو اعتماد کرنا چاہیے۔ جو لوگ غلطی سے اپنے آپ کو انگریزوں کے رو برو گاؤں کے مقدم قرار دے چکے ہیں، وہ یکم جنوری ۱۸۵۹ء تک ہماری لشکر گاہ میں حاضر ہو جائیں، بے شبہ ان کے جرم معاف کر دیے جائیں گے اور ان کی حیثیت کے مطابق سلوک ہوگا۔

اس منشور پر یقین رکھنا چاہیے اور معلوم ہے کہ تمام ہندوستانی حکمران مہربان اور رحم دل ہیں۔ ہزاروں نے اس حقیقت کا مشاہدہ کیا، لاکھوں نے اسے سنا۔ اس کے برعکس کسی نے خواب میں بھی نہ سنا ہوگا کہ انگریزوں نے کسی کا جرم معاف کیا۔

۵۔ اصل منشور میں مرقوم ہے کہ جب امن قائم ہو جائے گا تو رفاہ عامہ کے کام شروع ہوں، مثلاً سڑکیں بنیں گی، نہریں کھودی جائیں گی تاکہ عوام کی حالت سدھرے۔ سوچنے کے لائق یہ بات ہے کہ ہندوستانیوں کے لیے یہ وعدہ کیا جا سکتا ہے، ابھی سے کہ وہ سڑکیں بنائیں گے اور نہریں کھودیں گے۔ جو لوگ اس حقیقت کو صاف صاف دیکھ نہیں سکتے، ان کا کیا علاج ہے؟ غرض دو کٹوریہ کے منشور سے کسی کو دھوکا نہ کھانا چاہیے۔

رانی لکشمی بائی

ریاست جھانسی باجی راؤ پیشوا نے وسط ہند میں پیش قدمی کی تو اُسے ایک علاقہ بطور نذر ملا جس کا مرکز جھانسی تھا۔ پیشوا اس کے انتظام کے لیے اپنی طرف سے جن لوگوں کو مقرر کرتے تھے، انھیں صوبیدار کہا جاتا تھا۔ اٹھارھویں صدی کے آخری حصے میں وہاں رگھوناتھ راؤ ہری نوالکر نام ایک شخص صوبیدار مقرر ہو کر آیا، جس کے حسنِ انتظام سے پیشوا بہت خوش ہوا اور اس کی صوبیداری موروثی بن گئی۔

رگھوناتھ راؤ نے ۱۷۹۴ء میں وفات پائی تو اس کا بھائی شیو راؤ صوبیدار بنا اور کم و بیش بیس برس اس منصب پر فائز رہا۔ اس شخص نے پیشوا کی تابعیت تو رسمًا تو ختم نہ کیا لیکن عملًا وہ خود مختار ہو گیا اور اس نے ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدہ کر لیا، مطلب یہ کہ اپنے آپ کو کمپنی کی حفاظت میں دے دیا۔

شیو راؤ کے تین بیٹے تھے۔ اس کا بڑا بیٹا کرشن راؤ فوت ہو گیا تو صوبیداری دوسرے بیٹوں میں سے کسی کو دینے کے بجائے کرشن راؤ کے بیٹے رام چند کو دے دی گئی، جو ۱۸۱۶ء سے ۱۸۳۵ء تک مسند نشین رہا۔ اسی کے عہد میں پیشواؤں کی سلطنت ختم ہوئی اور جو حقوق برتری جھانسی میں پیشوا کو حاصل تھے، وہ انگریزوں کی جانب منتقل ہو گئے۔ اسی کو انگریز گورنر جنرل ولیم بنٹنک نے صوبیدار کے بجائے "مہاراجا ادھیراج" خطاب دیا۔

خاندان کی خصوصیت اس خاندان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اکثر افراد بے اولاد رہے یا اگر کسی کے اولاد ہوئی اور زندہ نہ رہی۔ مثلاً رگھوناتھ راؤ بے اولاد تھا۔ اس کے بعد رام چندر راؤ بھی بے اولاد تھا۔ اس نے ہندوؤں کی رسم کے مطابق خاندان کی دوسری شاخ کے ایک فرد سداشیو راؤ کو متبنیٰ بنا لیا تھا، لیکن انگریزوں نے متبنیٰ کی مسند نشینی قبول نہ کی اور رام چندر راؤ کے چچا رگھوناتھ راؤ کو راج کی گدی پر بٹھا دیا۔ وہ صرف تین برس زندہ رہا۔ جذامی تھا نہ اس کے کوئی اولاد ہوئی اور نہ وہ انتظامی کاموں پر متوجہ تھا۔ اسی وجہ سے ریاست کا انتظام بہت بگڑ گیا۔ ۱۸۳۸ء میں اس نے وفات پائی تو اس کا چھوٹا بھائی گنگا دھر راؤ راجا بنا۔ لکشمی بائی اسی کی رانی تھی، جس کے حالات ہم لکھنا چاہتے ہیں۔

امرت راؤ پیشواؤں کی سلطنت میں رگھوناتھ راؤ عرف رگھوبا کی وجہ سے بہت خلل پیدا ہوا۔ اس کا بیٹا باجی راؤ ثانی مرہٹہ سلطنت کا آخری پیشوا تھا جس نے ۱۸۱۸ء میں انگریزوں سے شکست کھائی اور آٹھ لاکھ روپے سالانہ کی پنشن لے کر بٹھور میں جا بیٹھا جو کان پور کے مغرب میں تھوڑے فاصلے پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ اس کے باپ رگھوبا نے امرت راؤ نامی ایک شخص کو متبنیٰ بنا لیا تھا جو چمنا آپا کے عرف سے مشہور ہے۔ امرت راؤ نے باجی راؤ ثانی سے تعلقات خوشگوار رکھنے کی کوشش کی۔ جب دیکھا کہ باجی راؤ کوئی معقول طریقہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں تو وہ انگریزوں سے مل گیا اور آٹھ لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کرا کے بنارس میں جا بیٹھا۔ اس کے ساتھ بھی مرہٹوں کے متعدد خاندان مختلف حیثیتوں میں بنارس چلے گئے۔

لکشمی بائی کے والدین انہیں خاندانوں میں سے ایک مورو پنت بلونت راؤ تانبے بھی تھا۔ یہ وائی نام ایک مقام کا رہنے والا تھا جو پونا اور ستارہ کے درمیان واقع ہے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ امرت راؤ کے ہاں وہ کس خدمت

پر مامور تھا اور اُسے کیا مشاہرہ ملتا تھا۔ لیکن قرائن سے ظاہر ہے کہ اچھی حیثیت حاصل ہونے ہی کی بنا پر اس نے وطن کو ترک کیا ہوگا۔ اس کی بیوی کا نام بھاگیرتی تھا۔ اُن کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام منوبائی رکھا گیا۔[1] یہ رانی لکشمی بائی کا پہلا نام تھا ۱۸۳۲ء میں امرت راؤ نے وفات پائی تو اس کا نظام امارت بھی درہم برہم ہوگیا۔ ممکن ہے بعض ملازمین خاص کے لیے وظیفے مقرر کر دیے گئے ہوں، لیکن قیاس یہ ہے کہ مورو پنت کو یا تو وظیفہ ملا نہ ہوگا یا وہ چنداں جاذب نہ ہوگا، اس لیے تھوڑی دیر بعد اس نے بنارس کو چھوڑ کر بٹھور میں باجی راؤ کے گھرانے کا قصد کر لیا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ۱۸۳۲ء کے بعد بٹھور منتقل ہونے میں کتنی دیر لگی۔ ایک بیان ہے کہ مورو پنت کے نقل مکان کے وقت منوبائی کی عمر قریباً چار سال تھی۔[2]

تاریخ پیدائش

منوبائی کی تاریخ پیدائش کا مسئلہ بہت الجھا ہوا ہے۔ ساورکر نے تاریخ ۱۸۳۵ء بتائی ہے،[3] لیکن اسے صحیح ماننے میں دقتیں ہیں۔ مثلاً اول منوبائی کی شادی ۱۸۴۲ء میں بتائی گئی ہے۔[4] لہٰذا اگر وہ ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئی تو شادی کے وقت اس کی عمر صرف سات برس کی تھی۔ ہندوؤں میں اگرچہ کم سنی کی شادی کا رواج تھا تاہم جس گنگا دھر راؤ سے منوبائی کی شادی ہوئی، اس کی پہلی بیوی فوت ہو چکی تھی اور وہ اولاد کا خواہش مند تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ سات برس کی بچی کو اس غرض سے منتخب نہ کر سکتا تھا۔ دوسرے ساورکر نے بٹھور میں منوبائی اور نانا راؤ ڈھونڈو پنت کے باہم کھیلنے یا سواری کرنے یا آلات و اسلحہ کی مشق بہم پہنچانے کا ذکر کیا ہے۔ نانا راؤ کی ولادت

---

[1] ڈاکٹر سین نے نام منی کرنیکا بتایا ہے۔

[2] چارلس کن کیڈ کی کتاب لکشمی بائی (انگریزی) ص ۲

[3] ساورکر کی کتاب طبع اول ص ۲۴ ، [4] ایضاً ص ۲۶ ۔

قطعی طور پر ۱۸۲۳ء ہی ہے۔ نانا اور منو کی عمروں میں دس سال کا تفاوت مذکورہ بالا مشاغل کے لیے سازگار معلوم نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ماننا پڑے گا کہ امرت راؤ کی وفات کے بعد موروپنت تانبے نے کم و بیش سولہ سال بنارس میں گزارے، پھر وہ بٹھور پہنچے۔ چوتھے کن کیڈ نے صراحت کی ہے کہ منو بائی کی شادی کا مسئلہ بلوغت کو پہنچنے کے بعد زیر غور آیا۔[۲] پانچواں قابل توجہ امر یہ ہے کہ جھانسی کو الحاق سے بچانے کے سلسلے میں رانی نے جان لینگ کو قانونی مشیر بنایا تھا۔ یہ ۱۸۵۴ء کا واقعہ ہے۔ اگر رانی کی تاریخ پیدائش ۱۸۳۵ء مانی جائے تو ۱۸۵۴ء میں اس کی عمر اٹھارہ سال کی ہونی چاہیے مگر لینگ اس کا ذکر ایسے انداز میں کرتا ہے گویا اس وقت جوانی کی ابتدائی بہار گزر چکی تھی۔ بہ الفاظ دیگر ۱۸۵۴ء میں رانی کو کم از کم تیس برس کی ہونا چاہیے۔[۳]

بنابریں میرا خیال ہے کہ منو بائی کی صحیح تاریخ پیدائش ۱۸۲۳ء یا ۱۸۲۵ء ہوگی۔ وہ بنارس میں پیدا ہوئی اور تین چار برس کی تھی جب موروپنت تانبے بنارس کی سکونت ترک کر کے بٹھور پہنچے۔

بٹھور کی زندگی

کن کیڈ نے لکھا ہے کہ بٹھور میں منو بائی نانا صاحب اور اس کے بھتیجے راؤ صاحب کے ساتھ کھیلتی تھی اور سواری بھی کرتی تھی۔ کھلی آب و ہوا نے اُس کی صحت پر بہت اچھا اثر ڈالا۔ وہ خلقتاً بھی بڑی خوب صورت اور حسین تھی۔ صحت و

۱؎ اُسے باجی راؤ ثانی نے ۷ جون ۱۸۲۷ء کو گود لیا تھا۔ اس وقت نانا راؤ ڈھائی سال کا تھا۔

۲؎ کن کیڈ کی کتاب ص ۲۔ ۳؎ لینگ کہتا ہے کہ رانی کا قد متوسط اور جسم ذرا بھاری تھا۔ اس کا چہرہ اوائل جوانی میں بہت خوب صورت ہوگا۔ اب بھی اس میں جاذبیت کے کئی پہلو تھے، اگرچہ میرے تصور حسن کے مطابق اس میں گولائی زیادہ تھی۔ آنکھیں بہت خوب صورت، نازک ناک اور خوش وضع رنگ زیادہ کھلا ہوا نہ تھا۔ صرف کانوں میں بُندے تھے اور کوئی زیور جسم پر نہ تھا۔ لباس سادہ ململ کا البتہ بناوٹ بہت عمدہ تھی۔ لباس میں سے جسمانی وضع صاف نمایاں تھی اور بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ جسم نہایت خوب صورت تھا۔ البتہ آواز اچھی نہ تھی۔ دسین کی کتاب ص ۷۰۔

تندرستی نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے۔

ساورکر کا بیان ہے کہ نانا صاحب اور منو بائی اکٹھے شمشیر بازی سیکھتے۔ نانا صاحب اور راؤ صاحب اتالیق سے تعلیم پاتے تو منو بائی پاس جا بیٹھتی۔ نانا صاحب ہاتھی پر سوار ہوتے تو منو بائی کہتی، کیا مجھے آپ ساتھ نہ بٹھائیں گے؟ کبھی نانا صاحب گھوڑے کی سواری کرتے تو منو بائی کا انتظار کر لیتے کہ وہ بھی سوار ہو کر آ جائے تاکہ اکٹھے سواری کی مشق کریں۔[1]

شادی

کن کیڈ نے بتایا ہے کہ گنگادھر راؤ والیِ جھانسی کو دوبارہ شادی کی ضرورت پیش آئی۔ عام حالات میں وہ اپنے وطن مالوف یعنی مہاراشٹر سے کسی موزوں بیوی کا انتخاب کرتا۔ لیکن باجی راؤ ثانی نے بہ اصرار کہا کہ منو بائی سے شادی کر لو۔ چنانچہ لمبی گفت و شنید کے بعد پیشوا کی تجویز مان لی گئی اور منو بائی کی شادی گنگادھر راؤ سے ہو گئی۔ رسم کے مطابق شادی کے بعد منو بائی کا نام لکشمی بائی تجویز ہوا[2] اسی نام سے وہ تاریخ کے ایوان میں جلوہ افروز ہوئی۔ اسی نام سے اس نے شہرت عام پائی۔ منو بائی کا نام کسی کو یاد بھی نہ رہا۔

گنگادھر راؤ ۱۸۳۸ء میں مسند نشین ہوا تھا۔ کچھ مدت اس کی ریاست انگریزوں کے زیر انتظام رہی اور ۱۸۴۲ء میں واگزار ہوئی۔ تھوڑا سا علاقہ انگریزوں نے حفاظتی فوج کے لیے الگ کر لیا۔

بیوگی

لکشمی بائی نے چند سال بڑے اطمینان سے گزارے۔ ۱۸۵۱ء میں خدا نے اسے بیٹا دیا۔ گنگادھر راؤ کی خوشیوں کا اندازہ کون کر سکتا ہے، جسے بڑی آرزوؤں اور التجاؤں کے بعد وارث ملا تھا! لیکن یہ خوشی تین ماہ سے زیادہ عمر نہ پا سکی۔ بیٹا فوت ہو گیا اور گنگادھر راؤ کو اتنا سخت صدمہ پہنچا کہ وہ غم سے گھل گھل کر ۱۸۵۳ء میں اپنے پیشرووں سے جا ملا۔

---

[1] ساورکر کی کتاب صفحہ ۲۴-۲۵۔ اہلِ علم کے نزدیک ساورکر کے بعض بیانات قابلِ اعتماد نہیں۔

[2] یہ کن کیڈ کا بیان ہے۔ رانی کی ایک مہر کا چربہ ڈاکٹر سین کی کتاب میں شائع ہوا ہے جس پر سنہ ۱۸۵۰ء منقوش ہے یعنی ۱۸۵۲ء۔ اس میں رانی کا نام لکشمی بائی کے بجائے لچھمی بائی کندہ ہوا ہے جو لکشمی بائی ہی کی دوسری شکل ہے۔

اس نے خاندان کی دوسری شاخ سے ایک لڑکے کو، جس کا نام آنند راؤ واسو دیو تھا، متبنیٰ بنا لیا تھا اور اُس کا نام بدل کر دامودر گنگا دھر راؤ رکھا تھا۔ دامودر کی عمر پانچ سال تھی۔ گنگا دھر راؤ نے وفات سے ایک دن پہلے وائسرائے کو خط لکھ دیا تھا کہ میں بچے کو متبنیٰ بنا چکا ہوں۔ اس کی منظوری دی جائے اور جب تک وہ بالغ نہ ہو، رانی لکشمی بائی سرپرست و مختار کی حیثیت میں ریاست کا انتظام سنبھالے۔ یہ سب کچھ بندھیل کھنڈ کے پولیٹکل ایجنٹ میجر ایلس کی موجودگی میں ہوا۔

جھانسی کا الحاق

لارڈ ڈلہوزی اس زمانے میں وائسرائے تھا۔ اس کی پالیسی ہی یہ تھی کہ ریاستوں کو جس حد تک ممکن ہو جلد سے جلد ختم کیا جائے۔

اس نے دامودر گنگا دھر راؤ کو وارث ریاست تسلیم نہ کیا۔ اس سلسلے میں ایک پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ رام چندر راؤ کا متبنیٰ سدا شیو راؤ مقابلے پر دعوے دار ریاست بن گیا، جس کے حق مسند نشینی کو ۱۸۳۵ء میں رد کر کے ریاست شیو راؤ کے خاندان کی طرف لوٹا دی گئی تھی۔ بہر حال فروری ۱۸۵۴ء میں ڈلہوزی نے دامودر گنگا دھر راؤ کی جانشینی کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا۔ ریاست بحق سرکار ضبط کر لی گئی اور رانی لکشمی بائی کے لیے پانچ ہزار روپے ماہوار پنشن مقرر ہو گئی۔ البتہ شوہر کی خاص جائداد رانی ہی کے قبضے میں رہی، جس میں قیمتی جواہرات بھی تھے۔ ابتدا میں رانی نے پنشن لینے سے انکار کر دیا، بعد ازاں وصول کرنے لگی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے خرچ پر چند آدمی استرداد ریاست کے لیے ولایت بھیجے تھے، مگر اس سعی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ البتہ اس باب میں کوئی مستند شہادت تاریخ کے صفحات پر موجود نہیں۔

شرمناک طرزِ عمل

جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں ڈلہوزی کا فیصلہ اصولاً نادرست نہ تھا۔ جب رام چندر راؤ کے متبنیٰ کو مسند ریاست پر بٹھانے سے انکار کر دیا تھا تو رگھوناتھ راؤ یا گنگا دھر راؤ نے اس سے اختلاف نہ کیا تھا، اس لیے کہ معاہدے

کے روسے ریاست شیو راؤ کے خاندان اور اس کے وارثوں کے لیے مقرر تھی۔ پھر گنگادھر راؤ کے متبنیٰ کو کیوں کر وارث ریاست مانا جاتا؟ اگر متبنیٰ ہی کو ریاست ملنی تھی تو اس کا پہلا حقدار یقیناً رام چندر راؤ کا متبنیٰ تھا جو اٹھارہ سال سے انتظار میں بیٹھا تھا۔ تاہم خاص حالات کے پیشِ نظر دامودر کو جائز وارث تسلیم کر لینا بہت مناسب تھا۔

پھر الحاقِ ریاست کے فیصلے کے ساتھ انگریزوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا وہ حد درجہ شرمناک اور اشتعال انگیز تھا۔ میلی سن کے قول کے مطابق انھوں نے رانی کے لیے ساٹھ ہزار سالانہ پنشن مقرر کی، ساتھ ہی گنگادھر راؤ کے قرضے رانی کے ذمے لگا دیے۔ رانی نے ہر چند کہا کہ متوفی مہاراج کے قرضے ریاست کے ساتھ جانے چاہئیں۔ جب ریاست لے لی ہے تو قرضے کیوں مجھ پر ڈالتے ہو، لیکن آگرہ کے حاکم نے اصرار کیا کہ قرضے رانی ادا کرے، بلکہ اس کی پنشن سے قرضوں کے لیے رقم وضع ہوتی رہے۔[1]

ظاہر ہے کہ یہ سلوک انگریزوں کے متعلق رانی کے دل پر کوئی خوشگوار اثر پیدا نہ کر سکتا تھا اور کوئی حق شناس انسان اس سلوک کو زیادہ سے زیادہ ناروا قرار دینے میں تامل نہ کرے گا۔ ہومز بھی یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا کہ نکتہ چینیوں کے لیے الحاقِ جھانسی سے زیادہ خبط آور ڈلہوزی کا کوئی فعل نہ تھا۔[2]

یہ حالات تھے، جن میں رانی نے تین سال صبر و سکون سے بسر کیے یہاں تک کہ میرٹھ میں جنگِ آزادی کی پہلی چنگاری چھوٹی اور تھوڑے سے ہی دنوں میں جا بجا الاؤ دہکنے لگے۔

انگریزوں پر حملہ

جھانسی میں انگریزوں کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی، اس کی تفصیلات پیشِ نظر موضوع سے خارج ہیں اور وہ سب جنگِ آزادی کی تاریخ میں بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں صرف اتنا جان لینا چاہیے کہ اوائل جون ہی میں

---

[1] میلی سن کی کتاب جلد دوم صفحہ ۱۰۱ حاکم آگرہ کا نام کالون COLVIN [2] ہومز کی کتاب صفحہ ۲

جھانسی کے انگریز افسروں کے بنگلوں کو آگ لگادی گئی تھی۔ ۵۔ جون سے ہنگامے کا آغاز ہوگیا۔ بعض انگریز مارے گئے۔ باقی جن کی تعداد مل ملا کر پچپن کے قریب بتائی جاتی ہے، شہر چھوڑ کر قلعے میں چلے گئے اور انھوں نے خوب استحکامات کر لیے۔ تین انگریز افسر اس غرض سے باہر نکلے کہ رانی لکشمی بائی سے امداد لیں۔ لیکن دو راستے ہی میں مارے گئے۔ دو یوریشیوں نے بھیس بدل کر ناگور اور گوالیار تک خبر پہنچانے کی کوشش کی۔ ان کی اصلیت کا پتا چل گیا اور وہ بھی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ کپتان گارڈن، جو جھانسی کا ڈپٹی کمشنر تھا، اتفاقیہ گولی لگنے سے قلعے ہی میں ختم ہوگیا۔

حوالگی اور قتل

غرض قلعے کا محاصرہ کر لیا گیا۔ جو لوگ اس ہنگامے میں پیش پیش تھے۔ ان کے نام ساورکر نے بتائے ہیں۔ مثلاً کالے خاں رسالدار، محمد حسین تحصیلدار، حکیم صالح محمد، انقلابیوں کی خواہش یہ تھی کہ جھانسی کا قصہ ختم کر کے جلد از جلد دہلی پہنچیں، لیکن قلعہ فتح کیے بغیر وہاں سے جانا ممکن نہ تھا انگریزی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ محاصرے کے دوران میں انقلابیوں کو بھی خاصا نقصان پہنچا۔ بعد کے بیانات مختلف ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ محصورین نے صلح کا سفید جھنڈا لہرایا اور قلعے کا دروازہ کھول دیا اس لیے کہ نہ وہ زیادہ دیر تک مقابلہ کر سکتے تھے اور نہ ان کے پاس اسلحہ یا سامان باقی رہا تھا۔ دوسرے گروہ کا بیان ہے کہ محاصرین نے محصورین کو محفوظ مقام پر پہنچانے کا وعدہ کر لیا تو انھوں نے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔

حقیقت حال کچھ ہو لیکن پچاس آدمی زیادہ دیر تک مقابلہ جاری نہ رکھ سکتے تھے۔ دروازہ کھلا تو سب محصورین کو قلعے سے نکال کر باغ میں لے گئے اور وہاں موت کے گھاٹ اتار دیا بخشیش علی رسالدار کا حکم یہ تھا: جن انگریزوں کے متعلق ثابت ہو کہ انھوں نے جھانسی کے الحاق میں حصہ لیا، صرف وہ موت کی سزا کے مستحق ہیں[1]۔ لیکن جوش میں

---

[1] ساورکر کی کتاب صفحہ ۱۹۵۔ مسٹر مٹلو MUTLOW کا بیان ہے کہ خود رانی نے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶ پر)

آتے ہی ہجوم نے مجرم و غیر مجرم میں کوئی امتیاز نہ کیا، یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا۔ یہ واقعہ بھی ان دردناک واقعات میں سے ہے جن کے متعلق کوئی معذرت پیش نہیں کی جا سکتی۔

رانی کی ذمہ داری

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ قتل کے لیے رانی کس حد تک ذمہ دار تھی؟ اس باب میں بھی بیانات مختلف ہیں کہ رانی نے اسی وقت سے مختلف لوگوں کے پاس قاصد دوڑانے شروع کر دیے تھے، جب میرٹھ میں ہنگامے کے آغاز کی خبر ملی تھی۔ ان میں سے بعض نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جو تین انگریز افسر قلعے سے نکل کر رانی کے پاس فریاد لے گئے تھے، انھیں بھی رانی کے حکم سے قتل کیا گیا لیکن اس الزام کے لیے کوئی ثبوت پیش نہیں کیا جا سکا۔

اس کے برعکس دوسرے گروہ نے پورے وثوق سے دعویٰ کیا ہے کہ رانی کو قتل کے کسی بھی واقعے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بے شک اسے انگریزوں سے سخت کاوش تھی اور جو آزار اس غریب کو پہنچ چکے تھے، وہ یقیناً حد درجہ دل دوز اور صبر آزما تھے۔ ضابطے سے ضابطہ انسان بھی انگریزوں کے ذلت خیز سلوک کے بعد ان کے بارے میں خوشگوار خیالات کا حامل نہ رہ سکتا تھا۔ تاہم رائے کا اچھا نہ ہونا ایک بات ہے اور مظلوموں کے لیے بے پروایانہ قتل کا حکم دینا یا انھیں خود قتل کرا دینا بالکل دوسری بات ہے۔ رانی کی طبیعت اور عام اخلاق و عادات کو ایسے کاموں سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ وہ میدانِ جنگ میں لڑ سکتی تھی اور اس طرح لڑی کہ بڑے بڑے جواں مرد بھی اس کی مثال مشکل ہی سے پیش کر سکیں گے، لیکن بے دست و پا، نہتے اور بے بس آدمیوں کو قتل کرانا اس کا کام نہ ہو سکتا تھا۔

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ) تحریر کیا تھا محصورین کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے (جو مز صفحہ ۱۴ حاشیہ)

مزید برآں مستند روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ رانی اس وقت ملک انگریزوں کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اچانک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے اور حتی الامکان جھانسی کو انجام کی دست برد سے محفوظ رکھنا چاہیے یعنی امن قائم کر کے نظم و نسق درست کر دینا چاہیے۔ لیکن ہنگامے کے اوائل میں امن قائم کرنا سہل نہ تھا اور رانی کے پاس فوج نہ تھی جس سے کام لے کر وہ کوئی موثر قدم اٹھا سکتی۔

ایک انگریز کی گواہی

ایک مرہٹہ مورخ نے رانی کے سوانح حیات مرتب کیے تھے اور تمام مخالف و موافق شہادتوں کی چھان بین کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ رانی کو انگریزوں کے قتل سے کوئی بھی علاقہ نہ تھا۔ دوسری شہادتوں کے علاوہ اس نے مسٹر مارٹن[1] نام ایک انگریز کا ایک خط بھی نقل کیا تھا جو ۲۰ اگست ۱۸۸۹ء کو راجا گنگادھر راؤ اور رانی لکشمی بائی کے متبنیٰ (دامودر گنگادھر راؤ) کے نام لکھا گیا تھا۔ مارٹن خود ہنگامے کے وقت جھانسی میں موجود تھا، لیکن دار و گیر اور کشت و خون سے بچ گیا اور ۱۸۹۲ء تک زندہ تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> تمھاری غریب والدہ (رانی) سے نہایت غیر منصفانہ اور بے دردانہ سلوک ہوا۔ . . . اس کے صحیح حالات میں جانتا ہوں، کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ اس غریب نے جون ۱۸۵۷ء میں جھانسی کے فرنگی باشندوں کے قتل میں قطعاً کوئی حصہ نہ لیا، اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ جب فرنگی قلعے میں چھپے گئے تو رانی دو روز تک اُن کے لیے سامان خوراک بہم پہنچاتی رہی۔ اس نے کرارا سے ایک سو بندوقچی منگوائے اور ہماری حفاظت کے لیے بھیج دیے، لیکن انھیں ایک دن قلعے میں

---

[1] MARTIN ۔ [2] کن کیڈ کے بیان کے مطابق یہ خط ۱۰ اپریل ۱۸۸۹ء کو لکھا گیا تھا۔

رکھ کر شام کے وقت واپس بھیج دیا گیا۔ پھر رانی نے میجر سکین[1] اور کپتان گارڈن[1] کو مشورہ دیا کہ فوراً دتیا چلے جائیں اور اپنے آپ کو وہاں کے راجا کی حفاظت میں دے دیں۔ لیکن یہ بھی نہ کیا گیا۔ انجام کار انھیں بھاری فوج، پولیس اور جیل کے ملازموں نے موت کے گھاٹ اتار دیا۔[2]

یہ خط واقعہ قتل سے رانی کی برأت کا روشن ثبوت ہے۔

تین لاکھ کا مطالبہ کن کیڈ کا بیان ہے کہ قلعے کے تخلیے اور انگریزوں کے قتل سے فراغت کے بعد تمام انقلابی رانی کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہم دہلی جانا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں خرچ کے لیے تین لاکھ روپے دیں۔ رانی نے جواب دیا کہ میں تین برس ہوئے ریاست سے الگ ہو چکی ہوں، میرے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے؟ یہ جواب درست تھا۔ رانی کے پاس حقیقتہً تنقد روپیہ نہ ہو سکتا تھا خصوصاً اس لیے کہ جو پنشن اسے ملتی تھی، اس میں سے متوفی راجا کے قرض کے روپے بالاقساط کٹتے جاتے تھے۔ نیز اس واقعے سے ثابت ہے کہ نہ رانی نے انقلابیوں کے کسی فعل میں حصہ لیا تھا اور نہ وہ انھیں اکسانے اور برانگیختہ کرنے کی ذمہ دار تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو انقلابی اس

---

[1] SKENE جھانسی میں پولیس سپرنٹنڈنٹ تھا۔ GORDON جھانسی میں ڈپٹی کمشنر تھا۔

[2] کن کیڈ کی کتاب صفحہ ۳۹۳۔ خط سے ظاہر ہے کہ مارٹن خود محاصرے کے وقت قلعے میں موجود تھا۔ وہ کس طرح بچ نکلا؟ اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ رانی کے بھیجے ہوئے بندوقچیوں کو اس لیے باہر بھیج دیا ہوگا کہ انگریز ان پر اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ تاہم رانی اس کے سوا ان کی کیا مدد کر سکتی تھی؟ مارٹن کے اس خط کا سراغ نہیں مل سکا، مگر رانی کا مرہٹی سوانح نگار لکھتا ہے کہ میں نے خود یہ خط دیکھا تھا جو غالباً دامودر کے بیٹے کے پاس تھا اور وہ اہلی بازار اندور میں رہتا تھا۔ اس کا ذکر ایس، این سین نے بھی کیا ہے (۱۸۵۷ء انگریزی صفحہ ۲۷۹، ۲۸۰)

انداز میں روپے کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں۔

تاہم انقلابی ایسے کسی جواب پر مطمئن نہ ہو سکتے تھے۔ رانی کے متبنّیٰ دامودر کنگادھر راؤ کا رقیب یعنی رام چندر راؤ کا متبنّیٰ سدا شیو راؤ ریاست کا طلب گار بیٹھا ہے چنانچہ انھوں نے رانی سے کہہ دیا کہ اگر تین لاکھ نہ ملیں گے تو ہم محل کو آگ لگا دیں گے اور سدا شیو راؤ کو مسندِ حکومت پر بٹھا دیں گے۔

رانی کے لیے یہ دھمکی سخت تشویش کا باعث بن گئی۔ محل کو آگ لگ جاتی تو جو اندوختہ اس کے پاس باقی رہ گیا تھا، وہ جل جاتا۔ نیز انگریز اگرچہ جھانسی پر قابض ہو چکے تھے، تاہم رانی کو امید تھی کہ ریاست اُسے واپس مل جائے گی۔ اگر سدا شیو راؤ مسند نشین ہو جاتا تو رانی کی یہ امید بھی ختم ہو جاتی۔

اعلانِ حکومت

بہرحال اس دھمکی سے متاثر ہو کر اس نے ایک لاکھ کے جواہرات انقلابیوں کے حوالے کر دیے۔[۱] جواہرات مل گئے تو انھوں نے رانی کی حکومت کا اعلان کر دیا اور منادی ہو گئی: خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا اور حکم رانی لکشمی بائی کا۔[۲]

حقیقت میں وہ دامودر کی مختار و سرپرست تھی نہ کہ مستقل حکمران۔ یہ امر بطورِ خاص توجہ کا محتاج ہے کہ رانی نے اپنی حیثیت سے کبھی تجاوز نہ کیا اور دامودر کے حقوق کو کبھی خفیف سا گزند بھی نہ پہنچنے دیا۔ بلکہ وہ جب تک زندہ رہی، اس نے دامودر کو سینے سے لگائے رکھا۔ اگر کوئی بچہ رانی کے بطن سے بھی ہوتا تو اس سے زیادہ پیارا اور مامتا کا مرجع ہرگز نہ بن سکتا جس کے مظاہرے رانی لکشمی بائی نے دامودر کے تعلق میں کیے۔

رانی کی پوزیشن

اب یہاں اس امر پر تھوڑی سی گفتگو کر لینی چاہیے کہ رانی کی پوزیشن کیا تھی؟ اگر ہم نے مانا کہ واقعاتِ قتل کی ذمہ داری اس پر عائد نہ ہوتی تھی

---

[۱] کن کیڈ ص ۶ ، [۲] ساورکر ص ۱۱۶ ،

لیکن کیا اس امر کا کوئی واضح ثبوت موجود ہے کہ رانی نے فوجیوں کو سرکشی پر ابھارا یا خود انھیں بطیب خاطر کوئی امداد دی؟ کیا اس بات کی کوئی شہادت ملتی ہے کہ وہ ابتدا ہی سے انگریزوں کے خلاف لڑنے پر تلی بیٹھی تھی اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے اس کے لیے ایک عمدہ موقع بہم پہنچا دیا تھا؟ مستند تاریخی وثیقوں کے مطابق ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔

واقعات کی اجمالی کیفیت یہ ہے کہ ۵ جون کو جھانسی میں ہنگامہ برپا ہوا۔ رانی کا اس ہنگامے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے پاس جو سو پچاس آدمی تھے، وہ کسی ہنگامے کی روک تھام کا فرض انجام نہ دے سکتے تھے:

۱۔ انگریزوں نے جتنے گواہ مہیا کیے، ان میں سے کسی ایک کا بیان رانی کو کسی بھی درجے میں مجرم ثابت نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ان بیانات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بالکل بے قصور تھی۔

۲۔ امان اللہ خاں سپاہی کو وسط ہند کا پولیٹیکل ایجنٹ رابرٹ ہیملٹن قابل اعتماد قرار دیتا ہے۔ اس کی شہادت یہ ہے کہ سرکشی سے قبل کسی نے رانی سے مشورہ نہ کیا۔ پھر ڈرا دھمکا کر دو سرداروں کو ساتھ ملایا اور وہ لوگ رانی کے محل کی طرف گئے تو بھری ہوئی توپیں ساتھ لے گئے۔ گویا بہ زور رانی سے روپے اور آلات و اسلحہ کی مدد حاصل کی۔

۳۔ ۱۲ جون کو سرکشوں نے دہلی کا راستہ لیا۔ اس وقت سے رانی نے انگریزوں کے پاس مفصل اطلاعات بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے ساگر اور بندھیل کھنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹوں یا آس پاس کے دوسرے ذمہ دار انگریزوں کے پاس رپورٹیں بھیجیں۔ جب اس کے خلاف اوڑچھا کے راجا نے فوج کشی کی تو انگریزوں سے مدد مانگی۔ ایک پولیٹیکل ایجنٹ نے اسے لکھ بھی دیا تھا کہ مالیہ وصول کرو، فوج بھرتی کرو اور انتظامی کاروبار جس حد تک ممکن ہو سنبھالے رکھو۔

۴۔ جب رانی کو یقین ہو گیا کہ دشمنوں کی دراندازی سے انگریز اس کے ساتھ نہ تو انصاف کا برتاؤ کرنے کے لیے تیار نہیں اور پھانسی کا نام سنتے ہی ان پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی ہے حالانکہ رنجدہ واقعات کے لیے وہ ذمہ دار نہ تھی تو اس نے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا جو ہر لحاظ سے عزیمت اور غیرت و حمیت کے عین مطابق تھا۔ پھر وہ زندگی کے آخری سانس تک اسی پر چٹان کی طرح جمی رہی۔

حقیقت سے اعراض کیوں؟

حقیقت یہی ہے جو ہم نے صاف صاف عرض کر دی۔ اس کا کوئی پہلو رانی کی عظمت کے منافی نہیں۔ ہمیں نہ افراط کا شکار رہنا چاہیے اور نہ تفریط کا۔ نہ رانی کو ابتدا ہی سے انگریز دشمنی کا پیکر بنا کر پیش کرنے کے درپے ہونا چاہیے اور نہ ایک خاص وقت تک انگریزوں سے لڑنے میں تامل کی بنا پر یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ رانی کو جنگ آزادی میں علمداری کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ وہ ابتدا میں ہرگز نہ لڑنا چاہتی تھی مگر جب اس نے لڑنے کا ارادہ کر لیا تو ایک لمحے کے لیے بھی تذبذب کو راہ نہ دی اور خطرے کے ہر مقام میں سب سے آگے رہی۔ اس عزیمت پر کون فخر نہ کرے گا اور اس مردانگی کے لیے کس کے دل کی گہرائیوں سے تحسین و آفرین کی لہریں نہ اٹھیں گی؟

ضروری نہیں کہ ہر انسان پہلے ہی مرحلے میں تمام حقائق کا صحیح اندازہ کر سکے۔ جب اندازہ ہو جائے تو پھر جان و دل سے راہ عمل پر گامزن ہو جانا منافی عظمت نہیں بلکہ بہرحال مستحق تحسین ہے۔ یقیناً رانی بڑی عظیم المرتبت تھی ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی میں اس کی شان عزیمت کا مقابلہ احمد اللہ شاہ یا شہزادہ فیروز شاہ کے سوا کون کر سکتا ہے؟ مقصد اعلیٰ ہو اور اس کے لیے انسان جانبازی کا نہ محض عہد کرے بلکہ بے تامل جان دے دے تو کون ہے جس کے دل میں اس قربانی کے لیے انتہائی احترام کا جذبہ پیدا نہ ہو گا؟ رانی نے آزادی کے لیے میدان جنگ میں جان دی۔ کیا یہ برتری اور عظمت کی سب سے بڑی دستاویز نہیں؟

نظم ونسق حکومت کا اعلان ہوتے ہی رانی نے فوج کی فراہمی کا بندوبست شروع کر دیا۔ انگریزوں کا بیان ہے کہ جھانسی کے الحاق پر رانی نے توپیں زمین میں دفن کرادی تھیں۔ اب انھیں نکال کر استعمال کے قابل بنا لیا گیا۔ جھانسی میں داخلے کے جتنے راستے اور درے تھے، ان کی حفاظت کے انتظامات کر لیے گئے۔ جا بجا فوجی دستے بٹھا دیے گئے۔ لکشمن راؤ کو وزیر اعظم مقرر کیا، لیکن رانی نے کام کاج وزیروں یا مشیروں پر نہ چھوڑا۔ ہر معاملے پر خود توجہ کرتی۔ خاصی پڑھی لکھی اور بیدار مغز تھی۔ اپنے قلم سے احکام صادر کرتی۔ مردانہ لباس پہن کر دربار میں بیٹھتی اور تمام لوگوں کی درخواستیں خود سنتی۔ پوری ریاست کا دورہ کیا۔ اس میں تمام مقدمات کے فیصلے موقع پر کر دیے۔ سب جگہ امن ہو گیا۔ رعایا گن گانے لگی۔ ایک روایت کے مطابق انتظام اتنے اعلیٰ پیمانے پر پہنچا دیا تھا کہ رانی کو یقین تھا، انگریز گورنر جنرل اس صورت حال کو دیکھے گا تو ریاست حسب سابق دامودر گنگا دھر راؤ کے حوالے کر دے گا۔[1]

رانی کو شہسواری میں بھی کمال حاصل تھا اور گھوڑوں کی پہچان بھی بہت اچھی تھی۔ چنانچہ اپنے رسالے کے لیے وہ خود گھوڑے خریدتی تھی۔[2]

جھانسی کی حفاظت رانی انتظامات کی درستی میں لگی ہوئی تھی، لیکن فتنہ انگیزوں نے اسے اطمینان سے کام جاری رکھنے کا موقع نہ دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے سدا شیو راؤ نے فوج لے کر جھانسی پر قبضے کے لیے جدوجہد شروع کر دی، وہ کڑارا کے قلعے میں بیٹھ گیا اور اپنی راجائی کا اعلان کر دیا۔ رانی حکمرانی کی یہ تقسیم کیوں کر گوارا کر سکتی تھی؟ اس نے فوج تیار کی اور خود کماندار بن کر کڑارا پر حملہ آور ہوئی۔ سدا شیو راؤ نے شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا۔ رانی نے اُسے جھانسی کے قلعے میں قید کر دیا

---

[1] کن کیڈ ص ۶ ، [2] ایضاً ایضاً ۔

جب انگریز جھانسی پر قابض ہوئے تو سداشیوراؤ کو بغاوت کے جرم میں عمر قید کی سزا دے دی۔

سداشیوراؤ کا فتنہ مٹتے ہی اورچھا کے بندھیلہ رانا نے جھانسی پر دھاوا بول دیا اور اپنے جرنیل ناتھے خاں کو بیس ہزار فوج دے کر بھیجا۔ رانا کے دو مقصد تھے: ایک یہ کہ جھانسی کو اپنی ریاست میں شامل کرلے جو ایک زمانے میں بندھیلہ ریاست ہی کا حصہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اس عمل سے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرلے۔ رانی بندھیلہ فوج کے مقابلے کے لیے بھی خود نکلی اور ناتھے خاں کو شکست فاش دے کر مراجعت پر مجبور کردیا[1]۔ اس زمانے میں کرنل ہملٹن گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔ تمام حالات کے متعلق ایک مفصل خط بھی اس کے پاس بھیج دیا، لیکن رانی کا قاصد بندھیلوں کے ہاتھ آگیا اور یہ خط ہملٹن تک نہ پہنچا[2]۔ حقیقت یہ ہے کہ بندھیلے رانی اور انگریزوں کے درمیان کسی قسم کا ربط و ضبط پیدا ہونے کے روادار نہ تھے؛ ان کی خواہش یہ تھی کہ رانی کو انگریزوں کی دشمن ثابت کردیں تاکہ جھانسی کی ریاست انھیں مل جائے۔

انگریزوں سے مقابلہ

اس اثنا میں مشہور انگریز جرنیل ہیوروز[3] وسطی ہند میں انقلابیوں کی سرکوبی پر مامور ہوگیا اور جنوری ۱۸۵۸ء میں اس نے مئو سے نکل کر ساگر سے فوجی کارروائیوں کا آغاز کیا۔ اس وقت تک رانی نے انگریزوں کی مخالفت کا فیصلہ نہ کیا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ صحیح حالات سے انھیں آگاہ کرکے جھانسی کے مستقبل کا فیصلہ اپنی خواہش کے مطابق کرالے۔ یہ حقیقت ہے۔

---

[1] ڈاکٹر سین کا بیان ہے کہ پہلی لڑائی میں جھانسی کو شکست ہوئی، اس لیے کہ رانی کے پاس نہ قابل ذکر فوج تھی اور نہ ساز و سامان تھا۔ ناتھے خاں جھانسی کے قریب پہنچ گیا۔ پھر رانی نے ٹھاکروں سے امداد کے لیے اپیل کی اور ناتھے خاں کو شکست دی (ص ۲۸۱)۔ [2] کن کیڈ۔ [3] HUGH ROSE

رہا یہ امر کہ اس سے رانی کی وہ مجاہدانہ حیثیت باقی نہیں رہتی، جس کا تصور عام دماغوں میں مدت سے قائم ہے تو اس سے سوانح نگار کو کوئی سروکار نہیں۔ رانی کا اولین مقصد یہ تھا کہ جھانسی کا فیصلہ اس کی خواہش کے مطابق ہو جائے۔ اسی غرض سے وہ کوشاں رہی جب یہ امید ختم ہو گئی اور میدان میں مقابلے کی نوبت آ گئی تو وہ عزم و شجاعت کا ایک ایسا پیکر بن گئی، جس کی کوئی مثال احمد اللہ شاہ کے سوا نہیں ملتی۔ عظمت و برتری کی ایک بنیاد یہ ہے کہ مقصد اعلیٰ ہو اور اس کے لیے مردانہ وار جہاد کیا جائے۔ ایک بنیاد یہ ہے کہ مقصد وسعت و برتری کے انتہائی معیار پر پورا اترے یا نہ اترے، تاہم جائز ہو، حق پر مبنی ہو اور اس کے لیے میدانِ عمل میں قدم رکھا جائے تو پھر ایک لمحے کے لیے بھی تامل و تذبذب کو راہ نہ دی جائے اور ہر مصلحت کو نظر انداز کر کے جان کی بازی لگا دی جائے۔ رانی لکشمی بائی نے عظمت و برتری کے دوسرے معیار کا ایسا عملی نمونہ پیش کیا، جو اس کے ہر ہم وطن کے لیے باعث فخر و مباہات ہونا چاہیے اور دنیا کا کوئی بھی حق شناس و حق آگاہ آدمی رانی کے احترام میں متامل نہیں ہو سکتا۔[1]

جھانسی کا محاصرہ

ہیوروز جھانسی کے سرحدی استحکامات کو توڑتا ہوا، ۲۰ مارچ کو شہر کے سامنے نمودار ہوا۔ رانی نے اگرچہ حفاظت کے انتظامات

---

[1] رابرٹ ہملٹن کو جو خط لکھا تھا اس میں صاف مرقوم ہے کہ اورچھا اور دتیا نے جھانسی کے دو ضلع لے لیے جو ان کی سرحدوں سے متصل تھے۔ چالیس ہزار فوج اور اٹھائیس توپوں سے جھانسی پر حملہ کر دیا۔ کمشنر کو بھی اطلاع دی گئی۔ رانی نے کہا میں نے جائداد فروخت کر کے تیرہ سو روپیہ لے کر جھانسی کی حفاظت کا بندوبست کیا۔ ہملٹن نے یا تو اس خط پر توجہ ہی نہ کی یا اسے فریب سمجھا یا یہ اس کے پاس پہنچا ہی نہیں۔ ملاحظہ ہو سین کی کتاب ص ۲۷۲۔ کمشنر نے کہا کہ فوج جبل پور میں جمع ہو رہی ہے، سب کے روپیے کی دیکھ بھال ہو گی۔

ابتدا سے کر رکھے تھے۔ تاہم اس کی خواہش غالباً اس وقت بھی یہ تھی کہ پوری کیفیت انگریز سالار کو بتا دی جائے اور کشت و خون کو حتی الامکان روکا جائے۔ لیکن رزم و پیکار کے جوش و خروش میں رانی کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکتی تھی۔ صلح کے مخالفوں کا فیصلہ بظاہر چنداں غیر معقول نہ تھا۔ وہ دہلی کی فتح و تسخیر کے بعد انگریزوں کے ظلم و جور کی خوفناک حکایتیں سن چکے تھے۔ انھیں پنجاب اور بعض دوسرے مقامات کے خونچکاں واقعات بھی معلوم ہو چکے تھے، لہذا انھوں نے رائے دی کہ عذر خواہیوں اور التجاؤں کا وقت بیت چکا۔ انگریزوں کا رنگ ڈھنگ ایسا ہے کہ اگر مصالحت کا راستہ اختیار کیا گیا اور شہر انگریزوں کے قبضے میں آگیا تو سب کو پھانسیاں دے دی جائیں گی یا گولیوں سے اڑا دیا جائے گا۔[۱] پھر ذلت کی موت کے بجائے عزت کی موت کیوں قبول نہ کی جائے؟ مصالحت اور حوالگی میں بچاؤ کا کوئی امکان نہیں۔ ہم لڑیں گے تو ہو سکتا ہے انگریزوں کو شکست دے دیں۔ اس طرح عزت کی موت ہی نہیں، عزت کی زندگی بھی نصیب ہونے کا امکان ہے۔ پھر مقابلہ کیوں نہ کیا جائے؟

ہیوروز نے شہر کے ارد گرد گھوم پھر کر مناسب مقامات کا معائنہ کیا۔ توپوں کے لیے ایک دمدمہ شہر کے مشرق میں بنوایا، دوسرا شہر کے جنوب میں اور گولہ باری شروع کر دی گئی۔

اس کی مشکلات

انگریزی فوج کی مشکلات بڑی زیادہ تھیں۔ اوّل جھانسی بڑا محفوظ مقام تھا۔ شہر پر قبضہ کیے بغیر قلعے پر قبضہ کا راستہ صاف نہ ہو سکتا تھا اور دونوں کام بڑی محنت و مشقت اور سرگرمی کے محتاج تھے۔ تسخیر جھانسی کے

---

[۱] کن کیڈ نس ، ۔ بعض بیانات میں بتایا گیا ہے کہ جب آئندہ طریق عمل کے متعلق مشورے ہوئے تو رانی، کاشی ناتھ ہری اور لالو بخشی انگریزوں کے ساتھ صلح کے حق میں تھے۔ نانا صاحب درانی کا والد، اور گنگا دھر کہتے تھے کہ ریاست بڑی مصیبتوں کے بعد ملی ہے، اسے دوبارہ ضائع نہ کرنا چاہیے (سین کی کتاب صفحہ ۲۴۳)۔

بعد ہیوروز نے اعتراف کیا:

> جب تک جھانسی کو مسخر نہ کر لیا گیا، ہمیں شہر کے استحکامات کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا۔ ہم سمجھتے تھے کہ قلعے کے صرف جنوبی حصے کو توڑ لینا ممکن ہے۔ اندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ یہ خیال غلط تھا۔ بیرونی دیوار کے پیچھے تھوڑے فاصلے پر پندرہ بیس فٹ چوڑی ایک اور دیوار تھی اور اس کے پیچھے ایک گہرا تالاب چٹان کاٹ کر بنایا گیا تھا۔[1]

مزید برآں رانی نے جھانسی کے ارد گرد دور دور تک کا علاقہ بالکل بنجر بنا دیا تھا، یہاں تک کہ گھاس کا ایک تنکا بھی کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ لہٰذا فوج کے لیے کھانے پینے کے سامان اور جانوروں کے چارے کے انتظام میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ اوڑچھا کے بند کھیلہ راجا اور جیاجی راؤ سندھیا والیِ گوالیار کی امداد شامل نہ ہوتی تو جھانسی کا محاصرہ جاری رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔[2]

محاصرے کا منظر

محاصرہ دو ہفتے سے زیادہ مدت تک جاری رہا اور سترھویں روز شہر کی تسخیر پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ وقت کا نقشہ ایک عینی شاہد نے یوں پیش کیا ہے:

> ۲۵ مارچ سے لڑائی میں گرم جوشی پیدا ہوئی۔ دشمن کا توپ خانہ رات دن مسلسل گولے برساتا تھا۔ رات کے وقت توپ کے گولے قلعے اور شہر پر آتے۔ یہ نظارا بڑا ہی خوفناک تھا۔ پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ پونڈ کے گولے ٹینس کے گیند کی مانند دکھائی دیتے، لیکن ان کی شکل دہکتے ہوئے انگاروں کی سی تھی . . . ۲۶ مارچ کو نصف شب

---

[1] میلی سن کی کتاب جلد پنجم صفحہ ۱۲۹، [2] ایضاً صفحہ ۱۱۱،

کے قریب انگریزی توپ خانے نے شہر کی جنوبی سمت کی تمام توپیں خاموش کر دیں۔ ایک آدمی بھی دمدموں پر نظر نہ آتا تھا۔ قریباً سب ہمت ہار بیٹھے۔ اس وقت مغربی دروازے کے توپچی نے اپنی توپوں کا رُخ دشمن کی طرف پھیرا۔ تیسری ضرب میں انگریزوں کا بہترین توپچی مارا گیا اور اُن کی توپیں خاموش ہو گئیں۔ اس کارنامے پر بائی (ی) رانی بہت خوش ہوئی اور توپچی کو پازیب اتار کر دے دی۔ اس بہادر توپچی کا نام غلام غوث خاں تھا۔ اس نے نلکھے تال سالدار اورچھا کے خلاف جنگ میں بھی ایسی ہی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا تھا[1]

اسی طرح بتایا گیا ہے کہ ساتویں دن بائیں جانب کی توپیں بیکار ہو گئیں۔ مغرب کے وقت قلعے کی دیوار میں شگاف پڑ گیا، لیکن رات کے وقت معمار کمبلوں میں لپٹے ہوئے آئے اور صبح تک دیوار درست کر دی۔ دمدمے پھر بن گئے اور توپیں جوابی گولے برسانے لگیں۔ آٹھویں روز بارود کے ذخیرے میں آگ لگی۔ ہلاک ہونے والوں میں تیس مرد تھے اور آٹھ عورتیں[2]

تانتیا ٹوپے کی آمد

رانی نے امداد کے لیے تانا صاحب کو اطلاع بھجوا دی تھی۔ محاصرہ کے دوران میں تانتیا ٹوپے بائیس ہزار فوج[3] اور خاصا بڑا توپ خانہ لے کر آ گیا۔ یہ انگریزی فوج کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔ اگر تانتیا ٹوپے کا مقابلہ کیا جاتا تو پیچھے سے محصورین حملہ کر دیتے اور انگریزی فوج کا ایک بھی آدمی زندہ نہ بچتا۔ تانتیا اگرچہ اچھا جرنیل تھا، تاہم اس کی سپاہ اچھی نہ تھی اور حق یہ ہے کہ رانی لکشمی بائی کی طرح کوئی بھی جرنیل اپنی روح شجاعت و ایثار اپنی فوج میں پیدا نہ کر سکا۔ ہیوروز نے اس خطرے کے وقت انتہائی مردانگی دکھائی۔ توپ خانے کی گولہ باری جاری رکھی۔ اور

---

[1] ساورکر ص ۲۷۹ ، [2] ایضاً ص ۲۷۹، ۲۸۰ [3] سین نے فوج کی تعداد بیس ہزار لکھی ہے (ص ۲۸۶)

فوج کے ایک حصے کو لے کر وہ تانتیا کے مقابلے کے لیے نکل پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں بائیس ہزار آدمی بکھر کر اِدھر اُدھر بھاگ نکلے۔ ساورکر کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ فوج نے یا تو غداری کی یا اس پر حد درجہ ہراس طاری ہوگیا۔ تانتیا نے پاس کے جنگل کو آگ لگوا دی۔ اس طرح اپنے آپ کو تعاقب سے محفوظ کر لیا، لیکن اس کی شکست نے جھانسی کی تقدیر کا فیصلہ بھی کر دیا۔ جب بائیس ہزار کا لشکر رانی کے لیے مؤثر اعانت کا ذریعہ نہ بن سکا تو اب باہر سے اور کس کمک کی امید رکھی جاتی؟

جھانسی کی تسخیر

ہیوروز نے اب یہی مناسب سمجھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو جھانسی پر یورش کی جائے، مبادا کوئی دوسرا لشکر باہر سے رانی کی اعانت کے لیے آجائے اور معاملہ دگرگوں ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ نازک مواقع پر خوش نصیبی کی ساعتیں بار بار نہیں آیا کرتیں۔

چنانچہ توپ خانے کی گولہ باری بہت تیز کر دی گئی۔ ۲ اپریل کو اطلاع ملی کہ فصیل میں خاصا بڑا شگاف پڑ گیا۔ ۳ اپریل کو صبح کے تین بجے حملہ آور دستے شہر میں داخلے کے ارادے سے نکلے۔ رانی کے بہادروں نے جانبازی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ قدم قدم پر مزاحمت کی۔ محل کے سامنے جو بازار تھا، اس کے دونوں طرف آگ لگا دی گئی۔ گرمی اتنی شدت کی تھی کہ بازار میں سے کوئی گذر نہ سکتا تھا۔ رانی کے لشکریوں میں سے ایک بھی نہ تھا جس نے مقابلہ نہ کیا یا اپنی جان کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول نہ کی۔ پوری جنگ آزادی کی تاریخ میں ایسے سخت مقابلے کی مثال نہیں ملتی۔[1]

رانی کی سرگرمیاں

ساورکر نے لکھا ہے کہ رانی اس اثنا میں سرگرمی سے مختلف مورچوں کا چکر لگا رہی تھی۔ کہیں سنہری بازو بند اور قیمتی

---

[1] یہ تفصیلات میلی سن جلد پنجم سے ماخوذ ہیں۔

خلعت تقسیم کرتی۔ کسی کو تھپکی دے کر دل بڑھاتی۔ کسی کی جانبازی کی تحسین مسکراہٹ سے کرتی۔ پھر پکارتی! غلام غوث خاں اور خدا بخش، میرے بہادرو! توپ خانے کی آتش باری کو زیادہ سے زیادہ ہلاکت خیز بنا دو۔ وہ دیکھو دشمن نے بڑے دروازے کے ساتھ آٹھ مقامات پر سیڑھیاں لگا لی ہیں۔ [1]

خدا جانے رانی نے چند مہینے میں اپنی فوج کو کس بے پناہ جوش سے بھر دیا تھا کہ ایک سپاہی نے بھی بھاگنے کا نام نہ لیا۔ سب لڑے اور مردانگی سے جانیں دیں۔ خدا بخش اور غلام غوث خاں بھی شہید ہو گئے۔ رانی کے لیے ان کی موت سب سے بڑا صدمہ تھی۔ ریاست کے ایک قدیمی نمک خوار نے اس نازک موقع پر حاضر ہو کر پوچھا: حضور کا ارادہ کیا ہے؟ رانی نے بے تکلف کہا، میں اپنے ہاتھ سے میگزین کو آگ لگاؤں گی اور یہیں جان دے دوں گی۔ غیرت مندوں کے لیے دو ہی مقام ہیں، تخت یا تختہ۔

نمک خوار نے عرض کیا کہ آج رات حضور کو یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ رانی نے فرمایا کہ میں عورت ہوں۔ اگر دشمنوں کے ہاتھ پڑ گئی اور کسی اجنبی کا ہاتھ میرے جسم سے چھو گیا تو میں اُسے برداشت نہ کروں گی۔ یہیں مر جانا اچھا ہے۔ یہ سنتے ہی چند جانباز آگے بڑھے اور کہا کہ ہم ساتھ ہیں اور ہماری موجودگی میں کوئی شخص آپ کی طرف انگلی بھی اٹھائے گا تو ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ [2]

---

[1] ساورکر ص ۳۸۳ ایک انگریزی بیان مظہر ہے کہ ایک موقع پر توپ خانے کے ایک آدمی نے رانی اور اس کی خواصوں کو ایسی جگہ دیکھا جہاں بہ آسانی گولہ پھینکا جا سکتا تھا، لیکن ہیو روز نے اجازت نہ دی۔ فارسٹ جلد سوم ص ۱۹۹۔ یہ بیان سراسر افسانہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم اس سے ظاہر ہے کہ رانی خطرات سے بے پروا ہو کر لڑتی رہی۔

[2] ساورکر ص ۳۸۶،

مقابلے کے متعلق ایک اور بیان

ہومز لکھتا ہے: محل کے سامنے جو بازار تھا، اس کے ایک ایک مکان میں شدید مقابلہ ہوا۔ بعض محصورین کو مراجعت کا راستہ نہ ملا تو کنوؤں میں کود پڑے۔ بازار لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ دونوں طرف کے مکانات جل رہے تھے۔ قلعے سے بدستور گولے برس رہے تھے۔ انگریز سپاہی محل میں داخل ہوئے۔ ایک ایک کمرے میں زبردست مزاحمت سے سابقہ پڑا۔ سارا محل قبضے میں آگیا لیکن اصطبل کے ساتھ ایک کمرے میں چالیس سوار موجود تھے۔ اس کمرے کو آگ لگادی گئی۔ سوار باہر نکل پڑے۔ اُن کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی اور اندھا دھند تلواریں چلا رہے تھے۔ ایک ایک لڑکر مرا۔[1] اس سے مقابلے کی شدت اور رانی کی سپاہ کے جوش و خروش کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جھانسی سے روانگی

غرض ۴۔ اپریل کی رات کو لکشمی بائی نے مردانہ لباس پہنا۔ زرہ بکتر سے آراستہ ہوئی۔ منتخب جانبازوں کی ایک جماعت ساتھ لی۔ کچھ جواہرات اٹھائے۔ دامودر گنگا دھر کو ساتھ لیا۔ محبوب جھانسی پر وداعی نظر ڈالتی ہوئی اور اپنے فرمانبرداروں کا سلام لیتی ہوئی نکلی۔ سب زار زار رو رہے تھے۔ دروازے پر ریاست اوڑچھا کے سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ اُن سے کہا گیا کہ اوڑچھا کا لشکر ہیوروز کی طرف امداد کے لیے جا رہا ہے۔ صرف ایک کنیز، ایک بارگیر اور پندرہ سپاہی ساتھ تھے۔[2]

فارسٹ نے لکھا ہے کہ ۴۔ اور ۵۔ اپریل کی درمیانی شب میں رانی کا گھوڑا خندق کے اندر پہنچایا گیا۔ وہ ایک برج کی کھڑکی سے نیچے اتری۔ گھوڑے پر سوار ہوئی۔ اپنے متبنیٰ کو آگے بٹھایا۔ تین سو افغان اور پچیس پیادے ساتھ لے کر روانہ ہو گئی۔

---

[1] ہومز ص۴۹۴، [2] ساورکر ص۳۴۵،

جب سے انگریزی لشکر جھانسی پہنچا تھا، یہ پہلی تاریک رات تھی۔[1]

میرے نزدیک صحیح کیفیت وہی ہے جو پہلے پیش ہو چکی ہے۔ بعض نے افسانہ طرازی کی ہے کہ رانی جھانسی سے پیدل روانہ ہوئی حالانکہ وہ گھوڑے پر روانہ ہوئی تھی ساری رات تیزی سے سفر جاری رکھا، اس لیے کہ تعاقب کا شدید خطرہ تھا اور تعاقب ہوا بھی۔ بھنڈارہ[2] نام ایک مقام میں ناشتہ کیا۔ ساورکر کا بیان درست مانا جائے تو دن بھر بھی رانی نے دم نہ لیا۔ ۵۔ اور ۶۔ اپریل کی درمیانی شب میں ایک سو دو میل کا فاصلہ طے کر کے کالپی پہنچ گئی۔[3]

ایک اور بیان

فارسٹ کا بیان ہے کہ جو دستہ رانی کے تعاقب میں بھیجا گیا تھا۔ وہ ا[illegible] وقت بھنڈارہ پہنچ گیا۔ کپتان فاربز[4] نے لفٹنٹ ڈوکر[5] کو ہدایت کی کہ بھنڈارہ کے اندر سے گزرے اور خود اس کے بائیں جانب سے آگے بڑھا۔ ڈوکر نے بھنڈارہ پہنچ کر دیکھا کہ خیمہ لگا ہوا ہے اور ناشتہ بیچ میں چھوڑ دیا گیا ہے وہ آگے بڑھا تو اُسے رانی کا ایک دستہ فوج ملا، جو چالیس افراد پر مشتمل تھا یہ سب مارے گئے۔ ڈوکر اور آگے بڑھا تو دیکھا کہ رانی اپنے مشہور سفید گھوڑے پر سوار جا رہی ہے اور صرف چار ملازم ساتھ ہیں۔ ڈوکر نے رفتار تیز کر دی۔ جب رانی کے نزدیک پہنچ گیا تو ایک گولی آئی اور ڈوکر سخت زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑا، ساتھ ہی تعاقب ختم ہو گیا۔[6]

اس بیان کو درست مانا جائے تو سمجھنا چاہیے کہ رانی بڑی مشکل سے بچ کر کالپی پہنچی۔

۱؎ فارسٹ جلد سوم ص۲۱۹، چاند کے حساب سے شعبان ۱۲۷۴ھ کی انیسویں یا بیسویں تاریخ ہوگی۔ مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ چاند دیر سے نکلا اور رات دیر تک تاریک رہی۔ ۲؎ یہ گاؤں جھانسی سے [illegible] میل کے فاصلے پر ہے۔ ۳؎ ساورکر ص۳۸۹ ۴؎ FORBES ۵؎ DOWKER ۶؎ فارسٹ جلد سوم ص۲۱۶۔ ساورکر نے بھی یہی بیان کیا ہے لیکن اس میں تعاقب کنندہ افسر کا نام بوکر BOWKER لکھا ہے جو غالباً چھاپے کی غلطی ہے۔

والد کو پھانسی

جھانسی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور رانی بچ نکلی۔ اس کی فوج کے بہادروں کا ایک گروہ قلعے کی مغربی جانب ایک اونچے ٹیلے پر جا پہنچا اور لڑائی جاری رکھی۔ انگریزی فوج نے اس ٹیلے کو گھیر لیا اور چوٹی پر گولہ باری شروع کر دی۔ پھر پیادہ فوج کا ایک دستہ اوپر بھیجا گیا۔ بیس کے سوا جھانسی کی فوج کے یہ تمام بہادر مارے گئے۔ ان بیس نے خودکشی کر لی۔ رانی کا والد مورو پنت بلونت راؤ تامبے بھی اسی ٹیلے پر تھا۔ وہ زخمی ہو چکا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح بچ کر دتیا پہنچ گیا۔ دتیا کے دیوان نے اُسے انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اس غریب کو پھانسی کی سزا دی گئی۔[1] فارسٹ لکھتا ہے:

> بہتر ہوتا وہ بھی لڑتا ہوا مارا جاتا، لیکن انصاف کا تقاضا دوسرا تھا، اس لیے کہ جو خوفناک جرم جھانسی میں وسیع خونی المیے پر منتج ہوا، اس میں سب سے بڑا محرک یہی شخص تھا۔ چند روز کے بعد وہ گرفتار ہو گیا اور اُسے اسی باغ کے ایک درخت پر پھانسی دی گئی، جس میں انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔[2]

بلاشبہ وہ انگریزوں کا سخت مخالف تھا اور اس فریق کا سرخیل تھا جو انگریزوں سے مصالحت کے خلاف تھا، تاہم یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ان انگریزوں کو قتل کرایا تھا جنھوں نے قلعہ حوالے کیا تھا۔

کونچ اور کالپی

رانی کالپی پہنچی۔ نانا صاحب کے بھتیجے راؤ صاحب سے ملاقات کی تو صرف ایک مطالبہ پیش کیا کہ میرے لیے فوج کا انتظام کر دیجیے تاکہ انگریزوں

---

[1] ساورکر صفحہ ۲۸۶، [2] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۲۱۶، ۲۱۷۔ ڈاکٹر سین کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ بلونت راؤ تامبے عرف نانا صاحب رانی کے ساتھ نکلا تھا اور راستہ بھول کر دتیا پہنچ گیا۔ بہرحال دتیا وہ کسی بھی حال میں پہنچا ہو، وہیں سے انگریزوں کے حوالے ہوا۔

سے لڑوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اب رانی کے سامنے انگریزوں کے قلع قمع کے سوا کوئی مقصد نہ تھا۔ وہ جھانسی سے بے دخل ہو چکی تھی۔ ۲۱ - مارچ سے ۴ - اپریل تک اپنے بہادروں کو آزادی کے لیے بے دریغ جانیں قربان کرتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اب وہ یا تو اصل مقصد کو پورا کرنے کی آرزو مند تھی، یعنی انگریزوں کا استیصال یا چاہتی تھی کہ خود بھی میدان جنگ میں جان دے دے۔

تانتیا ٹوپے بھی کالپی ہی آ گیا تھا۔ راؤ صاحب نے فوج کو پریڈ کا حکم دیا۔ ان کے روبرو پُرجوش تقریر کی۔ پھر تانتیا کو سالار بنا کر ہدایت کی کہ انگریزی فوج کے مقابلے پر نکلے۔ تانتیا فوج لے کر کوچ پہنچا، جو کالپی سے ۴۲ میل کے فاصلے پر جھانسی کی سڑک کے کنارے واقع تھا۔ رانی بھی تانتیا کے ساتھ گئی۔

ہیوروز نے جھانسی کی حفاظت کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ۲۰ - اپریل کو کالپی کی جانب کوچ کیا۔ ۶ - مئی کو اس نے ایسی جنگی چال چلی کہ تانتیا نے شکست کھائی اور رانی کے لیے کوچ میں ٹھہرے رہنا ممکن نہ رہا۔ وہ پھر کالپی چلی گئی۔ تانتیا والدین سے ملنے کے لیے چرکی پہنچ گیا۔[1] کالپی میں سخت مقابلہ ہوا، لیکن انقلابیوں نے وہاں بھی شکست کھائی، اور شہر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انقلابی فوج بے ترتیب تھی اور وہ جم کر مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ نیز سالاری اور قیادت کے جوہر سب سے بڑھ کر رانی لکشمی بائی میں موجود تھے، لیکن اُسے خود مختاری کے ساتھ جنگ کا موقع نہ دیا جاتا تھا۔

---

[1] میلی سن کا بیان ہے کہ فوج کے تمام طبقے کوچ کی شکست کا ذمہ دار تانتیا کو ٹھہراتے تھے۔ بعض کہتے تھے کہ جھانسی کے رسالے نے بھی حق استقامت ادا نہ کیا۔ رسالے کے سوار یہ عذر کرتے تھے کہ ہمارے لیے رانی کا بچاؤ ہر شے پر مقدم تھا (جلد پنجم ص ۱۲۱)۔ اس بارے میں کوئی فیصلہ کن ممکن نہیں۔ میرا تاثر یہی ہے کہ تانتیا میدان عمل میں گھبرا جاتا تھا۔

رانی کی بہادری

کالپی کی لڑائی میں بھی رانی نے بہادری و جانبازی میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ انقلابی فوج کا ہراول بہت آگے بڑھ گیا تھا۔ چونکہ اس کی اعانت کا بندوبست نہ ہو سکا لہذا وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوا۔ رانی نے یہ صورت حال دیکھی:

> تو وہ شمشیر بدست بجلی کی تیزی سے نکلی اور اپنے سرخ پوش رسالے کے ساتھ انگریزی فوج کے دائیں بازو پر حملہ آور ہوئی۔ حملہ اتنا اچانک تھا کہ انگریزی فوج کی پیش قدمی رک گئی اور وہ بے بس ہو کر پیچھے ہٹی۔ ۲۱ سالہ خاتون کا یہ تیز حملہ اس کے گھوڑے کا سرپٹ دوڑنا، اس کی تلوار کا دائیں بائیں دشمن کو کاٹ کاٹ کر پھینکنا! کون تھا جو اس منظر کو دیکھ کر لڑ مرنے پر تیار نہ ہوتا؟ کون تھا جس میں رانی کے طرز عمل سے عزم و شجاعت کی نئی روح پیدا نہ ہو جاتی؟ تمام انقلابی سینے جوش مردانگی سے معمور ہو گئے۔ لڑائی سرگرمی سے جاری تھی۔ خون بہہ رہا تھا۔ بلکہ میدانی توپ خانے کے فرنگی توپچی ایک ایک کر کے مرنے لگے اس کے بعد رانی اپنے رسالے کو لے کر توپوں پر جا گری جو ہلاکت بار آگ برسا رہی تھیں۔ انگریز توپچی توپیں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اسپ سوار توپ خانے کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بہادر انقلابی ہر سمت سے آگے بڑھنے لگے۔ ان کے سینے خوشی سے لبریز تھے کہ جو فرنگی مدت سے پچھتے چلے آتے تھے، ان کی سرکوبی کا موقع آگیا۔ لکشمی سب سے آگے جلوہ گر تھی۔[1]

---

[1] ساورکر صفحہ ۳۹۱ - ۳۹۲،

لیکن یہ بہادری نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ اس لیے کہ ۲۴ مئی کو جیوروز فاتحانہ کالپی میں داخل ہو گیا۔

نیا نقشۂ عمل

ظاہر ہے کہ اب انقلابیوں کے حالات خاصے پریشان کن تھے۔ انگریزوں کی پے درپے کامیابیوں نے ہزاروں متذبذب دلوں کو بھی ان کی طرف مائل کر دیا تھا اور انقلابی تحریک کے لیے فضا خاصی ناسازگار ہو چکی تھی۔ چنانچہ اس موقع پر رانی لکشمی بائی نے یہ تجویز پیش کی کہ اب جلد سے جلد گوالیار پہنچ کر سندھیا کی فوج کے قومی اور مذہبی جذبات سے اپیل کرنی چاہیے۔ یقینی طور پر تو کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ لیکن میلی سن کے نزدیک یہ تجویز رانی کے سوا کسی کے دماغ میں نہ آسکتی تھی۔ ڈاکٹر سین کا بیان ہے کہ سپاہی اودھ جانا چاہتے تھے۔ رانی کی رائے تھی کہ قلعہ کرہ ا آزاد یا بندھیل کھنڈ کے کسی دوسرے مقام پر بیٹھ کر لڑنا چاہیے۔ تانتیا کہتا تھا کہ اہل بندھیل کھنڈ ہمارے خلاف ہیں۔ راؤ صاحب کی خواہش تھی کہ سب دکن پہنچیں جہاں بہتر اعانت کا بندوبست ہو سکتا تھا۔ [1]

میلی سن لکھتا ہے کہ اس موقع پر انقلابیوں کے چار ممتاز لیڈر تھے۔ راؤ صاحب، نواب باندہ، تانتیا ٹوپے اور رانی لکشمی بائی۔ ابتدائی دو کو اس لیے خارج از بحث سمجھنا چاہیے کہ ان کی سابقہ کارروائیوں میں نہ کردار کا کوئی جوہر نمایاں ہوا اور نہ فکر و نظر کی بلندی پائی گئی۔ تانتیا میں بے شک صلاحیت تھی، لیکن ہمارے سامنے اس کے خود نوشتہ حالات موجود ہیں۔ اُن میں کامیاب ترین کارنامے بھی تھے اور تانتیا نے قطعاً کوئی اعزاز اپنے لیے مخصوص نہ رکھا [2]۔ البتہ رانی میں ذکاوت کے جوہر بھی تھے اور بے پناہ مردانگی بھی، ایسے

---

[1] سین کی کتاب صفحہ ۲۸۵۔ [2] یہ دلیل کمزور ہے۔ انقلابیوں میں سے اکثر بے غرض لوگ تھے اور وہ تمام کامیابیوں کو جماعت و قوم سے منسوب کرتے تھے۔ انھیں ذاتی اعزازات کی قطعاً خواہش نہ تھی۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ تانتیا کسی بھی موقع پر بڑا کارنامہ انجام نہ دے سکا۔

حالات بھی موجود تھے، جو بلند کارناموں کے نقشے تیار کرنے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔[1]

سندھیا کا فرار

رانی کی اس تجویز یعنی گوالیار پہنچنے کو سب نے بے تامل قبول کر لیا۔ اور تمام انقلابی ۳۰ مئی کی شب میں مرار پہنچ گئے، جو گوالیار کی مشہور چھاؤنی ہے۔ ان کے ساتھ سات ہزار پیادہ فوج اور چار ہزار سوار تھے بارہ توپیں تھیں۔

جیاجی راؤ سندھیا اور اس کا وزیر ڈنکر راؤ انگریزوں کے حامی تھے۔ یکم جون ۱۸۵۸ء کو سندھیا صبح کے وقت چھ ہزار پیادے اور ڈیڑھ ہزار سوار لے کر مقابلے کے لیے نکلا۔ اس کے ساتھ آٹھ توپیں تھیں۔ توپوں نے گولہ باری شروع کی۔ انقلابی فوج کے دو ہزار سواروں نے ایک ہی ہلے میں توپیں چھین لیں۔ ساتھ ہی سندھیائی فوج یا تو انقلابیوں میں شامل ہو گئی یا لڑنے سے انکار کر دیا۔ صرف سندھیا کا محافظ دستہ، جو چھ سو افراد پر مشتمل تھا، عہدِ وفا پر قائم رہا۔ ان میں سے کچھ مارے گئے، باقی تھوڑے سے سواروں کے ساتھ سندھیا بھاگ کر انگریزوں کی پناہ میں آگرہ پہنچ گیا۔ گوالیار کی رانیاں بیجا بائی کی سرکردگی میں قلعہ نرور پہنچ گئیں۔ یہ بیجا بائی دولت راؤ سندھیا کی بیوہ اور دورِ اقتدار میں بڑی زبردست رانی تھی۔ انقلابیوں نے گوالیار میں داخل ہو کر خزانے اور اسلحہ پر قبضہ کیا۔ نانا صاحب کی پیشوائی کا اعلان ہوا۔ راؤ صاحب کو گوالیار کا حاکم بنایا گیا۔ رام راؤ گوبند وزیرِ اعظم قرار پایا۔ فوج کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا گیا۔[2]

---

[1] جلد پنجم ص۱۹۴، [2] الفاظ ص۱۴۶-۱۴۷، بتایا گیا ہے کہ بیس لاکھ سے اوپر رقم لی گئی تھی۔ نو لاکھ سندھیا کی فوج میں بانٹے، تین ماہ کی تنخواہ جو واجب الادا تھی اور دو ماہ کی تنخواہ انعام، بیس ہزار رانی کو، دیے ساٹھ ہزار نواب باندہ کو، پندرہ ہزار اشرفیاں راؤ صاحب نے لیں۔ اس طرح انیس لاکھ سے کم رقم کا حساب مل گیا۔ ڈیڑھ لاکھ کا کوئی حساب نہ ملا۔ (سین کی کتاب ص۲۹۳)

ساورکر کا بیان ہے۔ تانتیا نے اگرچہ ظاہر یہ کیا تھا کہ والدین سے ملنے جا رہا ہوں لیکن حقیقتاً وہ اس فکر میں تھا کہ اگر کالپی کو خالی کرنا پڑا تو کوئی دوسرا مرکز تیار کر لینا چاہیے۔ چنانچہ وہ گوالیار گیا۔ درباریوں، سرداروں اور دوسرے اکابر سے مل کر انھیں ہم نوا بنایا۔ پھر راؤ صاحب کے پاس جا کر گوالیار پہنچنے کی تجویز پیش کی:

۲۲ مئی کو انقلابی محل پہنچے۔ محل کے کارداروں نے انھیں روکنا چاہا۔
انقلابیوں نے جواب دیا، تم روکنے والے کون ہو؟ ہم پیشوا کے نمائندے
ہیں۔ ہم سوراج اور سودھرم کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہاں دُنیا کو جان لینا
چاہیے کہ ہم پیشوا ہیں۔ ہماری جنگ سوراج اور سودھرم کے لیے ہے۔[1]

جنگ مرار

انگریزی فوج کا تخلیہ کالپی کے بعد مطمئن ہو گئی تھی کہ اب زیادہ لڑائی بھڑائی کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ لیکن جب سُنا کہ انقلابی گوالیار پر قابض ہو چکے ہیں تو ہیوروز خود کالپی سے چلا۔ برگیڈیر سمتھ کو جو چندیری کے قریب تھا، حکم بھیجا کہ جلد سے جلد "کوٹہ کی سرائے" پہنچو، جو گوالیار سے پانچ میل جنوب میں ہے۔ ۱۲ جون کو رابرٹ نیپیر بھی ہیوروز سے آملا۔ یہی انگریز جرنیل ہے جس نے بعد ازاں وسطی ہند میں انقلابیوں سے لڑائیاں کیں۔ اسی نے تانتیا کو گرفتار کیا تھا۔ اُسے بعد ازاں لارڈ نیپیر آف مگدالہ کا خطاب ملا۔

سندھیا کے آدمی ہیوروز کی رہبری کر رہے تھے۔ وہ مرار پہنچا تو اچانک اس پر گولے اور گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ تاہم تھوڑی دیر میں مرار کی انقلابی فوج نے شکست کھائی۔ ہیوروز اس میدان میں بھی کامیاب رہا۔

---

[1] ساورکر ص ۲۹۴۔ ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ گوالیار کا نائب کوتوال بِٹھور کا باشندہ تھا جو نانا صاحب اور پیشوا باجی راؤ کا وطن تھا، تانتیا کا داماد بھی گوالیار ہی میں رہتا تھا۔ نائب کوتوال سے بہرحال امداد و اعانت ہی کی اُمید ہو سکتی تھی۔

رانی کی کیفیت

سادرکرنے لکھا ہے کہ مار میں شکست کی خبر سن کر راؤ صاحب نے نواب باندہ کی قیام گاہ کا رُخ کیا اور نواب باندہ نے راؤ صاحب کی قیام گاہ کا:

اس افراتفری میں صرف رانی مطمئن اور تیار بیٹھی تھی۔ اس کی تلوار بے نیام تھی۔ خوف اور ڈر سے اب اُسے کیا واسطہ تھا؟ وہ اُمید و بیم دونوں کو پاؤں کے نیچے کچل چکی تھی۔ دُنیا کی چیزوں سے اُسے کوئی دل بستگی نہ رہی تھی۔ صرف ایک جذبہ اور ایک عزم باقی تھا اور وہ یہ کہ جب تک دم میں دم ہے، آزادی کا پرچم اس کی نوک شمشیر پر لہراتا رہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس نے راؤ صاحب کی حوصلہ افزائی کی۔ جس حد تک ممکن تھا، بکھری ہوئی فوج کو از سر نو مرتب کیا اور مشرقی دروازے کی حفاظت اپنے ذمے لے لی۔ جنگ کی اس دیوی کے لبوں پر صرف ایک پکار تھی: میں اپنی جان کے ساتھ ادائے فرض کے لیے تیار ہوں، تم لوگ اپنا فرض بجا لاؤ۔ [1]

میدانِ شہادت

رانی نے مردانہ لباس پہنا۔ چندیری دستار سر پر رکھی، مرصع تلوار بے نیام کی اور اپنے زیرِ کمان فوج کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اس روز اس کا پیارا گھوڑا موجود نہ تھا اور دوسرے گھوڑے پر سوار ہونا پڑا۔ کوٹہ کی سرائے کے قریب تمام چوکیوں پر اپنے بہادروں کو بٹھا دیا۔ رانی کی دو کنیزیں ہر وقت ساتھ رہتیں تھیں۔ ایک کا نام "مندر" تھا، دوسری کا "کاشی"۔ اس روز بھی وہ ساتھ تھیں۔

برگیڈیر سمتھ نے سامان کوٹہ کی سرائے میں چھوڑا اور پیش قدمی شروع کی۔ رانی کی فوج نے سخت مقابلہ کیا۔ ایک نالے کے عبور میں انگریزی فوج کو دیر لگی اور حالات بہت نازک صورت اختیار کر گئے۔ ایک مرتبہ سمتھ کا گھوڑا زخمی ہو کر گرا اور سوار کے بھی جسم پر جا بجا زخم لگے۔

---

[1] سادرکر صـ ۳۹۴

کلائی بھی اُتر گئی۔ تاہم تھوڑی ہی دیر میں انگریزی فوج نے مشکلات پر قابو پا لیا۔ اب انقلابی بکھرنے لگے۔

میلی سن نے لکھا ہے کہ انگریزی فوج نشیب میں قدم قدم پر لڑتی ہوئی، اُوپر پہنچی:

رانی بہادری سے انگریزی رسالے کے مقابلے پر جم گئی۔ اس کے ساتھی پیچھے ہٹے تو رانی نے اپنے گھوڑے کو روکنا چاہا۔ لیکن وہ بھی دوسرے گھوڑوں کے ساتھ پیچھے گیا۔ شاید وہ بھی دوسروں کے ساتھ بچ نکلتی لیکن چھاؤنی کے پاس کی نہر کو عبور کرتے وقت اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ ایک انگریز سپاہی نے جو پیچھے پیچھے آ رہا تھا، رانی کے دریچے اور ضعف سے بے خبری کی حالت میں کاری زخم لگایا۔ وہ گری، پھر نہ اُٹھ سکی۔[1]

یہ ۱۸۔ جون ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔

ساورکر کا بیان ساورکر کا بیان ہے کہ رانی جم کر مقابلہ کرتی ہوئی، انگریزی فوج کے درمیان گھر گئی۔ اُس نے چاہا کہ گھوڑا دوڑاتی ہوئی حلقے کو توڑ کر نکل جائے۔ اچانک اس کے کان میں آواز آئی:

"میں مری بائی صاحب، میں مری"۔ پلٹ کر دیکھا تو اس کی کنیز مندر کی آواز تھی، جسے ایک سپاہی نے گولی ماری تھی۔ رانی نے اس سپاہی کو قتل کر دیا۔ پھر حلقہ توڑنے کے لیے نکلی۔ سامنے نالہ آ گیا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ وہ چھلانگ نہ لگا سکا اور کنارے پر چکر کھاتا رہا۔ اس اثنا میں انگریز سواروں نے اُسے نرغے میں لے لیا۔ تلوار چلنے لگی۔ ایک نے پیچھے سے سر پر وار کیا اور سر کا ایک حصہ کٹ گیا بلکہ آنکھوں کو بھی نقصان پہنچا۔ دوسرا وار سینے پر ہوا اور وہ گر گئی۔ لیکن جس فرنگی نے اُسے زخمی کیا تھا، اس کا کام تمام کر دیا۔

---

[1] جلد پنجم ص ۱۵۴، ۱۵۵۔

آخری رسوم اب رانی کے آخری سانس تھے۔ اس کا وفادار ملازم رام چندر راؤ دیش مکھ قریب ہی تھا۔ وہ اس شیردل مجاہدۂ آزادی کو اٹھا کر پاس کی جھونپڑی میں لے گیا۔

گنگا داس باوا نے پیاس بجھانے کے لیے ٹھنڈا پانی پلایا اور لبستر کا انتظام کر دیا۔ یوں جنگ کی یہ دیوی خون میں نہائی ہوئی لبستر پر لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اُس کا مُرغ روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گیا۔ رانی نے مرتے وقت جو ہدایات کی تھیں، ان کے مطابق رام چندر راؤ نے دشمن کی نگاہوں سے بچ بچا کر گھاس کا انبار فراہم کیا، اس پر رانی کی ارتھی رکھی۔ رانی کا مردہ جسم آگ کی نذر ہو گیا۔[1]

تانتیا نے گرفتاری کے بعد اپنے سوانح کے متعلق جو یادداشت تیار کی تھی اس میں لکھا تھا کہ رانی کی ارتھی رام راؤ گوبند نے جلائی تھی۔[2]

ملازم کی زبانی فارسٹ لکھتا ہے کہ رانی کی وفات کے متعلق بہت سی کہانیاں مشہور ہیں، لیکن اس کے ملازم کا بیان زیادہ سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور وہ ذیل میں درج ہے:

رانی کا معمول تھا کہ مردانہ لباس پہن کر فوجوں کی قیادت کرتی۔ سُرخ کوٹ، سُرخ پتلون اور سفید پگڑی۔ اس لباس میں کوئی شخص اس کی صنف نہ پہچان سکتا۔ اس کے متوفی شوہر کی برہمنی خواص گوالیری فوج کے لباس میں ہر لحظہ ساتھ رہتی تھی۔ وہ دونوں (رانی اور خواص) پھول باغ کے دمدمے کے پاس بیٹھی ہوئی شربت پی رہی تھیں۔ ۸۰ بے قاعدہ سپاہی رانی کے چار سو آدمی قریب ہی بیٹھے تھے۔ اس وقت

---

[1] ساورکر صفحہ ۴۰۳۔ یہ بیان غالباً رانی کے مرہٹی سوانح نگار کی کتاب پر مبنی ہے۔ جس نے واقعات کی خوب چھان بین کی تھی۔
[2] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۲۵۶ (ضمیمہ ب)

خطرے کا بگل بجا کر (انگریزی فوج کے) اسی سوار آ پہنچے۔ وہ چالیس پچاس ہوں گے۔ "باقی" بھاگ نکلے۔ صرف پندرہ کے قریب اپنی جگہ جمے رہے۔ رانی گھوڑے پر سوار ہوئی۔ اس کے گھوڑے نے نہر کو جانے میں تامل کیا۔ اس وقت رانی کے پہلو میں گولی لگی۔ پھر سر پر ایک زخم آیا۔ لیکن وہ گھوڑا دوڑاتی ہوئی نکل گئی۔ تھوڑی دیر میں دم نکل گیا اور گر پڑی، اور پاس ہی کے ایک باغ میں اس کی ارتھی جلائی گئی۔ اس وقت بہنی خواص کے چہرے پر بھی تلوار کا زخم آیا لیکن شہر میں پہنچ گئی۔ ایک فقیر اور مسلمان کوتوال نے اس کی تیمار داری کی۔ انھیں کے ہاتھوں میں وہ مری اور نومسلم کی حیثیت میں اُسے دفن کیا گیا۔[1]

ڈاکٹر سین ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ رانی کے گولی لگی۔ تانتیا اور راؤ صاحب بھی پاس تھے۔ بیس منٹ بعد اس نے وفات پائی۔ اسے اُٹھا کر پھول باغ کی طرف لے گئے۔ راؤ صاحب پاس تھے۔ پھر لاش کی پالکی میں لٹایا۔ قلعے اور پھول باغ کے درمیان جو ندی ہے اس پر لے گئے۔ وہاں بہ اطمینان آخری رسم ادا کرنا ممکن نظر نہ آیا تو لاش کو اٹھا کر دیوار پر سے باغ کے اندر پہنچایا اور ایک درخت کے نیچے جلانے کا انتظام کیا۔ ابھی رسم ختم نہ ہوئی تھی کہ انگریزی فوج کا حملہ ہوگیا۔ جو لوگ رسم چھوڑ کر بھاگے ان میں سے چھ سات مارے گئے۔ بہرحال لاش جل چکی تھی لیکن پھول چنے نہ گئے تھے۔[2]

رانی کی شخصیت رانی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کشیدہ قامت، نہایت حسین و جمیل حد درجہ سرگرم و مستعد، خوددار اور دھن کی پکی تھی۔ جھانسی سے گوالیار تک ہیوروز کو جتنی لڑائیاں پیش آئیں قریباً ان سب میں رانی سے مقابلہ ہوا لہذا

---

[1] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۲۸۱-۲۸۲۔ ہومز نے بھی لکھا ہے کہ رانی کی وفات قرابین کی گولی لگنے سے ہوئی (صفحہ ۵۱۰) [2] صفحہ ۲۹۵۔

اس انگریز جرنیل کو زیادہ سے زیادہ صحیح رائے قائم کرنے کے موقعے ملتے رہے اس نے اعتراف کیا ہے کہ

"باغیوں میں رانی شجاع ترین اور قابل ترین فوجی سالار تھی۔"

کن کیڈ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ دشمن سپہ سالار کی تعریف ہی حقیقی تعریف ہے۔ عربی کی مشہور مثل ہے:

الفضل ما شہدت بہ الاعدا

یعنی اصل فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمنوں کی زبان پر بے اختیار جاری ہو جائے

ایک اور اعتراف ملاحظہ فرمایئے:

رانی نے اپنے آپ کو نہایت قابل حکمران ثابت کیا۔ اس نے ٹکسال بنائی۔ جہاں جہاں انتظامات ضروری تھے، ان کا بندوبست کیا۔ توپیں ڈھلوائیں۔ فوجیں تیار کیں۔ اپنی حکومت کے ہر کام میں وہ ایک مستحکم اور لبریز عزیمت کردار کی روح بھر دیتی تھی۔

رعایا میں اسے بے پناہ اثر و رسوخ حاصل تھا۔ ایک انگریز لکھتا ہے:

یہی اثر و رسوخ اور کردار کی یہی محکمیت تھی، جسے شاندار اور روح افروز جوانمردی نے چار چاند لگا دیئے اور چند ماہ بعد اس نے ہیوروز کے زیر کمان فوجوں کا مقابلہ اس شان سے کیا کہ اگر سپہ سالار کا اہلیت کا ہوتا تو رانی کے لیے کامیابی کا بھی امکان تھا۔

جان لینگ کا بیان | جان لینگ ایک مشہور وکیل تھا۔ جس سے رانی نے الحاق جھانسی کے بعد قانونی مشورہ لیا تھا، اس کا بیان اوپر نقل ہو چکا ہے کہ:

وہ درمیانے قد کی عورت تھی۔ جسم ذرا بھاری بھرا تھا، مگر بھاری نہ تھا۔ یقین

ہے کہ نوجوانی میں اس کا چہرہ بہت خوب صورت ہوگا۔ اب بھی اس میں جاذبیت کے کئی پہلو تھے، اگرچہ میرے تصورِ حسن کے مطابق چہرہ زیادہ گول ہے۔ اس کا بشرہ بھی بڑا ہی اچھا تھا اور اس سے ذکاوت ٹپکی پڑتی ہے، خصوصاً آنکھیں بے حد دلکش تھیں اور ناک وضع قطع میں نہایت خوب صورت تھی اس کا رنگ بہت زیادہ سفید نہ تھا لیکن سیاہ سے بھی بہت دور تھا۔ عجیب امر یہ ہے کہ سنہری بالیوں کے ایک جوڑے کے سوا اس کے جسم پر کوئی زیور نہ تھا۔ اس کا لباس سادہ اور سفید ململ کا تھا۔ جو اتنی مہین اور جسم سے ملی ہوئی تھی کہ اس کا ڈیل ڈول صاف نظر آتا تھا، اور ڈیل ڈول حد درجہ خوش وضع تھا۔ البتہ اس کی آواز اچھی نہ تھی۔

دیر ہے اندھیر نہیں

بہرحال وہ بہت بڑی نادر شخصیت کی مالک تھی۔ ایسے دور میں پیدا ہوئی جب اس کے جوہروں کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے والے بہت کم لوگ تھے اور ایسے حالات و واقعات سے سابقہ پڑا، جن کی تاریکی کے سیاہ پردوں میں سے اس کی عظمت و برتری کی روشنی چھن کر باہر آ ہی نہ سکتی تھی، لیکن یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔ وقت آگیا ہے جب رانی لکشمی بائی کے یگانہ اوصاف بچے بچے کی زبان پر ہوں گے اور جن کے ہاتھوں اس نے زندگی میں دکھ اٹھائے ان کے نام صرف ظلم و جور، حق کشی و بے انصافی اور بزدلی و بے حمیتی کے مترادف رہ جائیں گے۔

رانی کے خریطے

ڈاکٹر سین نے اپنی کتاب میں رانی کے خریطے تیز جھانسی کے متعلق انگریزوں کی باہم خط و کتابت شائع کر دی ہے جس سے رانی کی صحیح پوزیشن پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ ساگر ڈویژن کے کمشنر ارسکن کا خط سیسل بیڈن سکرٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ کے نام

جس میں رانی کے دو خریطے شامل تھے اور ایک خط میں واقعات کی کیفیت بیان کی گئی تھی۔

۲۔ ایک خریطہ جو ارسکن نے ۲۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو رانی کے نام بھیجا تھا۔

۳۔ ارسکن کا اعلان جو اس نے رانی کو عارضی طور پر انتظامات سنبھال لینے کے سلسلے میں بھیجا تھا۔

۴۔ ایڈیشنل سکریٹری حکومت ہند کا خط ارسکن کے نام۔

۵۔ جھانسی کے حالات کا مرتبہ پولیٹیکل اسسٹنٹ بندیل کھنڈ وارا کی طرف سے سکریٹری حکومت ہند کے نام۔

۶۔ رانی کا خریطہ بنام ایجنٹ گورنر جنرل برائے وسط ہند مرقومہ یکم جنوری ۱۸۵۸ء۔

حقیقی حیثیت

ان پر بحث بالکل غیر ضروری ہے، اس لیے کہ ہم اس بارے میں اپنا نقطۂ نگاہ واضح کر چکے ہیں، لیکن مختلف خطوط کے خطاب کا خلاصہ پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

۱۔ ارسکن نے رانی کو خریطہ بھیجنے کے ساتھ حکومت کو اطلاع دی تھی کہ میں نے رانی کو انتظام سنبھالنے، مالیہ وصول کرنے وغیرہ کی اجازت دیدی ہے اور رانی کی مختاری کا اعلان بھی بھیج دیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے بتایا کہ جو ہرکارے گنگادھر راؤ کی اور بھوانی کے خریطے لاتے تھے، وہ راستہ میں لٹ گئے لہٰذا انھیں تیس تیس روپے انعام دیا گیا نیز کہا گیا کہ رانی کو خط پہنچا دیں گے تو بیس بیس روپے اور دیے جائیں گے۔

۲۔ رانی نے پہلے خریطے میں حالات بتائے۔ اپنی مجبوریاں پیش کیں۔ یہ بھی لکھا کہ اگر میں باغیوں کا مطالبہ پورا کرنے میں ذرا بھی تامل کرتی تو وہ توپوں سے میرا محل اڑا دینے کے لیے تیار تھے۔ دوسرے خریطے میں بتایا کہ رئیسوں نے گڑھیاں سنبھال لیں۔ دوسرے لوگ لوٹ مار میں لگ گئے۔ میرے پاس روپیہ نہ تھا اور نہ قرض ملتا تھا۔ اپنی جائداد بیچ کر اتنا سامان مہیا کر لیا کہ شہر کو غارت گری سے محفوظ رکھا جا سکا۔

۳۔ حکومت ہند نے ارسکن کو لکھا کہ آپ نے پیش نظر حالات کی بنا پر رانی کے متعلق جو طرز عمل

اختیار کیا، وہ قابلِ الزام نہیں، لیکن میجر ایلس پولیٹیکل ایجنٹ بندھیل کھنڈ کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ رانی نے باغیوں کو امداد دی۔ عجیب بات یہ ہے کہ میجر ایلس نے رانی کو امداد دینے میں مجبور ظاہر کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

> انجام کار باغیوں نے رانی کو مجبور کر دیا کہ انھیں توپیں اور باغیوں کی مدد دی جائے۔ اس طرح وہ قلعے کے دو دروازوں سے داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

۴ - ایجنٹ گورنر جنرل کے نام رانی نے جو خریطہ بھیجا اس میں بتا دیا کہ کمشنر مدد کے لیے تیار رہیں۔ یہ لوگ خیمے اور علاقے کو تباہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو مجھے مدد دیں۔

بے شک رانی کی پوزیشن اس وقت تک یہی رہی جب تک اس نے انگریزوں سے مایوس ہو کر لڑنے کا فیصلہ نہ کر لیا۔ جب فیصلہ کر لیا تو پھر اس سے اِدھر اُدھر ہونا ممکن نہ تھا۔

عظیم اللہ خاں

غیر معمولی قابلیت قابلیت، تدبر، اصابت رائے، پختگی عزم اور صلاحیت تنظیم کے اعتبار سے عظیم اللہ خاں ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ ایسے آدمی بہت کم عرصہ وجود میں آتے ہیں۔ ساورکر نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی انقلابی جنگ کا یہ ایک نہایت اہم کردار ہے۔[1] میرا خیال ہے کہ اسے وسیع تر اور سازگار تر ماحول میں کام کرنے کا موقع ملتا تو اپنی شخصیت کے بہت سے پختہ اور پائدار نقش چھوڑ جاتا، لیکن جس فضا میں قدرت نے اسے پیدا کیا، وہ ہرگز سازگار نہ تھی۔ جن رفیقوں کے ساتھ اشتراکِ عمل اس کے لیے مقدر ہو چکا تھا، وہ عظیم اللہ خاں جیسے دُور اندیش، فہیم اور ہمت ور نہ تھے۔ پھر جس جہاد میں اُسے اپنی خداداد صلاحیتیں صرف کرنی پڑیں، وہ اتفاقات کی بنا پر کامیاب نہ ہو سکا۔ انگریزوں نے فاتحیت کے جنون میں ان تمام کرداروں کی عظمت کے نقوش محو کر ڈالے، جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں آزادی کا پرچم کھولا تھا۔ اس طرح عظیم اللہ خاں کی شخصیت بھی نسیان و بے خبری کی تاریکی میں گم ہو گئی۔

خاندان اور ولادت عظیم اللہ خاں کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا۔ ان ناموں کی وضع و ترکیب سے مترشح ہوتا ہے کہ اس کا خاندان افغان ہوگا، لیکن

[1] ساورکر ص ۲۳۰

ایسی کوئی مستند تصریح کسی ماخذ میں نہیں مل سکی ۔ یہ معلوم نہیں کہ تاریخ پیدائش کیا ہے ۔ وہ ۱۸۵۳ء میں ولایت گیا تو مختلف اصحاب نے اُسے "جوان" ظاہر کیا۔ اس بنا پر اس کی ولادت ۱۸۲۰ء اور ۱۸۲۴ء کے درمیان سمجھنی چاہیے۔ اصل وطن غالباً کان پور تھا، اس لیے کہ وہیں تعلیم پائی، وہیں ابتدا میں مدرسی اختیار کی پھر ڈھونڈو پنت عرف نانا راؤ نے اسے اپنا منشی و مصاحب بنا لیا۔

ایک بیان مظہر ہے کہ عظیم اللہ خاں کے والدین علاقہ سرحد سے ہندوستان آئے تھے۔ ۱۸۳۷-۳۸ء کے قحط میں یا اس سے پیشتر والد اور بعض دوسرے ساتھی وفات پا چکے تھے، صرف عظیم اللہ خاں اور اس کی والدہ باقی بچے۔ شیفرڈ[1] لکھتا ہے کہ بھوک سے قریب بہ مرگ ہو چکے تھے۔ پادری نے انھیں عیسائی بنانا چاہا۔ والدہ بڑی راسخ العقیدہ مسلمان تھی، وہ اپنے بچے کو بپتسمہ دلانے پر راضی نہ ہوئی، خود آیا یا خادمہ بن کر گزارا کرتی رہی اور بچے کے لیے کان پور کے سکول میں انتظام ہو گیا۔ جس کے معلم کا نام مسٹر پیٹن[2] تھا اور تین روپے ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ دس سال کی تعلیم کے بعد عظیم اللہ خاں اسی سکول میں معلم بن گیا پھر بریگیڈیر سکاٹ[3] نے اسے منشی رکھ لیا۔ سکاٹ کا تبادلہ کان پور سے ہوا تو وہ عظیم اللہ خاں کو اپنے جانشین بریگیڈیر ایش برنہم[4] کے حوالے کر گیا۔ ایش برنہم نے عظیم اللہ خاں کا رویہ اچھا نہ دیکھا۔ نیز اس پر رشوت کا الزام لگا تو اسے الگ کر دیا۔ پھر وہ نانا سے وابستہ ہو گیا۔[5]

ابتدائی حالات

عظیم اللہ خاں کے ابتدائی حالات کی نسبت جو کچھ معلوم ہوا، یہ ہے کہ اس کی حیثیت مالی اعتبار سے بہت معمولی بلکہ خاصی غریبانہ تھی۔

۱- SHEPHERD - ۲- PATON - ۳- SCOTE -
۴- ASHRUMBAM ۵-

اس باب میں مختلف بیانات ملاحظہ ہوں :

۱۔ عظیم اللہ خاں بہت غریب پیدا ہوا۔ پھر خداداد صلاحیتوں کی بناء پر اس نے درجہ بدرجہ ترقی کی۔ اس کی بے زری کا یہ عالم تھا کہ ایک انگریز گھرانے میں بہرے کے طور پر زندگی شروع کی اور باورچی بھی رہا۔ ۱؎

۲۔ عظیم اللہ خاں نے ایک اینگلو انڈین خاندان میں بطور خدمت گار یا پیادہ زندگی شروع کی۔ ۲؎

۳۔ عظیم اللہ خاں کو ایک غریب گھرانے ہی کا نہیں بلکہ ادنیٰ درجے کے خاندان کا فرد قرار دیا جاتا ہے، اور اسے ایک اینگلو انڈین کے یہاں لڑکے کی صورت میں پیش کرکے خانساماں بتایا جاتا ہے ۳؎

یہ بیانات ہر لحاظ سے درست ہوں یا نہ ہوں، لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ عظیم اللہ خاں یا تو بہت ہی غریب گھرانے میں پیدا ہوا یا کم از کم وہ زندگی کے ابتدائی دور میں اتنا غریب ضرور ہو گیا تھا کہ اسے ایک انگریزی خاندان میں وہ ملازمت کرنی پڑی جو ان پڑھ ہی کرتے تھے۔ گویا اس نے گھر پر کچھ بھی تعلیم نہ پائی تھی۔ اغلب ہے والدین اس کے بچپن ہی میں فوت ہو چکے ہوں۔

انسانی شرف

تاہم عظیم اللہ خاں کی غریبی یا خاندان کا بلحاظ پیشہ بہت معمولی ہونا خود اس کی عظمت پر کیوں اثر انداز ہو سکتا ہے؟ زندگی کا کون سا شرف ہے جو نسل، نسب یا دولت و ثروت سے پیدا ہوتا ہے؟ دنیا کے بیشتر بڑے آدمی نہایت معمولی حیثیت سے اٹھ کر اقبال و ناموری کی اوج گاہوں پر پہنچے۔ بڑائی اس میں نہیں کہ کسی اونچے خاندان سے تعلق ہو یا ابتدائی زندگی دنیوی سروسامان کی فراوانی میں گزری ہو۔ بڑائی اس میں

۱؎ ساورکر ص ۴۱۲ ، ۲؎ ٹریولین کی کتاب کان پور ص ۲۴۴ ، ۳؎ غدر کے چند علماء ص ۱۰۳ ؛

ہے کہ انسان خداداد صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائے۔ انھیں دولت اور عزّو جاہ کے لیے نہیں بلکہ خلق خدا کی بہتری اور بہبود کے لیے صرف کرے۔ خود نسب، خاندان یا دولت میں بڑائی کو محصور ماننا بھی تو انسان کی سرمایہ پرستی، دُنیا پروری اور خود فروشی کے آثار مذمومہ میں سے ایک اثر ہے۔ قرآن حکیم نے جب یہ اصل پیش کی تھی کہ" ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" تو یہی حقیقت واضح کرنا منظور تھا کہ انسانی شرف حسن عقیدہ، حسن اخلاق اور حسن عمل پر موقوف ہے، نہ کہ دولت، خاندان اور نسب پر۔ دُنیا میں انسان کا حقیقی نصب العین تقویٰ ہی رہنا چاہیے یعنی اس کا فرض ہے کہ اپنے خداداد جوہروں کو جلا دے کر راہِ حق و صداقت میں لگا دے۔

تعلیم اور ملازمت

ٹریولین نے لکھا ہے کہ عظیم اللہ خاں نے مشکلات و موانع کے باوجود انگریزی زبان اور فرانسیسی زبان میں کامل واقفیت حاصل کرلی۔ بعد ازاں وہ کانپور کے گورنمنٹ سکول میں طالب علم بن گیا، پھر وہیں معلمی کے درجے پر پہنچا۔[۱]

ساورکر کا بیان ہے کہ اس نے باورچی گری کے زمانے میں غیر ملکی زبانیں سیکھیں۔ تھوڑی دیر میں انگریزی اور فرانسیسی بے تکلف بولنے لگا۔ ان زبانوں میں مہارت حاصل کر لینے کے بعد اس نے فرنگی کی ملازمت چھوڑ دی اور کانپور کے ایک سکول میں پڑھنے لگا۔ غیر معمولی قابلیت کی بناء پر اسی سکول میں ٹیچر بن گیا۔[۲]

مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ اس نے مشن کے فری سکول میں تعلیم پائی اور وہاں ماسٹر بن گیا۔ محمد علی خاں روہیل کھنڈی عرف جمی گرین کی زبانی بتایا ہے:

> میں نے (محمد علی خاں نے) اور عظیم اللہ خاں نے گورنمنٹ اسکول، کانپور میں تقریباً دس سال انگریزی تعلیم پائی تھی اور بعد کامیابی عظیم اللہ خاں ملازم اسی اسکول میں ہوئے۔[۳]

---

۱ کانپور صفحہ ۴۴ ۔ ۲ ساورکر صفحہ ۳۴ ۔ ۳ غدر کے چند علماء صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴

غور طلب امور

گویا سب کا اتفاق ہے کہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں عظیم اللہ خاں نے اس انگریزی گھرانے میں سیکھیں، جہاں وہ ادنیٰ حیثیت میں ملازم ہوا تھا۔ پھر سکول میں داخل ہوا اور معلم بنا۔ انگریزی کا سیکھنا سمجھ میں آ سکتا ہے، لیکن فرانسیسی کس ذریعے سے سیکھی اور کیوں کر اس میں کمال پیدا کیا؟ کیا اس انگریز گھرانے میں فرانسیسی بھی بولی جاتی تھی یا کیا گورنمنٹ ہائی سکول کانپور میں فرانسیسی پڑھائی جاتی تھی؟

پھر اس حقیقت پر بھی غور کرنا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کو فرانسیسی سے کیوں دلچسپی پیدا ہوئی جبکہ اس زبان میں مہارت پیدا کر لینے سے اُسے اچھی ملازمت حاصل کرنے میں کوئی مدد نہ مل سکتی تھی؟

ہمارے سامنے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں۔ تاہم یہ واقعہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں کا حافظہ بڑا ہی غیر معمولی ہوگا اور اُسے قدرت نے اخذ و فہم کی خاص صلاحیت عطا کی ہوگی کہ خانساماں یا باورچی کی حیثیت میں مالکوں سے جو کچھ سُنتا رہا، وہ ٹھیک ٹھیک اس کے ذہن نشین ہوتا رہا۔

انگلستان اور فرانس کے سفر میں عظیم اللہ خاں کی ایک غیر معمولی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے کہ اسے دیکھ کر عورتیں بے حد متاثر ہوتی تھیں۔ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ جس انگریز گھرانے میں اس نے ملازمت اختیار کی تھی، وہاں بھی کوئی ایسا ہی ذریعہ انگریزی اور فرانسیسی سیکھنے کا باعث بن گیا؟ ان سوالوں کا جواب قیاسات ہی کی بنا پر دیا جا سکتا ہے، لیکن تاریخ واقعات کا مجموعہ اور حقائق کا ذخیرہ ہے، اس میں قیاسات یا افسانہ بافیوں کے لیے قطعاً گنجائش نہیں۔

نانا سے تعلق

انتظام اللہ خاں شہابی فرماتے ہیں کہ عظیم اللہ خاں ذہین اور تیز طبع تھا۔ انگریزی زبان میں مہارت کے متعلق اسے اتنی شہرت حاصل ہو گئی تھی کہ گورنر کانپور آتے تو ان کے لیے سپاسنامہ عظیم اللہ خاں ہی سے تیار کرایا جاتا اس وجہ سے مقامی حکام میں بھی اس کا اثر رسوخ بہت بڑھ گیا تھا اور جب نانا راؤ کو ایک

اچھے کارکن کی ضرورت پڑی تو کان پور کے انگریز کلکٹر نے عظیم اللہ خاں ہی کی سفارش کی۔ نانا راؤ پہلی ہی ملاقات میں اتنا متاثر ہوا کہ کچھ دن بعد اسے اپنا سربراہ کار بنا لیا اور اس سے مشورے لیے بغیر قطعاً کوئی کام نہ کرتا تھا۔[1]

ٹریولین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم اللہ خاں نانا راؤ کے ذاتی و نجی کاروبار کا سربراہ تھا۔[2] ایک اور بیان میں بتایا گیا کہ جب نانا راؤ کو اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے ایک آدمی ولایت بھیجنے کی ضرورت پیش آئی تو پہلے ایک مرہٹہ صوبیدار کے فرزند کو بھیجنے کی تجویز تھی لیکن بالآخر :

> یہ کام ایک زیرک اور ہوشیار مسلمان کو سونپا گیا۔ جس کا چہرہ مہرہ، وضع قطع اور طور طریقے بہت خوشگوار تھے۔ طریق گفتگو معقول و دل آویز تھا اور اسے انگریزی زبان کا اچھا علم تھا۔[3]

ساورکر نے لکھا ہے کہ انگریزی زبان میں قابل و لائق عظیم اللہ خاں کی قابلیت کا شہرہ نانا کے کان تک پہنچا تو اسے دربار میں بلایا گیا۔ وہاں اس کے دانشمندانہ مشوروں کو نانا بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس سے پوچھے بغیر کوئی بڑا قدم نہ اٹھاتا تھا۔[4]

یہ بھی ممکن ہے کہ مقدمہ ولایت لے جانے سے پیشتر نانا راؤ نے اپنی پنشن کے لیے جو یادداشت حکومت کے پاس بھیجی تھی، وہ عظیم اللہ خاں نے تیار کی ہو یا کم از کم اس کا مشورہ شامل رہا ہو۔[5]

سفر ولایت

غرض نانا راؤ نے جو وفد ولایت بھیجا اس کا رئیس و ترجمان عظیم اللہ خاں ہی کو بنایا۔ اس کی تاریخ ارسال میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ کیی کا

---

[1] غدر کے چند علماء ص ۱۳۱؛ [2] کان پور ص ۲۴۲؛ [3] کیی جلد اول ص ۶۱؛ [4] ساورکر ص ۲۸۔ [5] اس یادداشت کا خلاصہ نانا راؤ کے حالات میں پیش کیا جائے گا۔

بیان ہے کہ یہ وفد ۱۸۵۳ء کے موسم گرما میں انگلستان پہنچا۔[1] ساورکر نے تاریخ ارسال ۱۸۵۴ء قرار دی ہے۔[2] ٹریولین بھی یہی کہتا ہے کہ عظیم اللہ خاں اس وقت لندن پہنچا جب ۱۸۵۴ء کے موسم کا عہد شباب تھا۔[3]

انتظام اللہ خاں شہابی ۱۸۵۳ء ہی کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں کہ خرچ کے لیے وفد کو پانچ لاکھ روپے دیے گئے تھے اور عظیم اللہ خاں کے علاوہ محمد علی خاں، وکیل کھنڈی عرف جیمی گرین تیز نانا صاحب کے بھائی بالا صاحب بھی ساتھ تھے۔[4] ایک انگریز بھی اس کام میں شریک تھا جس کا نام "بڈل" بتایا گیا ہے۔[5] معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون تھا؟ آیا اُسے ہندوستان سے ساتھ لے لیا گیا تھا یا ولایت پہنچ کر مقرر کیا گیا تھا؟

میرا خیال ہے کہ وفد کے ساتھ خادموں اور متوسلوں کی بھی خاصی تعداد ہوگی۔

اصل مقصد لندن جانے کا جو مقصد تھا، اس میں نظر بہ ظاہر کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔ کیی نے بالکل صحیح لکھا ہے:

فیصلہ اس سے پیشتر معرض تحریر میں آچکا تھا۔ کارندوں کے کچھ کہنے یا کرنے سے اس میں رد و بدل نہ ہو سکتا تھا۔[7]

ساورکر صاحب فرماتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا رویہ بڑا سخت تھا۔ شروع میں عظیم اللہ خاں کو نامعقول الفاظ سے ٹالا گیا۔ انجام کار یہ کوٹھا کھرا جواب دے دیا کہ ہم گورنر جنرل کے فیصلے سے کامل اتفاق کرتے ہیں۔ باجی راؤ متبنّیٰ کو باپ کی پنشن پر کوئی حق حاصل نہیں۔[8]

منشی انتظام اللہ خاں شہابی کہتے ہیں کہ اس وفد نے لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی۔ دعوتوں کا سلسلہ بھی قائم رکھی۔ مگر ڈائرکٹروں نے صاف جواب دے دیا۔ وکلا

۱۔ کیی جلد اول ص ۱۰۹، ۲۔ ساورکر ص ۴۲، ۳۔ کان پور ص ۱۳۲۔ ۴۔ غدر کے چند علماء ص ۵۱
۵۔ کیی جلد اول ص ۱۰۹، ۶۔ BIDDEL ۷۔ کیی جلد اول، ۸۔ ساورکر ص ۴۹

کو معقول معاوضہ دیا گیا۔ مٹھی بھی گرم کی گئی ۔[1]

اس کے برعکس ٹریولین کا بیان ہے کہ عظیم اللہ خاں نے اپنی ناکامی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ان رشوتوں کا نتیجہ قرار دیا جو وہ بورڈ آف کنٹرول اور پبلک کو تسلی کو دے چکی تھی۔

ہمارے نزدیک روپے کے معاملے میں کسی انگریز ادارے سے حق و انصاف کی اُمید ہی غلط تھی۔ ہندوستان پر انگریزی قبضے کا پہلا اور سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کیا جائے بے شک انھیں بعض اوقات مختلف لوگوں کو روپیہ اس خیال سے دینا پڑا کہ انگریزوں کے مفاد بہتر طریق پر پورے ہوتے رہیں۔ مثلاً باجی راؤ کو آٹھ لاکھ روپے سالانہ کی پنشن دے دی تاکہ لڑائی ختم ہو جائے اور پیشوا ملک انگریزوں کے حوالے کر کے آرام سے بیٹھ جائے۔ وہ آٹھ لاکھ روپے کے اس تاوان کو ہمیشہ کے لیے کیونکر قائم رکھ سکتے تھے؟ اُن کے خیال کے مطابق باجی راؤ بھی خلاف اُمید دیر تک زندہ رہا یعنی ۱۸۱۸ء سے ۱۸۵۱ء تک پورے چونتیس سال آٹھ لاکھ روپے لیتا رہا۔ اب اس کے متبنیٰ کو کیوں کر یہ رقم منتقل کی جاتی؟ وقت گزر چکا تھا مطلب پورا ہو چکا تھا۔ پھر متعلقہ مصیبت کو جاری رکھنا انگریزی نقطۂ نگاہ سے یقیناً سراسر حماقت تھا۔

لندن کی زندگی

اس پہلو کو چھوڑ کر عظیم اللہ خاں نے انگلستان میں جتنا وقت لیا وہ بڑا پر لطف تھا۔ اس کے متعلق مختلف بیانات ملاحظہ فرمایئے۔

> ا: اس کا چہرہ مہرہ امیرانہ تھا، آواز شیریں اور رو پہلی معاصانہ انگریزی زندگی کے طور طریقوں اور مراسم سے وہ بخوبی آگاہ تھا لہٰذا اس نے لندن میں بہت ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ اس کی خوشگوار اور رو پہلی آواز اس کی امیرانہ روش اور مشرقی شان و شکوہ کی وجہ سے متعدد انگریز

---

[1] غدر کے چند علماء (حاشیہ)

عورتیں اس کی والہ و شیفتہ بن گئیں۔ ان دنوں لندن کے باغات اور برائٹن کے ساحل پر اس جواہرات والے ہندوستانی مہاراجا کو دیکھنے کے لیے بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ بعض معزز گھرانوں کی انگریز عورتیں شیفتگی کے اس درجے پر جا پہنچیں کہ عظیم اللہ خاں کے ہندوستان چلے آنے کے بعد بھی اُسے محبت بھرے خط لکھتی رہیں۔[۱]

۲۔ عظیم اللہ خاں۔ لندن پہنچا تو معاشرے کے اس حصے نے کھلے دل سے اس کا استقبال کیا، جو اپنے لطفِ نظر کے اُمیدواروں کی سابقہ حیثیت کے متعلق قطعاً چھان بین نہیں کرتا، بہ شرطیکہ وہ ہم وطن یا عیسائی نہ ہو۔ اس طبقے کے عقیدے کے مطابق ہر ہندی لازماً راجا ہوتا تھا، جس طرح کہ ہر مارونی کو شہید اور ہر پولستانی کو محب وطن سمجھا جاتا تھا۔ عظیم اللہ خاں بہت جلد فاتحیت کے اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیریں خوشامد کا بہت بڑا حصہ اس نے حاصل کر لیا۔ عورتوں نے بالاتفاق اس کے حسن کو دل آویز قرار دیا۔ وہ واقعی بہت خوش رو اور بذلہ سنج تھا۔ اُسے دبدبہ و دلیری میں سے بھی خاصا حصہ عطا ہوا تھا۔ اُس کے پاس جواہرات اور کشمیری شالوں کی بھی کمی نہ تھی۔ سابقہ خدمت گار باہر نکلتا تو اتنا ہی عالی پایہ آدمی معلوم ہوتا جیسے نیپال کا وزیر اعظم یا پنجاب کا مہاراجہ۔[۲]

۳۔ عظیم اللہ خاں نے جب دیکھا کہ جس کام کے لیے اُسے بھیجا گیا تھا، اس میں کچھ ہو نہیں سکتا تو وہ بہ طور خود رنگ رلیاں منانے لگا۔ وہ اپنی

---

[۱] ساورکر صفحہ ۲۸، ۲۹ [۲] کان پور صفحہ ۴۴۔

خوش لباسی کے باعث بلند پایہ آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس سے اُسے اعلیٰ سوسائٹی میں بار مل گیا۔ کہا جاتا ہے وہ انگریز خواتین کے بذل التفات سے فائدہ اُٹھانے کا عادی تھا۔ بظاہر وہ ایک زندہ دل، خوش مزاج خوش خو اور عیش پسند آدمی تھا اور سرسری نظر یہی سمجھتی تھی کہ اُسے ہر لحظہ وقتی کامرانیوں کا خیال رہتا ہے۔ [1]

انتظام اللہ خاں صاحب نے فرمایا ہے کہ اسی طرح فرانس کی عورتیں عظیم اللہ خاں کی گرویدہ بن گئی تھیں، مگر وہ راہِ حق پر قائم رہا اور اپنے دامن پر بُرائی کا کوئی دھبہ نہ لگنے دیا۔ [2]

عورتوں کے متعلق نقطہ نگاہ

جب عظیم اللہ خاں انگلستان سے واپس ہوا تو قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) میں بھی مشہور کریمیا کی جنگ جاری تھی۔ رسل نام ایک انگریز "لندن ٹائمز" کی طرف سے جنگی نامہ نگاری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے بعد ازاں ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں بھی نامہ نگاری کی تھی۔ وہ اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے کہ میں چند روز کے لیے میدانِ جنگ سے قسطنطنیہ آگیا تھا۔ وہاں مصری ہوٹل میں مجھے ایک خوشرو، دُبلا پتلا آدمی ملا جس کا رنگ گہرا زیتونی تھا۔ وہ مشرقی لباس پہنتا تھا۔ انگریزی اور فرانسیسی بولتا تھا۔ یہ عظیم اللہ خاں تھا۔ ملاقات کے باقی پہلوؤں پر تو آگے چل کر گفتگو ہوگی، یہاں صرف یہ بتانا ضروری ہے کہ رسل کے بیان کے مطابق عظیم اللہ خاں نے [illegible] سوسائٹی میں اپنی کامرانیوں کا ذکر بڑے طمطراق سے کیا اور اونچے درجے کے لوگوں کے نام وہ بے تکلف استعمال کرتا تھا۔ آخر میں بڑے جزم و یقین سے رائے ظاہر کی کہ اگر اہلِ انگلستان نے :

عورتوں پر اسی قسم کی پابندیاں عائد نہ کیں جیسی کہ مشرق میں عائد ہیں تو وہ اس طرح اڑتی ہوئی چلی جائیں گی، جس طرح پروانے شمع کی روشنی میں جل مرتے ہیں۔ [3]

---

[1] کیئی جلد اول صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰، [2] ۱۸۵۷ء غدر کے چند علماء صفحہ ۱۰۱ [3] رسل کی ڈائری بحوالہ کیئی جلد اول صفحہ ۶۴۹، ۶۴۸۔

اس سے ظاہر ہے کہ عظیم اللہ خاں کا اصل مقصد انگلستان یا یورپ کے تمدن کی ایک بدیہی خرابی واضح کر دینے کے سوا کچھ نہ تھا اور انسان جب کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرتا ہے، تو قباحتیں بیان کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ تفصیلات پیش کر دیتا ہے تاکہ سننے والا نقطۂ نگاہ کو بخوبی سمجھ جائے۔ اس بیان میں بھی عظیم اللہ خاں کی نکتہ بینی اور سعی اصلاح ہی نمایاں ہے۔

رنگو باپوجی

لارڈ ڈلہوزی نے نانا راؤ کو باپ کی پنشن دینے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح ستارہ کا راج بھی چھین لیا تھا اور راجا کے متبنیٰ کو جانشین تسلیم نہ کیا تھا۔ چنانچہ رانیوں نے رنگو باپوجی نام ایک مرہٹہ سردار کو اس غرض سے ولایت بھیجا تھا کہ گورنر جنرل کے فیصلے کے خلاف چارہ جوئی کرے۔ وہ سرگرم آدمی تھا اور بڑی محنت اور توجہ سے کام میں لگا رہا۔ اعتراف کیا گیا ہے کہ پیش نظر مقصد کے لیے کسی میں ایسی سرگرمی دیکھی نہ گئی جیسی رنگو باپوجی نے دکھائی، لیکن وہ بھی ناکام رہا اور دسمبر ۱۸۵۳ء میں واپس آیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے سفر خرچ کے لیے اڑھائی ہزار پونڈ دیے نیز جہاز کا ٹکٹ لے دیا۔[1]

رنگو باپوجی اور عظیم اللہ خاں کی عمر اور مذہب میں نمایاں فرق تھا۔ دونوں کی طبیعتیں بھی یکساں نہ تھیں، تاہم دونوں کے مقاصد ایک نوعیت کے تھے۔ دونوں کو یکساں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور دونوں کے دل میں یکساں قسم کے جذبات موجزن تھے۔ وہ ملتے بھی رہے یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں کہ کیا بات چیت ہوتی رہی۔ ساورکر نے ان کی ملاقاتوں اور مشوروں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ان میں سے ایک ستارا کے چھترپتی کا نمائندہ تھا اور دوسرا چھترپتی کے وزیر اعظم کا۔ ہمیں چاہیے کہ ان دونوں کو:

ہندو سلطنت کے بچاؤ کا مسئلہ سکون و اخفا سے حل کرنے کے چھوڑ دیں[2]

---

[1] کیئی جلد اول ص ۱۱۔ [2] ساور ص ۲۹۔ واضح رہے کہ چھترپتی شیواجی کا لقب تھا اور ستارا کا راجا اسی کی اولاد میں سے تھا۔ پیشوا ابتداء میں شیواجی کے خاندان کا وزیر اعظم تھا۔ ساہو کے زمانے میں وہ سلطنت کا مختار بن گیا۔

کریمیا کا محاذِ جنگ انگلستان سے مراجعت پر عظیم اللہ خاں اور اس کے ساتھی فرانس پہنچے ہوئے غالباً مارسائی[1] سے جہاز پر سوار ہوئے۔ یہ ۱۸۵۵ء کے موسم گرما کا واقعہ معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ رسل سے عظیم اللہ خاں کی ملاقات قسطنطنیہ میں ۱۸۔ جون ۱۸۵۵ء کے بعد ہوئی تھی اور تعارف ایک انگریز فوجی افسر نے کرایا تھا جس کا نام ڈائن[2] بتایا گیا ہے۔ رسل کہتا ہے، خود عظیم اللہ خاں نے مجھے بتایا کہ میں نے ۱۸۔ جون کی شکست کی خبر مالٹا میں سنی تھی۔ اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ قسطنطنیہ پہنچ کر محاذِ جنگ پر جاؤں گا اور اس تاریخی شہر کی زیارت کروں گا جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ ان بڑے رستموں کو دیکھوں گا جنھوں نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی مشترکہ قوت کو شکست دی۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عظیم اللہ خاں کو سیاسی حالات سے کتنی گہری دلچسپی تھی۔ اس نے محض خبر سن لینے پر قناعت نہ کی، خود موقع پر پہنچ کر یہ معلوم کرنا چاہا کہ آیا واقعی روسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کی قوت بے حقیقت ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف ایک زبردست تحریک نہ چلائی جائے تاکہ ملک کو ان کے چنگل سے آزاد ہو جائے؟

میدانِ جنگ رسل کہتا ہے کہ میں قسطنطنیہ کی اس ملاقات کے متعلق سب کچھ بھول چکا تھا کہ چند ہفتے بعد میدانِ جنگ میں میری جائے قیام پر ایک صاحب پہنچے اور مسٹر ڈائن کی ایک تحریر پیش کی، جس میں لکھا تھا کہ میرے دوست عظیم اللہ خاں خندقیں دیکھنا چاہتے ہیں، مہربانی فرما کر ان کی مدد کیجیے۔ میں باہر نکلا تو خود عظیم اللہ خاں موجود تھا۔ میں نے اس کا گھوڑا بندھوایا اور خود سپہ سالار کی طرف روانہ ہوا تاکہ "پاس" لے آؤں۔ غروب آفتاب میں کوئی ایک گھنٹہ باقی ہوگا۔ پاس حاصل کرنے میں تھوڑی سی دیر لگی

---

[1] فرانس کی بندرگاہ جسے عام لوگ مارسیلز کہتے۔

[2] DOYEN

اس اثنا میں روسی توپوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ وہ عموماً اسی وقت گولے برساتی تھیں تاکہ امدادی جماعتوں کے کام میں خلل واقع ہو گولے سیدھے اس پہاڑی پر آنے لگے جہاں عظیم اللہ خاں ٹھہرا ہوا تھا اور ایک تو اس کی جائے قیام کے بالکل قریب آ کر پھٹا میں "پاس" لے کر آیا تو دیکھا کہ عظیم اللہ خاں قبرستان کے احاطے میں پہنچ گیا تھا اور بڑے شوق و محویت سے روسی توپوں کی گولہ باری کا معائنہ کر رہا تھا۔

میں نے "پاس" حوالے کیا ساتھ ہی معذرت کر دی کہ خود ہمراہ نہ جا سکوں گا، اس لیے کہ مجھے ایک جگہ کھانے پر جانا ہے۔ عظیم اللہ خاں نے کہا: یعنی یہ جنگ کے نظارے کے لیے بڑی اچھی ہے۔ مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے چونکہ دیر ہو گئی ہے، اس لیے آپ سے عرض کروں گا کہ پھر کسی روز ملاقات کے لیے تشریف لایئے۔ میں یہاں اس وقت تک بیٹھا رہوں گا، جب تک قیام گاہ پر واپسی کا وقت نہ آ جائے۔

رسل نے کھانے کی دعوت دی۔ عظیم اللہ خاں نے معذرت کر دی۔ رات رسل کے خیمے میں اسی کے سفری پلنگ پر بسر کی بہت سویرے اٹھ کر وہ چلا گیا اور میز پر یہ تحریر چھوڑ گیا،

"عظیم اللہ خاں جناب رسل کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہے اور اجازت چاہتا ہے کہ صاحب کے کریمانہ التفات کا بصمیم قلب شکریہ ادا کرے، جس کے لیے وہ واقعی بے حد ممنون ہے۔"[1]

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اس زحمت کا حقیقی مقصد یہی تھا کہ میدان جنگ میں انگریزوں کی صلاحیت کا صحیح اندازہ ہو جائے اور عظیم اللہ خاں کے ذہن میں جو منصوبے ترکیب پا رہے تھے، ان کی کامیابی کے لیے یہ اندازہ بہت ضروری تھا۔

---

[1] ڈائری بحوالہ کیی جلد اوّل۔

بیرونی تعلقات

ولایت کے سفر کی داستان ختم کرنے سے پیشتر یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ عظیم اللہ خاں نے اس دوران میں اور کہاں کہاں تعلقات پیدا کیے۔ لارڈ رابرٹس نے لکھا ہے کہ وہ تین سال یورپ میں رہا۔ بیشتر وقت لندن میں گزارا۔ پیرس، قسطنطنیہ اور کریمیا بھی گیا۔

بٹھور میں نانا کا جو محل تھا، اس میں ایک کمرہ یا کہنا چاہیے کہ ایک حصہ عظیم اللہ خاں کے لیے وقف تھا۔ وہاں رابرٹس کو بہت سے خطوط ملے۔ جن میں سے بعض کھولے بھی نہ گئے تھے۔ بیشتر خطوط انگلستان سے تھے، جن میں سے ذی منزلت عورتوں کے خطوط کی بھی تعداد خاصی تھی۔ دو خط ایک فرانسیسی کے تھے، جن میں بتایا گیا تھا کہ ہندوستان میں کچھ کام ہے، اس کا انتظام کر دیجیے۔ خود عظیم اللہ خاں نے بہت سے خط لکھے تھے، جو بھیجے نہ گئے تھے۔ ان میں سے دو خط قسطنطنیہ کے ایک صاحب عمر پاشا کے نام تھے۔ ان میں بتایا گیا تھا کہ سپاہ میں بے چینی پھیل رہی ہے اور ہندوستان میں عام صورت حالات نازک ہے۔[1]

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ عظیم اللہ خاں نے حتی الامکان وسیع سیاسی تعلقات کے لیے اچھا انتظام کر لیا تھا۔ یہ امر کہ ان تعلقات سے کچھ فائدہ پہنچنے کی بھی اُمید ہو سکتی تھی یا نہیں تو یہ بالکل جُداگانہ امر ہے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ جنگ آزادی کے اصل کارکن پیش نظر مقاصد کے لیے کس درجہ سرگرم تھے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ان کے دلوں میں کیسی شدید تڑپ موجود تھی۔

رابرٹس ہی نے بتایا کہ عظیم اللہ خاں نے انگلستان میں ایک دوشیزہ سے منگنی کر لی تھی۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئی کہ عظیم اللہ خاں کے بعد ہندوستان پہنچے گی اور ہندوستان

---

[1] ہندوستان میں اکتالیس سال (انگریزی) صفحہ ۲۲۸، ۲۲۹۔

ہی میں شادی کی رسم ادا ہوگی۔ اس دوشیزہ کے بھی بہت سے خطوط مجموعے میں شامل تھے۔[1]

ساورکر کا بیان ہے کہ کان پور میں جو اعلان امارت کیا گیا تھا، اس سے ظاہر ہوتا تھا، عظیم اللہ خاں نے مصر کے ذریعے سے بھی سیاسی روابط کے لیے سعی کی تھی[2]۔ کیبی کا خیال ہے کہ بعض روسی افسروں سے تعلقات پیدا کرنے کا معاملہ بھی غیر اغلب نہیں سمجھا جا سکتا۔[3]

کلکتہ کا ایک واقعہ لیڈی لوگن کی یادداشتوں میں ایک عجیب واقعہ مرقوم ہے۔ عظیم اللہ خاں جب ولایت کے سفر سے مراجعت پر کلکتہ پہنچا تو پنجاب کا معزول مہاراجہ دلیپ سنگھ ولایت جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا اور بارک پور میں مقیم تھا۔ ڈاکٹر لوگن مہاراجا کا نگران و اتالیق تھا۔

لیڈی لوگن لکھتی ہے کہ عظیم اللہ خاں بے حیثیت ہی نہیں بلکہ چھوٹی ذات کا آدمی تھا اور اُسے نانا راؤ نے دو وجہ سے اپنا سفیر بنایا تھا، اوّل اس لیے کہ وہ نانا راؤ کا خاص اور معتمد علیہ مصاحب تھا، دوم اس لیے کہ فرنگی لوگ "کی ہتک کی جائے اور بتایا جائے کہ ان لوگوں میں دیسیوں کے درمیان تمیز کی کوئی صلاحیت نہیں۔ لندن میں اُسے والیِ ریاست سمجھ کر استقبال کیا گیا، حالانکہ استقبال کرنے والے کو صحیح حالات کے متعلق بہتر معلومات ہونی چاہئیں تھیں۔ یقیناً اس پر عظیم اللہ خاں اور نانا راؤ نے فرنگیوں کا خوب مذاق اڑایا ہوگا۔

یہ شخص مہاراجا سے ملاقات کے لیے آیا۔ سر پر پگڑی تھی اور پاؤں میں انگریزی بوٹ، بالائی زینے پر میرے شوہر (ڈاکٹر لوگن) سے ملاقات ہوئی، اس نے

---

[1] ہندوستان میں اکتالیس سال (انگریزی) ص ۲۴۳ ان میں سے بعض خطوط کے ترجمے اردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے انھیں پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ وہی خطوط ہیں۔ جن کا ذکر گذشتہ ایک سو سال سے بڑے اہتمام کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ [2] ساورکر ص ۱۱۶ ، [3] کیبی جلد اوّل ص ۴۲۳ ۔

بوٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عظیم اللہ سے کہا: "معاف کیجئے آپ بھول گئے ہیں۔" عظیم اللہ بہت جز بز ہوا۔ پھر اس نے یہ کہتے ہوئے بوٹ اتارنے سے صاف صاف انکار کردیا کہ "میں نے انگلستان میں بڑے بڑے امیروں کے سامنے بوٹ نہیں اتارے اور میں ایسی دقیانوسی اور بیہودہ رسموں کا پابند نہیں۔"

لوگن جانتا تھا کہ یہ طریقہ ولیپ سنگھ کو اس کے ملازموں کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا، اس لیے کہ وہ اب مسیحیت اختیار کرچکا تھا، لہذا اس نے دو لوگن نے کہا۔ انگلستان میں تمہارا کیا رویہ رہا، اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں، لیکن میں بتا دیتا ہوں کہ ہز ہائینس کے حضور میں جانے سے پیشتر یا تو اپنی پگڑی اتار دو جو دیسی آدمی کے لیے سب سے بڑی ہتک تھی، یا جوتا، ورنہ میں اللہ یہ چوبدار تمہیں ٹھوکریں مار مار کر سیڑھیوں سے نیچے گرا دیں گے اور تم اسی سلوک کے مستحق ہو۔[1]

افسوسناک طرزِ عمل ڈاکٹر لوگن بڑا اچھا اور شریف آدمی تھا لیکن دیکھیے عظیم اللہ خاں کی عزت و برتری نے اسے کس درجہ پریشان کردیا کہ عام آداب کا بھی خیال نہ رہا۔

۱۔ بلاشبہ دیسی رؤسا کے پاس جاتے وقت جوتے اتار دیے جاتے تھے، لیکن دیسی جوتے، نہ کہ بوٹ۔

۲۔ اگر اس قاعدے کی پابندی کرانی ضروری بھی تھی تو معاملے کو نرمی سے سمجھایا جا سکتا تھا، اس قدر جوش میں آنے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ نہ کیا تو سیڑھیوں سے نیچے گرا دیے جاؤ گے؟

---

[1] لیڈی لوگن کی یادداشتیں (انگریزی) صفحہ ۱۰۵، ۱۰۹

۳ - نانا نے عظیم اللہ خاں کو اس لیے سفیر یا وکیل بنا کر بھیجا تھا کہ اُس میں پیشِ نظر کام کو پورا کرنے کی صلاحیت تھی۔ اُس میں "فرنگی لوگ" کی بے عزتی کا کوئی سوال نہ تھا، جس کی طرف لیڈی لوگن نے اشارہ کیا ہے۔

۴ - لیڈی لوگن اور دُنیا کے ہر انسان کے لیے عظیم اللہ خاں کی خداداد صلاحیتیں قابلِ توجہ نہیں، اس کے خاندان کی غریبی کا ذکر بیچ میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا امیروں کا خون غریبوں کے مقابلے میں زیادہ سُرخ و رنگین ہوتا ہے یا اس میں کوئی خاص صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے؟

۵ - ان باتوں سے ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ذمہ دار انگریزوں کا رویہ کس درجہ افسوسناک اور نازیبا تھا اور وہ کس طرح ہر ایک ہندوستانی کی بے عزتی کے درپے رہتے تھے۔

تنظیمی کوششیں

ہندوستان آ جانے کے بعد عظیم اللہ خاں اور نانا راؤ کی کوششیں تنظیم کے لیے وقف ہو گئیں۔ ان کی تفصیلات نانا راؤ کے حالات میں بیان ہونی چاہئیں، اس لیے کہ عظیم اللہ خاں نانا کا رفیق تھا۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ خط و کتابت اور ارسالِ سفرا کے علاوہ ایک دورہ بھی کیا گیا جس میں نانا اور عظیم اللہ خاں شہر بہ شہر انبالہ تک آئے۔ البتہ ان کی ملاقاتوں اور گفتگوؤں کا حال کہیں سے معلوم نہ ہو سکا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس دورے کو نانا راؤ نے بعض مقدس مقامات کی زیارتوں کا نام دیا تھا۔

اسی طرح اپریل ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ کا دورہ کیا تھا جس کی کچھ تفصیلات مارٹن گبنس[1] نے بیان کی ہیں یعنی یہ کہ نانا اور عظیم اللہ خاں نے سر ہنری لارنس سے بھی ملاقات کی۔ وہ بازار میں نکلتے تو خاصے آدمی ساتھ ہوتے۔ گبنس کے دل میں شبہات پیدا ہوئے۔ ہنری لارنس نے ان کی تصدیق کی اور اس باب میں گورنر جنرل کو ایک مفصل خط لکھا۔ ساتھ ہی کان پور کی فوج کے سالار

---

[1] - MARTIN GUBBINS

مر ہیو وھیلر کو بھی اطلاع دے دی۔[1]

کان پور میں تشویشناک حالت

میرٹھ میں ۱۰ مئی کو آزادی کا پرچم بلند کیا جا چکا تھا۔ ساتھ ہی جگہ جگہ ہنگامے کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ ان میں سے ایک اہم مقام کان پور تھا، جو نانا راؤ اور عظیم اللہ خاں کا مرکز تھا۔

کان پور کی انگریزی فوج کے سالار جنرل ہیو وھیلر[2] نے چھاؤنی میں ایک مرکز تجویز کر کے اُسے مستحکم کر لینے کا بندوبست شروع کر دیا تھا۔ ایک روز عظیم اللہ خاں اُدھر سے گزرا تو اپنے ایک دوست لفٹنٹ سے پوچھا: جس جگہ استحکامات بنائے جا رہے ہیں، اس کا نام کیا رکھا ہے؟

لفٹنٹ: مجھے قطعاً معلوم نہیں۔

عظیم اللہ خاں: میرے نزدیک اسے "حصارِ یاس" کہنا مناسب ہوگا۔

لفٹنٹ: ہرگز نہیں، ہم اسے "حصارِ فتح" کہیں گے۔

یہ واقعہ قریباً سب نے بیان کیا ہے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہے کہ پہلے سے جنگ آزادی کی جو سکیم تیار ہو چکی تھی، عظیم اللہ خاں اس سے پوری طرح آگاہ تھا اور جانتا تھا کہ چند روز بعد انگریزوں کے دفاعی استحکام کا انجام کیا ہونے والا ہے۔

ہنگامے کا آغاز

غرض تشویش میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا تھا تا آنکہ ۴ جون کو ہنگامہ شروع ہو گیا۔ انگریز ان استحکامات میں بیٹھ گئے، جن کا بندوبست پہلے سے ہو رہا تھا۔ یہی مقام تھا جسے عظیم اللہ خاں نے "حصارِ یاس" قرار دیا تھا اور یقیناً وہ حصارِ یاس ثابت ہوا، اگرچہ انگریزی سلطنت ختم نہ ہوئی۔

اصل واقعے کی تفصیلات پیش نظر موضوع سے خارج ہیں۔ صرف اتنا جان لینا چاہیے

---

[1] کیئی جلد اوّل صفحہ ۲۴۴، ۲۴۵۔ [2] HUGH WHEELER

کہ جس فوج نے آزادی کا علم بلند کیا تھا، وہ جلد سے جلد دہلی پہنچنا چاہتی تھی اور نانا راؤ کو بھی ساتھ لے جا رہی تھی لیکن عظیم اللہ خاں نے مشورہ دیا کہ وہاں جانے کی بجائے کان پور میں ٹھہرنا ضروری ہے۔

عظیم اللہ خاں کا مشورہ

عظیم اللہ خاں کے اس مشورے کے باب میں بیانات مختلف ہیں۔ فارسٹ کے علم کے مطابق عظیم اللہ خاں نے کہا کہ مغلیہ دربار میں نانا کی حیثیت گھٹ جائے گی اور اثر بھی زائل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہوگا کہ کان پور پر قبضہ جما کر دائرہ اثر مشرق کی جانب سمندر تک پھیلایا جائے:

> ہندوستان میں فرنگی دیسی فوج کے ایک چوتھائی حصے سے بھی کم ہیں اور اب کہ سپاہیوں نے فرمانبرداری کا جوا اتار پھینکا ہے، انگریزوں کی حیثیت بالکل زائل ہو چکی ہے۔[1]

ٹریولین نے بھی مشورے کا یہی خلاصہ پیش کیا ہے، لیکن اس کی توضیح عظیم اللہ خاں نے یوں کی کہ ہمیں پہلے کان پور کے گرد و پیش کا علاقہ فتح کر لینا چاہیے اور وہ تمام راستے روک لینے چاہئیں جن سے کام لے کر مجاہدین آزادی کے مقبوضہ علاقوں میں کمک پہنچائی جا سکتی ہے۔ اس طرح پنجاب و دہلی کے دروازے ہمارے ہاتھ آ جائیں گے۔ پھر ہم مجاہدین کے ساتھ امیر الامرائی کے منصب اور شمال ہند کی حکمرانی کے لیے بات چیت کر سکیں گے۔ اس وقت لاکھوں بندوقیں اور تلواریں ہماری پشتیبان ہوں گی اور ہم وادی گنگا کو مسخر کرتے ہوئے ملعون فرنگی سے انتقام لے سکیں گے۔ پلاسی کی صد سالہ سالگرہ کے دن لڑائی کی جائے گی، جو پہلی لڑائی سے بالکل مختلف ہوگی۔[2]

---

[1] فارسٹ جلد اول ص ۲۲۱۔
[2] کان پور ص ۸۴۔

مشورے کی اہمیت

یہ کہنا مشکل ہے کہ الفاظ عظیم اللہ خاں کے ہیں یا صرف مفہوم اس کا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت تک جمہوریت کا کوئی صحیح تصور پیدا نہ ہوا تھا اور ہر شخص حکومت کو بادشاہ یا حکمران ہی کی شکل میں دیکھتا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی مرکزیت کچھ اس کے عزائم آزادی یا صلاحیت ملک داری کی بنا پر پیدا نہ ہوئی تھی۔ اس کی بنیاد و اساس محض یہ تھی کہ بہادر شاہ ظفر کے اجداد میں تین سو سال سے حکمران چلے آتے تھے۔ بیسیوں خلل اندازیوں کے باوجود ہندوستانی عوام کے دلوں میں حکومت اور مغلیہ خاندان ایک تھے یا کم از کم لازم و ملزوم بن گئے تھے۔ نانا راؤ بھی ایک مشہور حکمران خاندان کا فرد تھا۔ اگر اس کی حکومت کا تصور سامنے رہا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔

تاہم اصل رائے کی اصابت اور پختگی میں کسی کو کیا کلام ہو سکتا ہے؟ ہر مقام کی قوت کو دہلی میں جمع کرتے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انگریزوں کو بھی اپنی قوت ایک مقام پر لے آنے اور مجتمع کر لینے کا موقع مل جاتا، نیز دہلی شہر کے وسائل تمام افواج کی ضروریات رسد پوری نہ کر سکتے تھے۔ صحیح راہ عمل یہی تھی کہ جنگ آزادی کے بیسیوں مرکز جا بجا قائم کر دیے جاتے تاکہ انگریزوں کی جو تھوڑی سی قوت باقی تھی وہ بٹ جاتی اور اسے بہ آسانی ختم کر دیا جا سکتا۔ یہ رائے بھی عظیم اللہ خاں کی سیاسی بصیرت و بالغ نظری اور پختہ کاری کی ایک روشن دستاویز ہے۔

دو مصیبتیں

میدان جنگ میں اہل ملک کے لیے دو بڑی مصیبتیں تھیں: اول یہ کہ جو سپاہی بروئے کار آ گئے تھے، ان میں سے بہت کم وقت کی ضرورت کے مطابق جنگی تربیت سے بہرہ مند تھے اور زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو دراصل لڑنے کے قابل نہ تھے۔ جہاں کہیں جم کر مقابلے کی نوبت آتی یا کسی موقع پر انگریزوں کا پلہ بھاری رہتا تو سب لوگ اٹھ بھاگتے اگرچہ تعداد میں زیادہ ہوتے۔ حالانکہ جنگ میں نیک و بد دونوں حالتیں پیش آ سکتی ہیں۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ ان میں قابل اور تجربہ کار سپہ سالار بہت کم تھے۔ صرف چند لوگوں کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً احمد اللہ شاہ یا رانی لکشمی بائی۔ اکثر یا تو

فنونِ جنگ سے ناواقف تھے یا ان کی حیثیت متوسط درجے کی تھی۔ نتیجہ وہی نکل سکتا تھا، جو نکلا۔

کان پور میں انگریزی سپاہ بہت کم تھی اور ابتدا ہی میں محصور ہو گئی تھی۔ اگر مجاہدین میں سے چند آدمی بھی تجربہ کار ہوتے تو بہت جلد محصورین کو مسخر کر لیتے لیکن ۴ جون سے ۲۱ جون تک کی گولہ باری کے باوجود انگریزی فوج کے عزم مقابلہ کو توڑا نہ جا سکا۔

انگریزوں کی حوالگی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کے بعد نانا راؤ نے عظیم اللہ خاں اور بعض دوسرے مشیروں سے رائے لی کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر قرار پایا کہ حسنِ تدبیر سے کام لینا چاہیے۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ انگریزوں کو ایک خط لکھا جائے، جس میں تجویز پیش کی جائے کہ وہ حوالگی کے لیے تیار ہوں تو انھیں کشتیوں میں سوار کرا کے سلامت الٰہ آباد پہنچا دیا جائے گا۔ اس تحریر پر کسی کے دستخط نہ تھے، لیکن یہ تھی عظیم اللہ خاں کے قلم سے۔ مضمون یہ تھا:

علیا حضرت ملکہ وکٹوریا کی رعایا کے نام

جن لوگوں کو لارڈ ڈلہوزی کے افعال سے کوئی تعلق نہ تھا اور وہ ہتھیار رکھ دینے کے لیے تیار ہوں، انھیں بہ حفاظت الٰہ آباد پہنچا دیا جائے گا۔

یہ تحریر ایک انگریز بڑھیا مسز جیکوبی[1] کے ہاتھ اندر پہنچائی گئی، جو بھیس بدل کر لکھنؤ جاتی ہوئی گرفتار ہوئی تھی۔ چنانچہ اس تحریر کی بنا پر جنرل وھیلر نے اپنے ساتھیوں کے مشورے سے حوالگی کی گفت و شنید شروع کی۔ نانا راؤ کی طرف سے عظیم اللہ خاں اور جوالا پرشاد بھیجے گئے۔[2]

---

[1] JACOBY اس بڑھیا کے متعلق انگریز مصنفوں میں اختلاف ہے۔ بعض اس کا نام مسز گرین وے بتاتے ہیں، لیکن زیادہ مستند وہی ہے جو متن میں درج ہوا۔

[2] تمام انگریزوں کا یہی بیان ہے۔

تانتیا ٹوپے نے گرفتاری کے بعد اپنے جو حالات لکھے تھے، ان میں مرقوم ہے کہ وھیلر نے بالآخر صلح کا جھنڈا بلند کیا اور لڑائی بند ہو چکی تھی۔ اس کے بعد نانا راؤ نے ایک عورت کے ذریعے سے پیغام بھیجا کہ سپاہی میرا کہنا ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ کشتیاں فراہم کر دوں، پھر وھیلر اور اس کے ساتھیوں کو الہ آباد بھیج دوں۔ یہ عین قرین قیاس ہے اور جس حد تک میں اندازہ کر سکتا ہوں، صحیح یہی معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً مجاہدین کے دل میں جوش حد سے بڑھ چکا ہوگا۔ انھیں انگریزوں سے حد درجہ کاوش تھی اور ان کے ساتھی بھی انگریزوں کے ہاتھوں گوناگوں تکلیفیں اٹھا چکے تھے۔ بہت سے مارے بھی جا چکے تھے، اس لیے وہ انگریزوں کی حفاظت کے سلسلے میں افسروں یا کارفرماؤں کا حکم ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ دہلی میں بھی ایسے کئی واقعات پیش آ چکے تھے۔

شرائطِ حوالگی بہرحال عظیم اللہ خاں اور جوالا پرشاد نے حوالگی کی شرطیں طے کیں جن کا مفاد یہ تھا:

۱۔ جائے قیام، خزانہ اور توپ خانہ حوالے کر دیا جائے گا۔

۲۔ ہر انگریز کو بندوق اور ساٹھ ساٹھ گولیاں ساتھ لے جانے کی اجازت ہوگی۔

۳۔ عورتوں اور بچوں اور زخمیوں کے لیے گاڑیاں مہیا کر دی جائیں گی۔

۴۔ کشتیاں گھاٹ پر تیار رہیں گی اور ان میں آٹا بھی ضرورت کے مطابق موجود ہوگا۔

نانا کے وکیلوں میں سے ایک نے، جو غالباً عظیم اللہ خاں تھا، یہ بھی کہا کہ ہم آٹے کے علاوہ بھیڑ بکریوں کا انتظام بھی کر دیں گے۔[۱]

پہلے یہ طے ہوا تھا کہ انگریز فوراً نکلیں اور کشتیوں پر سوار ہو کر چلے جائیں۔ یہ ممکن نہ تھا۔ چنانچہ بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ صبح کے وقت روانگی عمل میں آئے۔ اس بارے میں

---

[۱] یہ شرطیں ہر کتاب میں مذکور ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو کان پور ص ۱۶۴

گفت و شنید ایک انگریز مسٹر باڈو نے کی تھی جو بٹھور میں انگریزی زبان کا اُستاد رہ چکا تھا۔ ناناؔ نے اس سے کہا کہ ہم کشتیوں میں کھانے کا انتظام کر دیں گے۔ اطمینان سے دن وہاں گزارا جائے اور شام ہو جائے تو روانگی عمل میں آئے۔

دردناک واقعہ

بعد کا واقعہ یقیناً بڑا دردناک ہے، خواہ اس کی وہ تفصیلات درست ہوں جو انگریزوں نے بیان کی ہیں یا وہ درست ہوں جو ایک ذمہ دار ملکی کے قلم سے نکلی ہیں۔ جب سب لوگ ستی چوڑا کے گھاٹ سے کشتیوں پر سوار ہو گئے تو ہر طرف سے ان پر گولیاں چلنے لگیں بہت سے مارے گئے یا دریا میں ڈوب گئے کچھ گرفتار ہو گئے اور تھوڑے سے بچ نکلے، جن کے مفصل حالات ۱۸۵۷ء کی تاریخ سے متعلق ہیں۔

انگریزوں کا بیان ہے کہ اس بارے میں عظیم اللہ خاں، ناناؔ راؤ اور دوسرے لوگوں نے پہلے سے سب کچھ طے کر لیا تھا اور یہ کام تانتیا ٹوپے کے حوالے کیا گیا تھا، لیکن خود تانتیا ٹوپے نے لکھا ہے:

> اگلے روز (۲۷ جون) میں نے چالیس کشتیاں تیار کرائیں۔ تمام مردوں عورتوں اور بچوں کو اُن میں سوار کر دیا اور الہ آباد روانہ کر دیا۔ اس اثنا میں پوری فوج، جس میں توپ خانہ بھی شامل تھا، تیار ہو کر گنگا کے کنارے پہنچ گئی۔ سپاہی دریا میں کُود پڑے، مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل شروع کر دیا اور کشتیوں کو آگ لگا دی[1]

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہی درست معلوم ہوتا ہے، ورنہ ان تھوڑے سے انگریزوں کو یوں قتل کر کے نانا یا کسی دوسرے کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟ تاہم اعتراف

---

[1] نیل سن جلد پنجم ص ۳۰۳ ۔

کرتا چاہیے کہ کوئی بھی شخص اس فعل کی اخلاقی ذمہ داری سے بری نہیں سمجھا جا سکتا، اگرچہ وہ کتنا ہی بے بس تھا۔ جو لوگ بڑے کاموں کا بیڑا اٹھاتے ہیں، وہ بعض صحیح اصول پر پورا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ انسانی جانیں لینے کی اجازت اسی صورت میں ہے کہ امن و آزادی کی خاطر ان کا لینا ناگزیر ہو جائے۔ جو لوگ اپنے آپ کو حوالے کر چکے اور پناہ میں آ گئے، ان پر یوں حملے کسی بھی مذہب اور کسی بھی ضابطہ اخلاق کے رو سے جائز نہیں۔

ایک اور بیان مفتی انتظام اللہ خاں فرماتے ہیں کہ عہد بالا راؤ نے توڑا۔ اسی نے کشتیوں پر گولیاں چلوائیں اور وہی قتل کا ذمہ دار ہے۔

اس واقعہ سے نانا صاحب اور عظیم اللہ خاں اور میں دختر نانا راؤ نانا راؤ سے کبیدہ خاطر ہو گئے۔ عظیم اللہ خاں کا نام پھر نانا راؤ کے ساتھ تاریخ میں نہیں آتا۔[1]

نانا ٹوپے کا بیان اوپر نقل ہو چکا ہے۔ مینا بائی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ بظاہر عظیم اللہ خاں ایسے کسی فعل کا روادار نہ ہو سکتا تھا اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے بعد تاریخ میں عظیم اللہ خاں کا نام کہیں نہیں آیا۔

بعد کے حالات کچھ معلوم نہیں پھر عظیم اللہ خاں کہاں کہاں رہا۔ مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ وہ لکھنؤ پہنچ گیا تھا اور احمد اللہ شاہ کے ساتھ رہا۔ شاہجہان پور سے نانا کے ساتھ نیپال چلا گیا اور وہیں ۱۸۵۹ء میں فوت ہوا۔[2] سین نے لکھا ہے کہ عظیم اللہ خاں نے اکتوبر ۱۸۵۹ء میں بمقام بھوال وفات پائی۔[3] اور اس کا سبب غالباً موسمی بخار تھا جو نیپال کے علاقے میں بڑا ہی خطرناک تھا۔

---

[1] غدر کے چند علماء صفحہ ۹۱ [2] ایضاً ایضاً [3] سین کی ۵۷ صفحہ ۳۶۸

سید لطف اللہ ایم۔ اے فرماتے ہیں کہ عظیم اللہ خاں نے ۱۸۵۶ء میں "پیام آزادی" کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا تھا۔ اس میں انقلابی سرگرمیوں کے متعلق نہایت قیمتی دستاویز شائع ہوا کرتی تھیں۔ بعد میں انگریزوں نے تلاشیوں میں اس کی ایک ایک کاپی ضبط کر لی اور جس جس خاندان کے پاس سے اس کی کوئی کاپی برآمد ہوئی اس کے ارکان کو موت کی سزا دے دی گئی[1] معلوم نہ ہو سکا کہ یہ اخبار ہفتہ وار تھا یا ماہانہ۔ اس کا مقام اشاعت بظاہر کان پور ہی ہوگا

---

[1] (جنگ آزادی کے پس کردہ اصل کارکن) ص ۴۲ عجیب بات یہ ہے کہ اس نام کے ایک اخبار کا اجرا شہزادہ "بیدار بخت" سے بھی منسوب کیا گیا ہے۔

سید احمد اللہ شاہ مدراسی

شخصیت

سید احمد اللہ شاہ مدراسی ۱۸۵۷ء کے مجاہدین میں اس حیثیت سے بھی ممتاز ترین شخص ہیں کہ انگریزوں نے سخت مخالفت کے باوجود اُن کی بے حد ستائش کی ہے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ اس اعتبار سے بھی ان کا مرتبہ سب سے بڑا ہے کہ باقی ممتاز مجاہدین میں سے بعض کے محرکاتِ عمل ذاتی شکایتوں ناکامیوں کا نتیجہ تھے لیکن احمد اللہ شاہ کے لیے انگریزوں سے ذاتی ناراضی کا کوئی بھی سبب موجود نہ تھا۔ نہ ان کی ریاست ضبط ہوئی تھی، نہ پنشن بند ہوئی تھی، نہ اعزاز چھنا تھا۔ اُنھوں نے راہِ آزادی میں جو تکلیفیں اٹھائیں، جو مصیبتیں برداشت کیں، یہاں تک کہ بالآخر جان بھی دے دی، وہ ان اغراض کے لوث سے یک قلم پاک تھیں۔ ان کا نصب العین صرف یہ تھا کہ ملک اجنبیوں کے تسلط سے پاک ہو جائے۔

خاندان

بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قطب شاہی سلطنت کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کی اولاد میں سے تھے، جسے عالمگیر اعظم نے فتح گولکنڈہ کے بعد دولت آباد میں نظر بند کر دیا تھا اور وہیں اس نے وفات پائی۔ اُس کے اخلاف بعد ازاں مدارس میں منتقل ہو گئے تھے۔ قطعیت کے ساتھ بتانا مشکل ہے کہ تانا شاہ اور احمد اللہ شاہ میں کتنی پشتوں کا فصل تھا۔ بعض روایات میں بتایا گیا ہے کہ احمد اللہ شاہ کے والد کا نام محمد علی تھا اور دادا کا جلال الدین عادل۔ یہی جلال الدین تانا شاہ کا فرزند تھا۔ میرا خیال ہے کہ بیچ میں کم از کم دو[2]

پشتیں اور ہونی چاہئیں۔ چونکہ یہ خاندان مدراس میں مقیم ہوگیا تھا، جسے پرانے زمانے میں چینا پٹن اور مندراج بھی کہتے تھے اس لیے مختلف سوانح نگاروں نے احمد اللہ شاہ کو مدراسی یا مندراجی لکھا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ جلال الدین عادل اپنے عہد کے قطب تھے اور ان کے صاحبزادے محمد علی (والد احمد اللہ شاہ) ٹیپو سلطان شہید اور نواب مارکاٹ کے مصاحب رہ چکے تھے۔[۱]

نام اور لقب

احمد اللہ شاہ کا خاندانی نام احمد علی شاہ تھا۔ ۱۲۰۴ھ کے آس پاس تاریخ پیدائش بتائی جاتی ہے۔ میر قربان علی جے پوری نے جو وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے احمد علی نام بدل کر احمد اللہ رکھا۔ اسی نام سے شہرت پائی۔

مولانا عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ لکھنؤ والوں نے ان کا نام "ڈنکا شاہ" رکھ دیا تھا، اس لیے کہ جب باہر نکلتے تو ان کے آگے ڈنکا بجتا جاتا۔ قیصر التواریخ میں "نقارہ شاہ" نام بھی مذکور ہے۔[۲] مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ قیام آگرہ کے زمانے میں جمعرات اور جمعہ کے دن احمد اللہ شاہ کا جلوس نکلا کرتا تھا۔ وہ پالکی میں سوار ہوتے اور آگے آگے ڈنکا بجتا جاتا اسی وجہ سے وہ "ڈنکا شاہ" مشہور ہوگئے تھے۔ گویا یہ نام لکھنؤ میں نہ رکھا گیا بلکہ پہلے سے رواج پا چکا تھا۔

انگریزی کتابوں میں انھیں عموماً "فیض آباد کا مولوی" بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ ان کی مجاہدانہ زندگی کا عملی آغاز فیض آباد ہی میں ہوا۔ میلی سن نے ان کے اور مولانا لیاقت علی الہ آبادی کے حالات غلط ملط بھی کردیے، اس لیے کہ دونوں کو ایک سمجھ لیا۔

---

[۱] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص۵۱۔

[۲] قیصر التواریخ جلد دوم ص۲۰۳۔

ابتدائی حالات کہا جاتا ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت امیرانہ طریق پر ہوئی، اس لیے کہ زہد و فقر کے ذوق کے باوجود خاندان کی عام حیثیت امیرانہ ہی تھی۔ شہسواری کے علاوہ سپہ گری کے فنون بھی سکھائے گئے۔ ان کے حالات مولانا فتح محمد تائب لکھنوی نے ایک مثنوی کی صورت میں نظم کر دیے تھے، جس کا نام "سوانح احمدی" رکھا تھا۔ اس میں بتایا گیا ہے:

جو مکتب سے ان کو فراغت ملی
بڑھا سوئے شمشیر شوق دلی

گویا پہلے انھوں نے وقت کے رواج کے مطابق تعلیم پوری کی، اس کے بعد فنون جنگ سیکھے۔

طبیعت میں تغیر ہوش سنبھالا تو ٹیپو سلطان کی شہادت کے آثار ہر طرف نمایاں تھے۔ سلطنت خداداد تباہ ہو چکی تھی، جو دکن میں اپنی نوعیت کی یگانہ سلطنت تھی اور جو آزادیٔ وطن کی تمام امیدوں کا آخری سہارا تھی۔ اس تباہی کو دیکھنے والے سیکڑوں افراد موجود ہوں گے اور خود احمد اللہ شاہ کا خاندان بھی اس تباہی کی وجہ سے خاصا متاثر ہوا ہوگا۔ ایک حساس طبیعت کے لیے یہ واقعات بڑے عبرت افزا ہوں گے۔ احمد اللہ شاہ کی طبیعت بے حد حساس تھی۔ انھیں سیکڑوں آدمیوں نے بتایا ہوگا کہ آزادیٔ وطن کے علمدار ٹیپو سلطان اور انگریزوں کے درمیان ٹکر کس درجہ ولولہ افروز اور حمیت پرور تھی اور اس کا نتیجہ کتنا دردناک ہوا۔[۱] احمد اللہ شاہ پر ان واقعات کا اثر یہ ہوا کہ امارت کی زندگی سے دل متنفر ہو گیا۔ وطن میں جینا خوشگوار نظر آیا اور نہ اس ماحول کے ساتھ کسی قسم کی دل بستگی باقی رہی۔ تائب فرماتے ہیں:

۱۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۴۔

بڑھا جب قدم سولھویں سال سے | چھٹا سلسلہ ملک سے مال سے
گدا ہو گئے اسم و زر چھٹ گیا | ملازمت غربت ہو گو چھٹ گیا

حیدر آباد میں قیام

چنانچہ آپ نے گھر بار چھوڑا اور باہر نکل پڑے۔ چونکہ امارت سے انقطاع کا فیصلہ کر لیا تھا لہٰذا خیال ہو گا کہ کہیں سے روحانی فیض حاصل کریں یا کسی مقام پر مسلمانوں کی خدمت انجام دینے کا موقع نظر آئے تو اس سے سعادت اندوز ہوں۔

مدراس سے حیدر آباد پہنچے۔ وہاں اس زمانے میں مرہٹوں سے لڑائیاں ہو رہی تھیں احمد اللہ شاہ نے بھی حیدر آباد کی طرف سے ان لڑائیوں میں حصّہ لیا اور مردانگی کے جوہر خوب دکھائے۔ وہیں نکاح کر لیا۔ گویا از سر نو گھر بار بنا لیا۔ کچھ مدت بعد اہلیہ فوت ہو گئی اس حادثہ الیمہ نے احمد اللہ شاہ کے دل میں اطمینان و دلجمعی کی وہ تمام آرزوئیں افسردہ کر ڈالیں۔ جو وطن سے کنارہ کشی کے بعد قیام حیدر آباد کے زمانے میں پیدا ہوئی تھیں۔ چنانچہ آپ نے طویل سیر و سیاحت کا فیصلہ کر لیا۔

ولایت کی سیر

تائب کے بیان سے مترشح ہوتا ہے خود انگریزوں نے شاہ صاحب کو ایک عالی قدر اور بلند ہمت شہزادہ دیکھ کر مناسب یہی سمجھا انھیں لندن کی سیر کرائی جائے :

کہ یک چند شہزادۂ خوش سیر | کریں ملک لندن میں سیر و سفر
امیرانِ لندن سے آگاہ ہوں | چراغِ سرِ محفلِ شاہ ہوں،
یہاں کے بھی دیکھیں یہ سب رنگ ڈھنگ | منور کریں چشم اہلِ فرنگ
سفر کے لیے ان کو رخصت ملی | پئے سیر لندن اجازت ملی
ہوئے آپ خرم اس ارشاد سے | روانہ ہوئے حیدر آباد سے
خود اک مرد انگریز ہمراہ تھا | خبر گیرِ حالِ بنِ شاہ تھا،

ہوئی بر طرف کاوشِ رنجِ راہ   گیا شہرِ لندن کو آرام گاہ

گئے شاہ لندن کے دربار میں   ہوئی عزت و جاہ سرکار میں

اگر یہ درست ہے کہ یہ سفر انگریزوں کی تجویز کے مطابق ہوا تھا اور ایک دانشمند انگریز ہمراہ بھی لیا تھا تو سمجھنا چاہیے کہ سارا خرچ بھی حکومت ہی نے برداشت کیا ہوگا لیکن اس کی کوئی وجہ ذہن میں نہیں آتی۔ انگریزوں کا طریقہ یہ نہ تھا کہ کسی کو قابل اور خاندانی دیکھیں تو خواہ مخواہ اپنے ملک کی سیر کرائیں۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ حیدرآباد کے امرا میں سے کسی نے انگریز ریزیڈنٹ کو اس امر پر راغب کیا ہو یا خود شاہ صاحب کے پاس اتنی دولت ہو کہ اپنا اور ایک انگریز رفیق کا سفر خرچ برداشت کر لیں۔ غرض لندن کا سفر ضرور کیا، اس کا ذریعہ خواہ کچھ ہو۔

حج و زیارت

لندن کے علاوہ یورپ کے بعض حصوں کو بھی دیکھا ہوگا۔ مراجعت کے وقت فیصلہ کر لیا کہ حج و زیارت کا شرف بھی حاصل کر لیا جائے۔ چنانچہ مکہ معظمہ پہنچے :

ہوئے گام فرسائے راہِ حرم   زمیں جس کی ہے آسمانِ ارم

فراغت ملی کاوشِ راہ سے   مشرف ہوئے کعبۃ اللہ سے

قدم مقصد آستاں پر رکھا   سرِ عجز اس آستاں پر رکھا

پھر مدینہ منورہ گئے اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربارِ مقدس میں حاضری سے شرف یاب ہوئے :

ہوا دل کو ذوقِ سفر پھر قبول   پئے اقتباسِ حضورِ رسولؐ

چلے سر کے بل جاں نثارِ نبیؐ   ہوئے خاک بوسِ مزارِ نبیؐ

وہاں سے غالباً خشکی کے راستے واپس آئے۔ اغلب ہے عراق میں زیارتیں کی ہوں۔ ایران کا ذکر بالتصریح موجود ہے :

سفر کر کے آباد و ویراں میں وہ — فرو کش ہوئے ملک ایراں میں وہ
نہ پروا تھی کچھ حشمت و جاہ کی — طلب تھی فقط اپنے اللہ کی

گوشہ نشینی اور چلہ کشی

واپس آئے تو خلوت و انزوا کا ذوق بہت غالب تھا۔ سفر کرتے کرتے آپ کو بیکا نیر اور سانبھر کے علاقے کی فضا بہت پسند آئی۔ ملک کا بڑا حصہ ریگزار، آبادی کم، عام راستوں سے ہٹے ہوئے مقامات، نہ یہ اندیشہ کہ لوگ شوق ملاقات میں ہجوم کر کے آئیں گے اور مشاغل عبادت میں خلل پیدا ہوگا، نہ یہ خیال کہ تقدس کی شہرت پھیلے گی تو انزوا کا سلسلہ باقی نہ رہنے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں آپ نے مسلسل چلہ کشی کی۔ چلہ کشی کا عام طریقہ یہ تھا کہ خاص اوراد و وظائف خاص پابندیوں کے ساتھ ایک مدت تک پورے کیے جاتے تھے۔ بعض مسلمان درویش غالباً ہندو جوگیوں کی پیروی میں گوشت وغیرہ بھی ترک کر دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد اللہ شاہ نے گوشت وغیرہ کے ترک کی پابندی سے بارہ سال چلہ کشی جاری رکھی۔ گویا اتنی لمبی مدت بیکا نیر اور سانبھر ہی میں گزار دی۔ پھر جے پور جا کر میر قربان علی سے فیوض حاصل کیے۔ انھوں نے رائے دی کہ ٹونک جانا چاہیے۔ جہاں اس زمانے میں نواب وزیر الدولہ حکمران تھے۔

سفر ٹونک

نواب وزیر الدولہ ۱۸۳۴ء میں مسند نشین ہوئے۔ لہٰذا احمد اللہ شاہ کے ٹونک جانے کا واقعہ اس سے بعد ہی کا ہو سکتا ہے۔ نواب موصوف نے شاہ صاحب کا خیر مقدم بڑی گرم جوشی سے کیا۔ ٹونک میں وہ زمانہ شریعت کی پابندی کے لحاظ سے بڑا ہی بابرکت تھا۔ احمد اللہ شاہ کے ہاں بعد نماز عصر محفل سماع منعقد ہوتی تھی۔ یہ امر لوگوں کے نزدیک وجہ عجز بن گیا بلکہ بتایا جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے "عارفانہ جوابات" دیے، جن کی تفصیل کچھ نہیں بتائی گئی۔ لوگ ان جوابات پر مطمئن ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں، لیکن

شاہ صاحب کے لیے ٹونک میں اطمینان و دلجمعی سے قیام پذیر رہنے کا کوئی امکان نہ رہا۔ اسی زمانے میں انھوں نے سنا کہ گوالیار میں محراب شاہ قلندر نامی ایک بزرگ ہیں، ان سے ملاقات کے شوق میں گوالیار چلے گئے۔

محراب شاہ سے ملاقات

تفصیلاً پتہ نہ چلا کہ محراب شاہ کون بزرگ تھے، انھوں نے کس وجہ سے اتنی شہرت پائی کہ احمد اللہ شاہ کو ٹونک میں ان کا نام سن کر گوالیار پہنچنے کی کشش ہوئی۔ صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ محراب شاہ نواب کے فوجی رسالے کے پیادوں پر ملازم تھے۔ یہی بزرگ ہیں جنھوں نے احمد اللہ شاہ کو جہاد آزادی کی راہ پر لگایا اور انھیں اس مقام پہ پہنچایا جہاں وہ غیر ملکی حکومت کی مخالفت کرنے والے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ احمد اللہ شاہ کو دیکھتے ہی محراب شاہ نے فرمایا: میاں میں تو مدت سے تمھارا منتظر تھا۔ جو وراثت بزرگوں سے مجھے ملی ہے اسے تمھارے حوالے کرنے کا وقت آگیا۔ ساتھ ہی فرمایا:

بیعت کرتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ جان کی بازی لگانی ہوگی۔ سودا بڑا کٹھن ہے۔

احمد اللہ شاہ نے جواب میں عرض کیا کہ میں ہر حکم کی تعمیل کے لیے ہمہ تن آمادہ ہوں۔ محراب شاہ نے گلے سے لگا لیا۔ خلعت خلافت بھی عطا کیا اور اوراد و وظائف کے ساتھ تلقین جہاد بھی ضروری قرار دی۔[1]

اب احمد اللہ شاہ کی زندگی ہی بدل گئی۔ وہ پہلے خلوت و انزوا کی طرف مائل تھے۔ اب جہاں جاتے جہاد کی تلقین کرتے۔ اسی مقصد کے لیے وعظ فرماتے، اسی مقصد کے لیے دورے کرتے، یہی مقصد ان کا خاص نصب العین بن گیا۔

۱۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۹

گوالیار سے دہلی

مرشدِ طریقت سے اجازت لی تو یہ خیال آیا کہ ملکی حکومت کے سب سے بڑے مرکز یعنی دہلی جا کر پیشِ نظر مقصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ دہلی اس زمانے میں علماء، صوفیہ اور اکابرِ تدریس کا سب سے بڑا مامن تھی۔ وہاں پہنچے ایک ایک بزرگ سے ملے۔ بادشاہ، امراء، درباریوں اور عوام سب سے تعلقات پیدا کیے۔ سب کو اپنا پیغام پہنچایا۔ وقت کی نزاکت کا احساس دلایا، لیکن ایک مفتی صدر الدین آزردہ کے سوا کسی کے دل میں آمادگی کا جذبہ نظر نہ آیا۔ مفتی صاحب نے بھی غور و تدبر کے بعد یہ رائے دی کہ دہلی کے بجائے آگرہ جا کر اصلاحی تحریک کے لیے تنظیم کا سروسامان کرنا چاہیے۔ مفتی انعام اللہ خاں وکیل سرکار کے نام ایک تعارفی خط بھی دے دیا جو آگرہ میں مقیم تھے۔

آگرہ میں تنظیمات

دہلی سے آگرہ پہنچے تو مفتی انعام اللہ خاں کے مکان پر قیام پذیر ہوئے۔ مفتی صاحب خود بہت ذی اثر اور علم و فضل میں درجہ امتیاز پر فائز تھے۔ اُن کا مکان وقت کے اہل علم و فضل کا مرجع تھا۔ سب وہیں جمع ہوتے تھے مثلاً مولانا قاسم دانا پوری، مولانا غلام امام شہید، مولوی امام بخش وکیل، مولوی حافظ ریاض الدین مفتی شہر، شیخ محمد شفیع اللہ الہ آبادی، مولوی منصب علی وکیل، مولوی عظیم الدین حسن، مولوی محمد باسط علی، مولوی معین الدین، مولوی شیخ اعتقاد علی وکیل، میرزا اسد علی بیگ وکیل، سید باقر علی ناظم محکمہ دیوانی، مفتی عبد الوہاب گوپاموی، مفتی نور اللہ گوپاموی، مولوی نور الحسن، سید رحمت علی، مولوی طفیل احمد خیر آبادی[1] (والد ریاض مرحوم) یہ سب احمد اللہ شاہ کے مخلص معتقد بن گئے۔ مولوی فیض احمد عثمانی بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خاں جیسے لوگ پروانوں کی طرح آپ پر نثار ہونے لگے۔

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۹

قیام آگرہ کے زمانے میں شاہ صاحب وعظ بھی فرماتے۔ محفل سماع بھی منعقد ہوتی۔ دیہات کے دورے کیے جاتے۔ ہر تیسرے دن قلعہ آگرہ کے میدان میں فوجوں کے ساتھ تیر و تفنگ کی مشق بھی کی جاتی۔ عیدین اور جمعہ کو جلوس نکلتے۔ خود پالکی پر سوار ہوتے اور آگے آگے ڈنکا بجتا جاتا۔[1]

وعظوں کی کیفیت

وعظوں کا نقشہ مولوی سید اسمٰعیل احمد صاحب علیگ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے۔

> ان کی تقریروں میں ہزاروں آدمی ہندو اور مسلمان جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ آگرہ کی تقریروں میں دس دس ہزار کا مجمع ہوتا۔ ان کی ہر دلعزیزی کی یہ حالت تھی کہ پولیس نے ایک موقع پر مجسٹریٹ کے حکم پر انھیں گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔[2]

مطلب یہ کہ گرفتار کرنے تو اندیشہ تھا کہ عام لوگوں میں جوش پیدا ہو جائے گا اور پولیس اس جوش کو روک نہ سکے گی۔

واضح رہے کہ یہ ۱۸۲۹ء کے آس پاس کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں لوگ کسی کا وعظ سننے کے لیے عموماً بڑی تعداد میں جمع ہونے کے عادی نہ تھے۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کا جمع ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وعظ یا تقریریں سب کے لیے یکساں جاذب توجہ ہوتی تھیں۔

پہلی ابتلا

ہر دلعزیزی کے پھولوں کے ساتھ رقابت و حسد کے کانٹے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ شاہ صاحب کو بھی ان کانٹوں سے سابقہ پڑا۔ وہاں اس زمانے میں ایک پیر رہتے تھے جن کا نام فرخ شاہ تھا اور وہ فرخ آباد کے باشندے تھے۔

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۱۲۴ [2] مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۴۹

احمد اللہ شاہ سے پیشتر عام لوگ فرخ شاہ ہی کے پاس جاتے تھے۔ جب ان کی مجلسوں میں رونق گھٹنے لگی اور رجوع عام احمد اللہ شاہ کی طرف ہوا، تو دنیا دار پیر کی طرح فرخ شاہ کو بڑا غصہ آیا۔ چنانچہ اس نے ایک مدرس کو ساتھ ملا کر شاہ صاحب کے خلاف شکایتیں کیں اور ان میں اسی بات پر خاص زور دیا کہ وہ انگریزوں کے مخالف ہیں۔

نائب کا بیان ہے کہ انگریز حاکم نے شاہ صاحب کو بلایا اور درشت طریق گفتگو اختیار کیا۔ آپ نے اس پر ایک ایسی نگاہ ڈالی کہ اس کی کیفیت ہی بدل گئی۔ چنانچہ وہ بولا:

خوشی سے جہاں چاہیے جائیے | سزا پائیں مفسد جو فرمائیے
کہا آپ نے تم سے مطلب نہیں | کہ اللہ ہے احکم الحاکمین

یعنی انگریز حاکم شاہ صاحب کو سزا دینے پر تلا بیٹھا تھا۔ پھر اس نے شاہ صاحب سے کہا کہ آپ ہر پرسش سے آزاد ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے آپ کی شکایت کی اور یہ فتنہ اٹھایا، انھیں آپ کی خواہش کے مطابق سزا دی جائے گی۔ شاہ صاحب نے جواب دیا کہ میں آپ کے ذریعے سے کسی کو سزا دلوانا نہیں چاہتا۔ خدا حاکموں کا حاکم ہے، وہ جو چاہے گا، ہو رہے گا۔ میرا مقدمہ اسی کی بارگاہ میں پیش ہے۔

شاہ صاحب تو بچ گئے لیکن ان کے نیازمندوں یا دوستانہ تعلق رکھنے والوں میں سے بعض کے خلاف حاکموں نے بعد میں مقدمہ چلایا اور انھیں قید کی سزائیں دیں۔ مفتی انعام اللہ شاں کو معطل کیا گیا۔ وہ بحال ہوئے تو انگریزوں کی ملازمت چھوڑ دی اور ریاست ٹونک میں جا کر مہتمم بندوبست ہو گئے۔ وہاں سے بھی احمد اللہ شاہ کو ہر ممکن امداد دیتے رہے۔

آگرہ سے فیض آباد

یہ بتانا مشکل ہے کہ شاہ صاحب کب آگرہ سے اودھ گئے۔ مفتی انتظام اللہ نے لکھا ہے کہ مولوی سید امیر علی امیٹھوی کے شہید ہونے کی خبر ملی، تو فرمایا کہ اب کام کا وقت آگیا ہے۔ چنانچہ پہلے آپ کو ایار

گئے[1] اور محراب شاہ قلندر سے اجازت لے کر لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے۔ قیصر التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۵۵ء سے کئی سال پیشتر بہ مقام لکھنؤ گھسیاری منڈی میں رہتے تھے[2]۔ تائب فرماتے ہیں:

ہوئے شاہ[3] حضرت کے انعام سے — رہے تھوڑے دن عیش و آرام سے
سفر کی وہاں سے بھی رخصت ملی — پئے جنگ و پیکار اجازت ملی
چلے کوشش و جستجو کی طرف — گئے بلدۂ لکھنؤ کی طرف

سفرِ لکھنؤ

لکھنؤ کا سفر اختیار کیا تو مریدین کی ایک جماعت بھی احمد اللہ شاہ کے ہمراہ تھی۔ بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ آپ کان پور میں عظیم اللہ خاں سے بھی ملے اور کچھ مدت وہاں ٹھہرے رہے۔

۲۔ کان پور سے اناؤ ہوتے ہوئے لکھنؤ گئے اور گھسیاری منڈی میں قیام کیا۔

۳۔ اس زمانے میں مولانا فضل حق خیرآبادی لکھنؤ ہی میں سرکاری ملازم تھے۔ انھوں نے بھی شاہ صاحب سے ملاقات کی۔ خدا جانے شاہ صاحب نے کیا کہا کہ مولانا لکھنؤ کی ملازمت چھوڑ کر الور چلے گئے۔

تائب نے لکھا:

نصاریٰ سے جو حکم پیکار تھا
ہر اک شخص سے اس کا اظہار تھا

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۲۳۔ مولوی سید امیر علی ہنومان گڑھی فیض آباد کو ہندوؤں کے قبضے سے چھڑانے میں مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ اودھ کی حکومت نے اس سلسلے میں کچھ نہ کیا۔ انگریز افسر فوج نے مولوی صاحب اور ان کے ساتھیوں کو شہید کر دیا۔ یہ ۷ نومبر ۱۸۵۵ء کا واقعہ ہے۔ [2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۰۳۔ [3] محراب شاہ قلندر۔ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ و پیکار کی اجازت اسی مقصد کے لیے ملی تھی جس مقصد کے لیے مولوی سید امیر علی شہید ہوئے تھے۔

گویا اپنی دعوت خاص کی باتیں چھپ چھپا کر نہیں کرتے تھے بلکہ علی الاعلان سب کو اصل مقصد کے لیے منظم ہو جانے پر آمادہ کرتے تھے۔

مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ مولوی سید امیر علی کے واقعے کو تشویق جہاد کے سلسلے میں پیش کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فیض آباد میں سید امیر علی کے نصب العین ہی کو پایۂ تکمیل پر پہنچانا منظور ہو۔ چونکہ مولوی صاحب کی شہادت کا اصل ذمہ دار انگریز کپتان تھا۔ اس لیے شاہ صاحب کا خیال ہو کہ جو کچھ کیا وہ انگریزوں نے کیا اور انھیں ختم کیے بغیر اہل ملک کا کوئی بھی حق نہیں ہو سکتا۔

فیض آباد میں سرگرمیاں لکھنؤ سے شاہ صاحب فیض آباد گئے اور وہاں کے مسلمانوں کو جانبازی و فداکاری پر آمادہ کرنے کے لیے وعظ فرمانے لگے۔ بلکہ باضابطہ جنگی تربیت اور قواعد بھی ہونے لگی۔ وہاں کے حاکم نے یہ صورت حال دیکھی تو اس کے دل میں تشویش پیدا ہوئی۔ اس نے احتیاطاً ایک پلٹن منگوا لی کہ مبادا فساد ہو جائے۔ شاہ صاحب کو دھمکیاں بھی دیں۔ وہ دھمکیوں سے کیا متاثر ہو سکتے تھے۔ آخر لڑائی ہوئی۔ ایک افسر زخم کھا کر گر پڑا۔ خود شاہ صاحب بھی زخمی ہو گئے۔ بے ہوشی کی حالت میں انھیں گرفتار کر کے جیل خانے پہنچا دیا گیا۔[1]

"قیصر التواریخ" میں یہ واقعہ یوں مرقوم ہے:

> احمد اللہ شاہ فقیر، رہنے والا مندراج یا دکن کا کئی برس سے لکھنؤ گھسیاری منڈی میں رہا کرتا تھا، مشہور بہ "نقارہ شاہ"۔ اتفاقاً کسی ارادے سے فیض آباد گیا۔ سرائے میں اترا تھا۔ کسی برقندا ز سے فساد کیا تھا۔ قید ہو کر لول کی پلٹن میں تھا۔[2]

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۰۳۔

میلی سن کا بیان

میلی سن نے یہ حالات دوسرے ہی انداز میں بیان کیے ہیں اور جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، یہی بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یقیناً میلی سن نے جو کچھ لکھا ہوگا، وہ انگریزی حکومت کی تحقیقات کامل کے نتائج سامنے رکھ کر لکھا ہوگا۔ وہ احمد اللہ شاہ کے متعلق لکھتا ہے:

> یہ امر یقینی ہے کہ اس نے اپریل ۱۸۵۷ء میں باغیانہ اشتہارات پورے اودھ میں شائع کیے تھے۔ پولیس نے اسے بدیں وجہ گرفتار کیا کہ اس کام کے لیے فوج درکار تھی۔ پھر اس پر مقدمہ چلا اور موت کی سزا سنائی گئی۔ اس سزا کے نفاذ سے پیشتر اودھ میں غدر شروع ہوگیا اور لوگوں کے ساتھ بہت سے سیاسی مجرموں کی طرح وہ (احمد اللہ شاہ) بھی قید خانے سے نکل بھاگے۔ پس بہت جلد تخت کے پایہ تک پہنچ گیا اور لکھنؤ کی بیگم (حضرت محل) کا رازدار دوست اور تمام باغیوں کا معتمد علیہ قائد بن گیا۔[1]

دوسری جگہ لکھتا ہے:

> الحاق اودھ کے بعد اس نے (احمد اللہ شاہ) شمال و مغربی صوبے کا دورہ ایک ایسے مقصد کے لیے کیا، جو فرنگیوں کے نزدیک سراسر پُراسرار تھا۔ اس زمانے میں اس پر سازش کا شبہ تھا۔ بعد ازاں جو ثبوت فراہم ہوئے کہ الحاق اودھ اور آغاز غدر کی درمیانی مدت میں اودھ کے بعض ذی اثر آدمیوں نے ایک سازش کی تھی۔ بلاشبہ مولوی (احمد اللہ شاہ) اس سازش کا لیڈر تھا، جس کی شاخیں ہندوستان

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۲۷۹۔

> بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ آگرہ یقیناً اس سازش کا ایک مرکز تھا۔ جہاں مولوی کچھ دیر قیام پذیر رہا۔ قریباً یقینی طور پر دہلی میں، نیز میرٹھ، پٹنہ اور کلکتہ میں اس کی شاخیں تھیں۔ موخر الذکر مقام میں شاہ اودھ اور اس کے بابت سے لواحق ٹھہرے ہوئے تھے۔ [1]

ان اقتباسات سے پیشتر تمام بیانات کی فی الجملہ تصدیق ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ احمد اللہ شاہ نے سازش کا جو جال پھیلایا تھا، آگرہ اور دہلی یقینی طور پر اس کے خاص مرکز تھے۔ بنیادی فرق صرف یہ ہے کہ سابقہ بیانات کے مطابق احمد اللہ شاہ ایک کشمکش کے باعث اسیر ہوئے، میلی سن کہتا ہے کہ سازش کے ماتحت ان پر مقدمہ چلا اور الزامات اتنے سنگین تھے کہ موت کی سزا دی گئی۔

ایک اور انگریزی روایت

۱۸۵۷ء کے متعلق جن انگریزوں نے کتابیں لکھیں، ان میں سے ایک جوہز بھی ہے، جس کی کتاب اختصار و جامعیت کے لحاظ سے بہت اچھی مانی جاتی ہے۔ وہ احمد اللہ شاہ کے متعلق لکھتا ہے۔

> ایک مولوی کچھ مدت سے شہر بہ شہر پھرتا رہا۔ وہ کافروں کے خلاف جہاد کے وعظ کیا کرتا تھا۔ فیض آباد میں نمودار ہوا تو اس نے لوگوں کے دل میں فساد کا بیج بونا شروع کیا۔ اسے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ اس وقت تک انگریزوں کو خفیف سا وہم بھی نہ تھا کہ ان کی حکومت میں تزلزل پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ اس مولوی کی صلاحیت فتنہ انگیزی کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کر سکے۔ کئی ماہ بعد حقیقت منکشف ہوئی اور وہ شخص ان سازشیوں کے گروہ کا سردار ثابت ہوا، جو اپنے ہم

---

[1] میلی سن جلد پنجم ص ۲۹۲۔

ہم مذہبوں کے دل میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کے
جذبات برانگیختہ کرتے رہتے تھے۔[1]

ایک چشم دید شہادت

میل سن کے پورے بیان کی تائید ہچن سن کی کتاب سے ہوتی ہے جو اودھ کے تعلق میں ۱۸۵۷ء کے متعلق نہایت اہم معلومات پر مشتمل ہے اور بعض معلومات کے لیے وہ تنہا ماخذ ہے

ہچن سن لکھتا ہے کہ انگریزی حکومت کے خلاف پہلا واضح اور مضبوط قدم ایک مولوی نے اٹھایا تھا اور اس کے پیش نظر مذہبی اغراض تھیں۔ اس مولوی کا نام احمد علی شاہ اور وطن ارکاٹ دجنوبی ہند، تھا۔ وہ انگریزی جنرل جانتا تھا۔ فروری ۱۸۵۷ء میں فیض آباد پہنچا ساتھ مسلح جوان ساتھ تھے اور اس نے کھلم کھلا جہاد کی دعوت شروع کر دی۔ برسر عام وعظ بھی کہتا اور لوگوں میں روپے بھی تقسیم کرتا۔

چپراسی نے یہ خبر ڈپٹی کمشنر کے پاس پہنچائی اور وہاں سے ایک پیادہ گارد مولوی پر مقرر ہوگئی، جس کا کمانڈر لفٹننٹ تھامس تھا۔ اس گارد نے مولوی کی قیام گاہ کو گھیر لیا۔ مولوی اور اس کے ساتھی مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔ لڑائی ہوتی رہی۔ مولوی کے پانچ ساتھی مارے گئے۔ خود مولوی کے مونڈھے پر گولی کی زخم میں سے اتنا خون بہا کہ وہ کمزور ہو گیا انجام کار اس سے کہا گیا کہ ہتھیار رکھ دو، ورنہ مارے جاؤ گے۔

یوں اسے گرفتار کیا گیا لیکن اس کی خاص حفاظت ضروری تھی اس لیے اسے عام قید خانے کے بجائے چھاؤنی میں رکھا گیا۔[2]

فیض آباد میں ہنگامہ

مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ فیض آباد میں لشکریوں نے انگریزوں کے خلاف ہنگامہ بپا کیا تو ان کا پہلا حملہ جیل خانے

---

[1] ہوزصٹ۔ [2] HUTCHINSON اس کی کتاب کا نام ہے NARRATIVE OF EVENTS IN OUDE کی کتاب صفحہ ۳۲، ۳۶۔

پر ہوا۔ اور تمام قیدی رہا کر دیے گئے۔ میلی سن کا بیان بھی یہی ہے۔ یوں احمد اللہ شاہ نے قید فرنگ سے نجات پا کر مجاہدات کا آغاز کیا:

> ادھر مولوی سکندر شاہ فیض آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے عَلَم جہاد بلند کیا۔ عوام ان کے ساتھ ہو گئے۔ لفٹننٹ ٹامس صاحب نے فوج سے ان کا مقابلہ کیا۔ مولوی صاحب کے ساتھ بھی بے ضابطہ فوج تھی۔ توپ خانے کے چند گوروں نے عوام کے چھکے چھڑا دیے۔ آخرش مولوی سکندر شاہ کو پکڑ لیا اور وہ قید خانے میں داخل کر دیے گئے اور مولوی احمد اللہ شاہ نے لکھنؤ کا رُخ کر لیا[1]

مجھے انگریزی تاریخوں میں اس واقعے کا مفصل سراغ نہ مل سکا۔ البتہ بین نے لکھا ہے کہ ۸ جون کی شب میں ہنگامہ ہوا تو خزانے سے دو لاکھ بیس ہزار روپے لوٹے گئے اور قیدی چھڑا لیے گئے جن میں سکندر شاہ بھی تھا۔ وہ بڑا جوشیلا مولوی تھا اور فروری میں وہاں ہنگامہ بپا کرنے کی بنا پر اسے قید کیا گیا تھا۔ بین اور موجدار کہتے ہیں کہ سکندر شاہ مولوی احمد اللہ شاہ کا دوسرا نام تھا۔ لفٹننٹ ٹامس فیض آباد میں موجود تھا۔ جب وہاں انگریزی اقتدار کا تختہ اُلٹا تو انگریزوں کو کشتیوں میں سوار کر کے بھیج دیا گیا تھا۔ ان لوگوں پر راستے میں حملے ہوتے رہے۔ لفٹننٹ ٹامس اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص۳۷۔ [2] بین ص۱۸۶ موجدار ص۱۲۹۔ موجدار نے ... کے حوالے سے لکھا ہے کہ جنوری ۱۸۵۷ء میں مدراس کے اندر ایک اشتہار لگایا گیا تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ انگریزوں نے انصاف کے اصول سے انحراف کر لیا ہے اور ان کی چیرہ دستیوں کو روکنے کی صورت صرف ایک ہے یعنی جہاد۔ موجدار کے نزدیک یہ بھی غالباً احمد اللہ شاہ ہی کا کام تھا۔ ص۱۲۹

ندی عبور کرتا ہوا ملا گیا[1] کہ احمد اللہ شاہ اسی روز قید سے رہا ہوئے جس روز فیض آباد میں انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا گیا تو اسے ۸ جون ۱۸۵۷ء کا واقعہ سمجھنا چاہیے گویا وہ فروری یا مارچ اپریل میں گرفتار ہوئے۔ کچھ مدت تک ان کا علاج ہوتا رہا پھر مقدمہ چلا اور اغلب ہے جرم کی سنگینی کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ ابھی سزا کے اجرا کی نوبت نہ آئی تھی کہ ہنگامہ شروع ہو گیا۔

لڑائیاں کب شروع ہوئیں؟

اگرچہ انگریزی کتابوں میں احمد اللہ شاہ کو باغیوں اور ہمارے تصور کے مطابق مجاہدوں کا سردار مانا جاتا ہے لیکن روایتوں میں اس کا ذکر دسمبر ۱۸۵۷ء سے پیشتر نہیں آتا۔ اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاہ صاحب فیض آباد سے ۸ جون کو نکلے اور چھ مہینے انہوں نے ادھر ادھر پھر کر گزار دیے۔ قیصر التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی میں لکھنؤ پہنچ گئے تھے پھر ان کی بعض یورشوں کا ذکر بہ قید تاریخ ملتا ہے۔ مثلاً احمد اللہ شاہ فقیر:

> اپنے جذب جنوں سے الفاظ شاہی اور لفظ قتل و غارت بکا کرتا تھا۔ جب ہنگامہ ہوا سپاہ نے فقیر سمجھ کر چھوڑ دیا۔ جب فوج نے چاہا کہ اسے اپنا افسر کریں، ہمارا سرپرست ہو لیکن اس کی باتوں سے ڈرتے کہ ہندو سے بہت بیزار اور نفرت رکھتا ہے۔ اکثر اتہام ہنومان گڑھی کی توجہ۔ کہتے مبادا اس کی جہت سے پھر ہندو مسلمان میں صورت فساد نکلے۔ اس جہت سے افسر نہ کیا۔[2]

۱؎ میلی سن جلد سوم ص ۲۶۹

۲؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۰۲۵

بدیہی امور اس اقتباس کے الفاظ و انداز کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس کے مطلب کا خلاصہ ہم اپنے لفظوں میں یوں تیار کر سکتے ہیں:

۱- احمد اللہ شاہ کی عام حیثیت ایک مجذوب سے چنداں مختلف نہ تھی یا سمجھ لیجیے کہ اس پر مجذوبیت کی کیفیت وقتاً فوقتاً طاری ہوتی رہتی تھی۔ اس وقت وہ ایسے کلمات بے اختیار کہتا تھا۔ گویا زود گشت کا کوئی خوفناک واقعہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔

۲- احمد اللہ شاہ اگرچہ بظاہر فقیر اور حقیقتاً ابلیس تھا، تاہم اس کے مجاہدانہ عزم کا درجہ اہل فوج کے نزدیک اتنا بلند تھا کہ وہ انگریزی قیادت سے نجات حاصل کرنے کے بعد اسی کو سردار اور سالار بنا لینے کے خواہاں تھے۔

۳- اس ارادے کو لباس عمل پہنانے میں صرف اس وجہ سے توقف ہوا کہ احمد اللہ شاہ کو ہندوؤں سے نفرت تھی۔ اہل فوج نے سوچا کہ اگر اسے سردار بنا لیا گیا تو ممکن ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش کی نوبت آ جائے، حالانکہ وقت اور پیش نظر مقاصد زیادہ سے زیادہ اتحاد کے متقاضی تھے۔

آخری نتیجے کے سلسلے میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ غالباً یہ کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ معلوم ہے کہ آگرہ میں احمد اللہ شاہ کے وعظ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یکساں باعث کشش تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ بعد میں شاہ صاحب تنگوں سے جل کر لڑتے رہے۔ ان کے ساتھی رفیقوں میں بہت سے ہندو تھے اور لشکری زیادہ تر ہندو تھے بلکہ ہندو راجا کو ساتھ ملانے کی غرض سے پوائیں گئے تھے، جہاں ان کی شہادت ہوئی۔ ممکن ہے فیض آباد میں انھوں نے سید امیر علی شہید کے واقعے کو ایسے انداز میں پیش کیا ہو جس سے سمجھا گیا، انھیں ہندوؤں سے نفرت تھی یا ان کی سرداری میں ہندوؤں اور مسلمانوں

کے درمیان کشمکش کا اندیشہ تھا۔

ابتدائی معرکے

لکھنؤ میں جہاد آزادی کا آغاز ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہوا یعنی واقعہ یہ ہے کہ میرٹھ سے کم و بیش بیس روز بعد۔ سر ہنری لارنس اس زمانے میں اودھ کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس نے شروع ہی میں پیش آنے والے خطرے کی بنا پر ریذیڈنسی اور آس پاس کی مستحکم عمارتوں کو ملا کر انگریزوں کے لیے ایک حصار تیار کرا لیا تھا۔ باہر استحکامات بھی کر لیے تھے اور دفاعی مورچے بھی بنا لیے تھے۔

جب باہر سے خاصی دیسی فوج لکھنؤ پہنچ گئی تو ریذیڈنسی یا بیلی گارد کا محاصرہ کر لیا گیا اب اس میں وہ عمارتیں بھی تھیں جو سر ہنری لارنس نے انگریزوں کی سکونت کے لیے مخصوص کر لی تھیں۔ ۲۔جولائی کو ہنری لارنس مارا گیا۔ ۵۔جولائی کو برجیس قدر کی مسند نشینی کا اعلان ہوا۔ اس وقت سے مجاہدین کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں ان کے بارے میں قیصر التواریخ[1] کے ذکر کا انداز خاصا ناخوش گوار ہے۔ تاہم اس سے واقعات کا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ احمد اللہ شاہ ابتدا ہی سے جوش جہاد میں پیش پیش تھے اور انھوں نے متعدد حملے کیے۔ وہ ہر حملے میں مجاہدین کے ساتھ ہوتے تھے۔

۲۔ ۲۰۔جولائی کا حملہ اتنا سخت تھا کہ انگریز عورتیں تہ خانے میں جا چھپیں۔ ہر ایک کی نظر میں موت پھر گئی۔ احمد اللہ شاہ بیلی گارد کے پھاٹک کی آڑ میں اپنے مجاہدین کو پکارا کیے کہ بس اسی حملے میں سب انگریزوں کا کام تمام ہے۔

۳۔ ۳۱۔جولائی کو دھاوا ہوا تو احمد اللہ شاہ اس شان سے چلے کہ آگے آگے نقیب بولتا ہوا اور ڈنکا بجتا ہوا جا رہا تھا۔ مورچوں میں پہنچ کر آخر میں دھاوا کیا۔ بیلی گارد

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۳

کی دیوار کے نیچے پہنچ کر اسے کھودنا شروع کر دیا۔

اندر سے بم کے گولے آئے۔ بہت سے مارے گئے، باقی واپس ہوئے۔[1]

تفرقے کی مصیبت

تفرقے ہی کی مصیبت نے دہلی میں مجاہدین کی قوت مضمحل کر دی تھی۔ تفرقہ ہی لکھنؤ میں مجاہدین کے لیے گوناگوں آفتوں کا باعث بنا۔ حضرت محل کا داروغہ خاص نواب ممو خاں طبیعت کا تیز اور مزاج کا سخت تھا۔ اسے غالباً یہ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کر کے فوج کا خرچ چلائے چنانچہ اس نے بڑی سختی کے ساتھ لوگوں سے روپیہ وصول کرنا شروع کر دیا۔ احمد اللہ شاہ سے پاس شکایتیں پیش ہوئیں تو وہ عوام کی اس پریشانی کو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے منادی کرا دی کہ اب اگر کسی شخص کے گھر تحصیل کے لیے کوئی دستہ جائے تو ہمیں اطلاع دی جائے ہم اپنے آدمی بھیج کر جبراً روپیہ وصول کرنے والے کو گرفتار کر لیں گے۔

ساتھ ہی شہر کے مختلف حصوں میں پچاس آدمی مقرر کر دیے گئے کہ وہ شاہ صاحب کو بے توقف صحیح خبریں پہنچاتے رہیں۔ ممو خاں کو اس بات پر اتنا غصہ آیا کہ سپاہ کو حکم دے دیا، شاہ صاحب کو زندہ گرفتار کر لو یا ان کا سر کاٹ لاؤ۔ چنانچہ اس فوج نے شاہ صاحب کا محاصرہ کر لیا، جو گیارہ دن جاری رہا۔ اس اثنا میں رسد بھی بند تھی۔ آخر سپاہیوں نے ممو خاں کا حکم پس پشت ڈال کر شاہ صاحب کو شیش محل میں پہنچا دیا۔ ممو خاں نے دھمکی دی کہ شاہ صاحب کا ساتھ دینے والے سپاہیوں کو تنخواہ نہ ملے گی۔ سپاہیوں نے نوکری چھوڑ دی اور شاہ صاحب فیض آباد جانے کے لیے تیار ہو گئے۔[2]

واضح رہے کہ یہ سب کچھ اس حالت میں ہو رہا تھا جب انگریزوں کا ایک گروہ لکھنؤ میں محصور بیٹھا تھا اور اسے بچانے کی غرض سے فوج آنے والی تھی۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۳۲، ۲۳۳ [2] ایضاً ایضاً صفحہ ۳۰۰، ۳۰۱

غداری اور خیانت کی مثالیں

۹۔ نومبر ۱۸۵۷ء کو عالم باغ پر ایک یورش میں امجد علی خاں، احمد اللہ شاہ، اور احمد علی نے بڑی ہی جوانمردی اور جانبازی دکھائی۔

> اس وقت تلنگوں نے کہا کہ یہاں کے کارتوسوں میں مٹی بھری ہوئی ہے اور بدلے گولے گرا ب کے لرنج بھر رہے ہیں سبب یہ ہے کہ اہل کار انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں۔[1]

ممو خاں کو بھی تلنگوں نے پکڑ لیا اور معاملہ حضرت محل تک پہنچا۔ بیگم نے ممو خاں کو تو بچا لیا اور تلنگوں کو اجازت دے دی کہ جس شخص پر خیانت ثابت ہو اسے مار ڈالو چنانچہ میر محمد علی اور ایک متصدی مارے گئے جو گولے بنواتے تھے۔ صاحب قیصر التواریخ کا بیان ہے:

> اس امر میں تلنگوں کا گمان غلط نہ تھا۔ یہ کارروائی اپنی عاقبت اندیشی سمجھ کر کرتے تھے کہ اگر انگریزی عمل ہو جائے گا تو اسے خیرخواہی کو پیش کریں گے۔[2]

غور کیجیے کہ آزادی وطن کے مجاہدوں نے کن ناخوشگوار و ناسازگار حالات میں جان کی بازی لگائی۔ انھیں قدم قدم پر غداریوں سے سابقہ پڑتا تھا۔ بایں ہمہ پیش نظر مقصد اس درجہ عزیز و محبوب تھا کہ وہ ہر قسم کی پریشانیاں متواتر برداشت کرتے جاتے تھے۔

تنظیم کی مہلت

ہم حضرت محل کے حالات میں لکھ چکے ہیں کہ قومی قوتوں کی تنظیم اور نظم حکومت کے استحکام کی جیسی زریں مہلت لکھنؤ کو ملی، کسی

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صہ ۲۹۱ [2] ایضاً ایضاً صہ ۲۹۲

دوسرے شہر کو نہ ملی۔ انگریز ابتدائی دور ہی میں محصور ہو گئے تھے۔ دو مرتبہ ہیوے لاک نے ان کی کمک کے لیے قدم آگے بڑھایا، دونوں مرتبہ اُسے پیچھے ہٹنا پڑا پھر جنرل آوٹ رم اس کام کا مختار مقرر ہوا۔ اُس نے اور ہیوے لاک نے پیش قدمی کی اور لکھنؤ گئے، لیکن دونوں خود محصوروں میں شامل ہو گئے۔ بہرحال کالن کیمپل فوج لے کر آیا۔ اسے کان پور کے متعلق شدید خطرہ لگا ہوا تھا، لہٰذا عورتوں بچوں اور زخمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ آوٹ رم اور ہیوے لاک کو ریزیڈنسی سے نکال کر عالم باغ میں چھوڑ گیا جو شہر کے جنوب میں تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ ہیوے لاک نے وہیں وفات پائی۔ کان پور کی طرف سے مطمئن ہو کر کالن کیمپل آیا تو مارچ ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ فتح ہوا۔

احمد اللہ شاہ نے یہ پوری مدت لکھنؤ ہی میں گزاری اور لڑائیوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔

آوٹ رم کی پوزیشن

آوٹ رم کو اگرچہ عالم باغ میں بٹھا دیا گیا تھا، لیکن اُس نے حفاظت کی مصلحتوں کے پیشِ نظر اپنی فوج کا ایک حصہ باغ میں رکھا، باقی فوج کو نصف میل پیچھے ہٹا کر کھلے میدان میں معسکر قائم کیا جس کا میمنہ ایک قلعے کی وجہ سے محفوظ تھا۔ باقی حصوں میں غنیم کی یورشوں کے مطابق آہستہ آہستہ حفاظتی مورچے تیار کر لیے گئے۔ اس مقام میں ٹھہرنے سے ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ لکھنؤ اور کان پور کے درمیانی راستے کی حفاظت ٹھیک ٹھیک ہو سکتی تھی۔

مجاہدین نے جو حملے ابتدا میں کیے تھے، ان میں چونکہ زیادہ نقصان ہوا تھا، اس لیے وہ کچھ مدت تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اوائل دسمبر میں ان کی سرگرمیاں پھر تیز ہو گئیں۔ اس تیزی کی روحِ رواں صرف احمد اللہ شاہ کی ذات تھی . . . .

. . . .

شاہ صاحب کا نقشۂ یورش

احمد اللہ شاہ نے صورت حال کی خوب دیکھ بھال کی۔ اس کے بعد انگریزی فوج
[1] پر یورش کا ایک ایسا نقشہ تیار کیا، جسے میلی سن نے بھی ماہرانہ تسلیم کیا ہے۔ اگر فوج کی خاصی تعداد کے ساتھ پوری سرگرمی سے اس نقشے پر عمل کیا جاتا تو یقیناً انگریزوں کے لیے بڑی مشکلات پیش آتیں۔

نقشہ یہ تھا کہ میمنہ کی طرف سے حملہ ہو نہ سکتا تھا لہٰذا انگریزوں کے پورے محاذ کو براہ راست جنگ میں مصروف رکھا جائے۔ پھر یکایک ان کے میسرے پر حملہ کر کے اسے منقطع کر دیا جائے۔ بعد ازاں پل پر قابض ہو کر دونوں جانب سے قیامت کی آتش باری کی جائے یہاں تک کہ ایک بھی انگریز زندہ نہ رہے۔

اس نقشے کے مطابق دمدمے بننے شروع ہو گئے اور انھیں جہاں تک ضروری تھا پھیلا دیا گیا۔ ۲۲۔ دسمبر کو اصل نقشے کے مطابق باقاعدہ عمل شروع کیا۔ پیش قدمی کے طور پر ایک فوج کو انگریزوں کے عقب میں بھیج دیا گیا تاکہ کان پور کی طرف سے اس کا سلسلہ منقطع ہو جائے۔ افسوس کہ دو روز پیشتر ایک جاسوس نے پورے نقشے کو تفصیلاً آؤٹ رم کے پاس پہنچا دیا اور اسے دفاعی تدبیر اختیار کرنے کے لیے وقت مل گیا۔[1] اس طرح احمد اللہ شاہ کی یہ کوشش بارآور نہ ہوئی۔

ایک اور یورش

انگریزی بیانات مظہر ہیں کہ تین ہفتے تک پھر کوئی خاص سرگرمی نہ دکھائی گئی، البتہ توپوں کی گولہ باری جاری رہی۔ اس اثناء میں آؤٹ رم نے خالی گاڑیوں کا ایک قافلہ کان پور کی طرف بھیجا اور ایک
[2] فوج بھی ساتھ کر دی۔

۱؎ میلی سن جلد چہارم صفحہ ۲۴۰، ۲۴۱ +

مجاہدین نے پہلے سے منصب علی کو انگریزوں کے عقب میں متعین کر رکھا تھا۔ پھر لکھنؤ سے اسے خاصی کمک بھی مل گئی تاکہ قافلے کو روک لیا جائے۔ اس لیے آؤٹ رم کو اپنی مختصر سی فوج میں سے ایک حصہ حفاظت کے لیے ساتھ بھیجنا پڑا تھا۔ اس طرح اس کی پوزیشن خاصی کمزور ہوگئی۔ ١٢۔ جنوری کو مجاہدین نے آؤٹ رم پر انتہائی شدت سے حملہ کیا، لیکن انگریزی بیانات کے مطابق یہ بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوا۔ مولانا احمد اللہ شاہ اس یورش میں بھی پیش پیش تھے[1]

قافلے پر حملے کا اعلان

١٢۔ جنوری کی یورش بے نتیجہ رہنے کے بعد احمد اللہ شاہ نے اعلان کیا کہ رسد کے قافلے پر حملہ کر کے اسے لکھنؤ لایا جائے گا۔ چنانچہ ١٤۔ جنوری کو وہ ایک فوج لے کر نکلے اور چکر کاٹ کر ایک ایسے مقام پر جم گئے جہاں سے قافلۂ رسد پر کامیاب حملہ ہو سکتا تھا۔ ان کی اس نقل و حرکت کی بھی پوری خبریں جاسوسوں نے بروقت آؤٹ رم کو پہنچا دی تھیں۔ چنانچہ کھلے میدان میں لڑائی ہوئی، جس میں مولانا احمد اللہ شاہ زخمی ہوئے اور میلی سن کے بیان کے مطابق بمشکل گرفتاری سے بچے[2]

لکھنؤ کی تسخیر

اس کے بعد بھی ترکتازوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ مثلاً ١٥۔ فروری اور ٢٢۔ فروری کو بڑی سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ٢٥۔ فروری کو نہایت شدید حملہ کیا گیا۔ پھر انگریزی فوج کے پاس بھاری کمک پہنچ گئی۔ نیپال کی فوج بھی آگئی اور مجاہدین کے لیے کامیابی کے امکانات بہت کم رہ گئے۔ بایں ہمہ جس شخص نے آخری دم تک ہمت نہ ہاری وہ صرف احمد اللہ شاہ تھے یا شہزادہ فیروز شاہ۔ آخر انگریزوں نے لکھنؤ پر فیصلہ کن حملہ کر دیا۔ قدم بہ قدم بڑھتے گئے۔ ٢١ مارچ تک شہر مجاہدین سے

---

[1] میلی سن جلد چہارم ص٢٤٤ ۔ [2] ایضاً ایضاً ص٢٤٥ ۔

خالی ہو چکا تھا لیکن احمد اللہ شاہ بدستور وہاں بیٹھے تھے۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ ایک مستحکم عمارت میں دو توپیں نصب کر رکھی تھیں اور وہ انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ایک جیش لگرڈ[1] کی سرکردگی میں ان کے خلاف بھیجا گیا:

باغیوں نے جیسے عزم اور جیسی استقامت کا اظہار اس موقع پر کیا، اس کی مثالیں شاذ ہی ملیں گی۔ انھوں نے بڑی بہادری و جوانمردی سے مدافعت کی اور اس وقت تک باہر نہ نکالے جا سکے جب تک انھوں نے ہمارے بہت سے آدمی قتل نہ کر لیے اور ان سے بدرجہا زیادہ کو مجروح نہ کر دیا۔ جب وہ انجام کار نکالے گئے تو بریگیڈیر کیمبل کا رسالہ سامنے آ گیا۔ جس نے چھ میل تک ان کا تعاقب کیا اور خاصا نقصان پہنچایا لیکن مولوی بچ نکلا۔[2]

احمد اللہ کے کمالات

لکھنؤ سے نکلنے کے بعد احمد اللہ شاہ نے ایک خاصا بڑا لشکر باڑی میں جمع کر لیا تھا، جو لکھنؤ سے بائیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ہوپ گرانٹ کو حکم ملا کہ وہ باڑی جائے۔ وہاں مجاہدین کو منتشر کرے پھر محمود آباد ہوتا ہوا گھاگھرا کے ساتھ ساتھ بٹول پہنچے جہاں سے اطلاع ملی تھی کہ بیگم حضرت محل چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ مقیم ہے۔

ہوپ گرانٹ ۱۱-۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء کی صبح کو لکھنؤ سے روانہ ہوا۔ وہ کوئی چھ میل کا فاصلہ طے کر کے ایک جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ پہرے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس اثنا میں احمد اللہ شاہ کی فوج کے چند بہادر آ گئے۔ انگریزی پہریدار نے ٹوکا اور پوچھا کہ کون

---

[1] LUGARD • [2] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۳۶۱

ہو تو اُنھوں نے انتہائی بے تکلفی سے جواب دیا کہ ہم ۱۲ع بے قاعدہ فوج کے سپاہی ہیں۔

یقیناً وہ ۱۲ کے سپاہی تھے لیکن یہ سپاہ اپنے انگریز کمانڈر کو قتل کر کے جولائی ۱۸۵۷ء میں سرکشی اختیار کر چکی تھی۔ پہریدار کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ۱۲ع کون سی پلٹن ہے۔ اُس نے آگے بڑھنے کی اجازت دے دی۔ من چلے سواروں نے انگریزی فوج کی پوری کیفیت کا جائزہ لیا اور سارے حالات معلوم کر کے اطمینان سے اپنے سردار مولانا احمد اللہ شاہ کے پاس باڑی پہنچ گئے۔ یقیناً دیدہ دلیری کی ایسی مثالیں بہت کم ملیں گی اور سپاہیوں کو یہ تحیر آفریں ہنرمندیاں احمد اللہ شاہ نے سکھائی تھیں۔

جنگ باڑی

انگریزی فوج کی پوری کیفیت معلوم کر لینے کے بعد احمد اللہ شاہ نے نقشۂ جنگ تیار کیا جو نہایت عمدہ تھا۔ وہ باڑی سے انگریزی فوج کی جانب روانہ ہوئے۔ چار میل پر ایک گاؤں ملا جس کے سامنے سے ایک ندی گزرتی تھی اور اس ندی کے کنارے بہت اونچے تھے۔ شاہ صاحب نے اپنی پیادہ فوج کناروں کے اندر جا بجا اس طرح بٹھا دی کہ انگریزی فوج کو قریب پہنچنے تک اس کے متعلق کچھ اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ رسالے کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے دائیں بائیں بھیجا اور ہدایت کر دی کہ چکر کاٹ کر انگریزی فوج کے بازوؤں اور عقب کو روک لیں۔ مقصود یہ تھا کہ رسالہ انگریزی فوج کو دائیں بائیں یا پیچھے کی طرف بچ نکلنے سے روکے گا، سامنے سے پیادہ فوج حملہ آور ہوگی۔ اس طرح پورا لشکر تباہ کر دیا جائے گا۔

رسالے نے بڑا کمال دکھایا اور رات کی تیرگی میں کام پورا کر دیا۔ انگریزی فوج ۱۲۔ اپریل کی صبح کو ...یہ فکری سے روانہ ہوئی۔ وہ تباہی کے غار تک پہنچ رہی تھی کہ رسالے والوں سے ایک خوفناک غلطی سرزد ہوئی۔ اُنھیں انگریزی فوج کے عقب میں دو توپیں نظر آئیں، جن کی حفاظت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا۔ ان احمقوں نے اصل نقشۂ جنگ کو

کامیاب بنانے کے بجائے سالان وڈ توپوں پر عجلت سے قبضہ کر لینا چاہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز افسر صورت حال پر متنبہ ہو گئے۔ اب رسالے والوں کو خیال آیا کہ ابتدائی نقشے کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں لیکن یہ ممکن نہ تھا اس لیے کہ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی۔ چنانچہ یہ نقشہ محض رسالے والوں کی ایک اتفاقی غلطی کے باعث بے نتیجہ رہا اور احمد اللہ شاہ کو باڑی سے نکل کر شاہ جہان پور کا رُخ کرنا پڑا، جو اُن کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا آخری میدان تھا۔

شاہ جہان پور

شاہ صاحب شاہ جہان پور پہنچے تو بڑے اطمینان سے وہاں بیٹھ گئے۔ نانا بھی اس وقت وہیں تھا۔ ۳۰ اپریل کو کالن کیمبل وہاں فوج لے کر پہنچا تو مجاہدین شاہ جہان پور کو خالی کر دینا مناسب معلوم ہوا۔ نانا کی رائے یہ تھی کہ تمام سرکاری عمارتیں مسمار کر دی جائیں تاکہ انگریزوں کو کھلی جگہ میں دن بسر کرنے پڑیں۔ شاہ صاحب نتیجے پر اس لیے راضی ہوئے تھے کہ انگریز شاہ جہان پور پر قبضہ کر لینے کے بعد بریلی جائیں گے اور زیادہ بڑی قوت ساتھ لے جائیں گے۔ وہاں انھیں خاصے سخت مقابلے سے سابقہ پڑے گا اور درمیانی مدت میں شاہ جہان پور پر آسانی سے دوبارہ قبضہ کیا جا سکے گا۔

چنانچہ یہی ہوا۔ کالن کیمبل نے تھوڑی سی فوج شاہ جہان پور میں چھوڑی۔ کرنل ہیل[1] کو اس کا انچارج بنایا اور خود بریلی چلا گیا۔

احمد اللہ کی یورش

اب مولانا احمد اللہ شاہ نے بڑی بھاری قوت سے شاہ جہان پور پر یورش کی۔ ہیل نے اپنا خیمہ درختوں کے ایک جھنڈ میں لگایا تھا جیل خانے کو خوب مستحکم کر لیا تھا۔ وہاں رسد بھی جمع کر لی تھی۔ میلی سن

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۲۴۷، ۲۴۸۔ [2] HALE

نے لکھا ہے کہ احمد اللہ شاہ اگر سیدھا شاہ جہاں پور پہنچ جاتا، تو ہیل کے لیے بڑی مشکلات پیش آتیں۔ لیکن سوءِ اتفاق سے شہر چار میل رہ گیا تو احمد اللہ شاہ نے فوج کو سستانے کا موقع دے دیا۔ اس اثناء میں جاسوسوں نے ہیل کو اطلاع دے دی۔ وہ درختوں کے جھنڈ سے اٹھ کر جیل خانے کی عمارت میں جا بیٹھا۔ اور اسے قلعے کے طور پر استعمال کیا۔ احمد اللہ شاہ نے شہر میں پہنچ کر توپیں مناسب مقامات پر نصب کر لیں اور گولہ باری شروع کر دی۔ ۷ مئی کو کالن کیمپل صورت حالات سے باخبر ہوا۔ اس وقت بریلی فتح ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً ایک فوج کمک کے لیے بھیج دی۔ اس اثناء میں احمد اللہ شاہ کو بھی کمک مل چکی تھی۔ ۱۰ مئی تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر احمد اللہ شاہ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ محمدی پہنچے پھر اسے بھی خالی کر کے اودھ میں داخل ہو گئے۔

راجا پوائیں

اب ضروری یہ تھا کہ قومی قوتوں کو از سر نو منظم کیا جاتا۔ اس سلسلے میں بھی تمام سرگرمیوں کا قرعہ احمد اللہ شاہ ہی کے نام پڑا۔ راجا پوائیں کا علاقہ بندھیل کھنڈ اور اودھ کی سرحد پر واقع تھا اور راجا تعاون کے لیے تیار ہو جاتا تو تنظیم میں اک گونہ سہولت پیدا ہو سکتی تھی۔ احمد اللہ شاہ نے فیصلہ کیا کہ وہ خود راجا پوائیں سے مل کر اس بارے میں بات چیت کرے گا۔ اب مختلف بیانات پیش نظر رکھیے:

میلی سن نے لکھا ہے کہ احمد اللہ شاہ حضرت محل کے حکم کے مطابق پوائیں گیا تھا، تاکہ وہاں کے راجا جگن ناتھ سنگھ[1] کو انگریزوں کے خلاف نئی جمعیت میں شامل ہونے کی ترغیب دے اور راجا خاصا ذی اثر مانا جاتا تھا۔ شاہ صاحب نے روانگی سے پیشتر اپنا ایک قاصد بھیج دیا تھا اور راجا نے بات چیت کے لیے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔[2]

---

[1] راجا کا صحیح نام یہی ہے، نہ کہ بلدیو سنگھ جیسا کہ بعض لوگوں نے لکھا ہے۔ بلدیو سنگھ راجا کے بھائی کا نام تھا۔ [2] میلی سن جلد چہارم ص ۴۲۔

۲۔ ہومز کہتا ہے کہ راجا کے پاس چند دیسی افسر پناہ گزین تھے، جنھوں نے انگریزوں کے ہاں ملازمت کر رکھی تھی۔ احمد اللہ اس غرض سے پوایَں گیا تھا کہ افسروں کی حوالگی کا مطالبہ کرے۔[1]

۳۔ ساورکر کا بیان ہے کہ احمد اللہ اودھ میں جو نیا طوفان بپا کرنا چاہتا تھا، اس کے سلسلے میں راجا پوایَں کی معمولی امداد بھی خاصی مؤثر ہوتی۔ چنانچہ مولانا نے حضرت محل کا مُہری پروانہ راجا کے پاس بھیج دیا۔ یہ چھوٹا سا راجا جسم کا موٹا اور بے ڈھنگ، حد درجہ کاہل اور سست، عقل و دانش میں فریبا تھا۔ میدانِ جنگ کا ذکر سنتے ہی سراسیمہ ہو گیا۔ وہ جتنا بزدل تھا، اتنا ہی دغاباز تھا۔ فوراً جواب دیا کہ مولانا احمد اللہ خود مجھ سے ملیں، اس دعوت پر مولانا کو پوایَں جانا پڑا۔[2]

شہادت

بہرحال مولانا احمد اللہ شاہ ۵۔ جون کو ہاتھی پر سوار ہو کر پوایَں گئے۔ تھوڑے سے آدمی ساتھ تھے۔ پوایَں پہنچے تو یہ دیکھ کر متحیر رہ گئے، کہ قلعے کے دروازے بند تھے۔ فصیل پر سپاہی جا بجا لڑنے کے لیے تیار تھے۔ خود راجا، اس کا بھائی اور مسلح آدمی ان ستونوں کے پیچھے کھڑے تھے، جو بڑے دروازے کے اوپر تھیں۔ گویا مقابلے کی پوری تیاری کر لی گئی تھی:

> ان ناسازگار حالات میں بات چیت شروع ہوئی۔ مولوی کو بہت جلد پتہ چل گیا کہ جب تک راجا کو خوب ہراس زدہ نہ کیا جائے گا، نرے زورِ کلام سے کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوگا۔ ہراس پیدا کرنے کی غرض سے اُس نے اپنے فیل بان سے کہا کہ ہاتھی کو آگے بڑھاؤ اور دروازہ

---

[1] ہومز صفحہ ۵۱۲ ۔ [2] ساورکر صفحہ ۳۶۹ ۔

توڑ ڈالو۔ ہاتھی آگے بڑھا اور اُس نے اِس زور سے ٹکر
ماری کہ ایک دو لمحوں میں دروازہ کھل جاتا۔ اس نازک وقت
میں راجا کے بھائی نے موقعے کی مجبوری کے پیش نظر بندوق
اٹھائی اور مولوی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے ساتھی پلٹے
اور فرار ہو گئے۔[1]

ہومز کہتا ہے کہ مولوی نے مقابلے کی صورت دیکھی تو بات چیت شروع کر دی:

لیکن اس پر جلد واضح ہو گیا کہ زور و قوت سے کام لیے بغیر
داخلہ ممکن نہیں، لہٰذا اس نے مہاوت کو حکم دیا کہ ہاتھی سے دروازے
پر ٹکر لگوائے۔ اس وحشی حیوان نے فصیل شکن آلے کی طرح
زور سے ٹکر ماری۔ دروازہ پھٹ کر گرنے ہی والا تھا کہ
راجا کے ملازموں نے ایک باڑھ ماری اور مولوی کو
ہلاک کر ڈالا۔[2]

ساورکر کا بیان

ساورکر نے لکھا ہے کہ احمد اللہ شاہ نے راجا اور اس کے بھائی کو جنگی تیاری کے ساتھ کھڑے دیکھا تو صورتِ حال کا اندازہ کر لیا لیکن بے باکانہ قدم آگے بڑھایا اور بات چیت شروع کر دی:

بدبخت راجا جو قلعے کی دیوار پر کھڑا تھا، اس بہادر
قلب کی صدا سے درد کا صحیح اندازہ کب کر سکتا تھا، جس نے
عزم مصمم کر رکھا تھا کہ اس وقت تک تلوار نہ چھوڑوں گا۔
جب تک یا تو اجنبی اس سرزمین سے نہ نکل جائیں گے یا

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۳۵۔ [2] ہومز صفحہ ۵۱۲، ۵۱۳۔

خود میرے سر پر تاج شہادت نہ رکھا جائے گا۔ جب یہ حقیقت
واضح ہوگئی کہ بزدل راجا بطیب خاطر دروازہ کھولنے کے لیے
تیار نہیں تو مولوی صاحب نے مہاوت کو حکم دیا کہ جس ہاتھی پہ
میں بیٹھا ہوں اُسے آگے بڑھاؤ اور اس سے قلعے کا دروازہ
تڑواؤ۔ طاقتور جانور کی ایک اور ضرب لگ جاتی تو دروازہ
کھل جاتا، لیکن راجا کے بھائی نے شست باندھی اور اس
بدبخت بزدل نے احمد اللہ شاہ کو شہید کر ڈالا[1]

غداری کا انعام

اس واقعے کے بعد دونوں بھائیوں نے مولانا کا سر کاٹا اور اسے کپڑے میں لپیٹ کر تیزی سے شاہ جہان پور۔ وار ہو گئے مجسٹریٹ کے بنگلے پر پہنچے تو وہ دوپہر کے کھانے پر بیٹھ چکا تھا۔ انھوں نے اندر جا کر بنڈل کھولا اور اس بے مثال مجاہد آزادی کا سر انگریز مجسٹریٹ کے قدموں پر ڈال دیا۔ اس میں سے خون جاری تھا:

دوسرے دن مہذب انگریزوں نے اس مجاہد کا سر کوتوالی
کی عمارت پر لٹکوا دیا جس نے ایسی شجاعت و مردانگی اور
ایسی بلند ہمتی سے جنگ کی تھی اور پوائیں کے بھاری بھرکم
وحشی کو غداری کے ملعون فعل کے معاوضے میں پچاس ہزار
روپے دیے۔[2]

عجیب بات یہ ہے کہ یہی راجا پوائیں تھا جس نے ابتدا میں انگریزوں کو اپنے ہاں پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ نہ ابن الوقت راجا کو رنگ بدلنے میں دیر لگی اور

---

[1] ساورکر صفحہ ۳۶۹ / ۳۷۰ [2] ساورکر صفحہ ۳۷۰۔ پچاس ہزار روپے یا پانچ ہزار پونڈ کے انعام کا اعلان گورنر جنرل نے پہلے سے کر رکھا تھا۔

نہ ابن الوقت انگریزوں کو اس کامیابی اور سرپرست بن جانے میں تکلف محسوس ہوتا۔

یہاں یہ حقیقت بھی بیان کر دینی چاہیے کہ انگریزوں نے ذاتی اغراض کی بنا پر پوائیں کے راجا کو انعام سے نوازا لیکن اہل ملک نے اسے کبھی معاف نہ کیا، خواہ وہ مولانا احمد اللہ شاہ کے ہم نوا تھے یا نہ تھے۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ اودھ اور روہیل کھنڈ کی درمیانی سرحد کے دونوں جانب جو زمیندار مقیم تھے، ان میں سے بہتیروں نے:

راجا پوائیں کے طرزِ عمل پر سخت غصے اور ناراضگی کا اظہار کیا اور انھوں نے حتی الامکان بدترین غداری کے اس فعل کی سزا دینے کے لیے ہتھیار سنبھال لیے[1]

موجمدار نے خوب لکھا ہے "تقدیر کی یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ مادرِ ہند کا ایسا محبِ وطن سپوت ان دشمنوں کے ہاتھ سے نہ مرا، جن کے خلاف وہ لڑتا رہا بلکہ اپنے ہم وطنوں کے ہاتھ سے مرا، جن کی حد در شایستہ خدمات اس نے انجام دی[2]"

اعترافِ فضائل اب آپ اہلِ وطن کی زبان سے نہیں بلکہ دشمن انگریزوں کی زبان سے احمد اللہ شاہ کے فضائل کا اعتراف سنیں:

۱۔ میلی سن کہتا ہے، "مولوی بڑا ہی غیر معمولی آدمی تھا۔ سر ٹامس سٹیلس اس کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے متعدد موقعے ملے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ "مولوی عظیم الشان صلاحیتوں کا آدمی تھا۔ حوصلے اور ہمت میں بے باک، عزم میں استوار و پایدار اور باغیوں میں یقینی طور پر بہترین سپاہی" یہ اندازہ کیا جا چکا ہے اور اس کے

---

[1] میلی سن جلد پنجم ص ۱۹۱ ۔ [2] موجمدار ص ۱۱۱ ۔

تھا۔ ایسے وجوہ موجود ہیں کہ غدر سے پیشتر مولوی ہندوستان کا دورہ کرتا رہا۔ مقصود یہ تھا کہ اپنے ہم وطنوں کے دل میں اس اقدام کے لیے جذبہ پیدا کرے، جس کا منصوبہ سازش کے بانی سوچے بیٹھے تھے۔ اس کی فوجی صلاحیت کے بہت سے ثبوت ملے لیکن اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ صرف وہی تھا جس نے سر کالن کیمبل سپہ سالار کی تدابیر دو مرتبہ ناکام بنا دیں۔[1] پھر لکھتا ہے:

> اگر محبِ وطن اسے کہتے ہیں جو اپنے وطن کی برباد شدہ آزادی کے حصول کے لیے سازشیں کرے اور لڑے تو یقیناً مولوی ایک سچا محبِ وطن تھا۔ اس نے اپنی تلوار کو میدانِ جنگ سے باہر قتل کے داغ سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ اس نے قتل کے کسی بھی واقعے سے چشم پوشی گوارا نہ کی۔ وہ ان اجنبیوں کے خلاف مردانگی، بلند ہمتی اور استقامت سے میدانِ جنگ میں لڑتا رہا، جو اس کے وطن پر مسلط ہو گئے تھے اور اس کی یاد تمام قوموں کے مخلصوں اور بہادروں کی جانب سے عزت و احترام کی مستحق ہے۔[2]

ہومز کہتا ہے:

> مولوی اگرچہ حیدر علی اور سیواجی کا ہم پایہ نہ تھا۔ لیکن غدرِ ہند میں جو آدمی ہمارے خلاف لڑے اُن میں سے وہ غالباً سب سے بڑھ کر قابل اور یقیناً سب سے زیادہ صاحبِ عزیمت تھا۔[3]

---

[1] میلی سن جلد چہارم صفحہ ۳۷۹ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۳۸۱ ۔ [3] ہومز صفحہ ۵۱۰ ۔

میکسیموٹن[1] احمد اللہ کی شہادت اور راجا پوایں کو پچاس ہزار کے انعام کا ذکر کرتا ہوا کہتا ہے :

> برطانیہ کے اس سخت ترین دشمن کا غیر متوقع انجام سرکالن
> کے تمام بھاری جیوش کے مقابلے میں روہیل کھنڈ کے اندر
> امن قائم کرنے کے لیے زیادہ موثر ثابت ہوا۔[2]

موجیلار بالکل بجا کہتا ہے کہ احمد اللہ شاہ تمام تحسینات کا مستحق تھا۔ تمام لیڈروں میں صرف وہ تھا جس کی اپنی کوئی غرض نہ تھی اور صرف وہ تھا جسے انگریزی حکومت کے خلاف ذاتی شکایت کوئی نہ تھی[3]۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی یہی فرماتے ہیں کہ چند مستثنیات کے سو سب لوگوں نے ذاتی وجوہ سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں حصہ لیا اور مستثنیات میں سے نہایت ممتاز دو شخص ہیں، ایک احمد اللہ اور دوسرا تانتیا ٹوپے[4]

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ امن فوجی قوت کے بل پر قائم نہ ہوا۔ صرف اس وجہ سے قائم ہوا کہ احمد اللہ شاہ کے بعد ملکی قوتوں کو منظم کر کے لڑانے والا کوئی نہ رہا۔

مولانا فضل حق

مولانا فضل حق مرحوم خیرآبادی نے بھی مولانا احمد اللہ کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں :

> اس موقع پر متسلط نصاریٰ کے خلاف لڑنے کے لیے
> ایک اور ہمت کا حامل اٹھ کھڑا ہوا اس نے خیرات و مبرات
> اور سعادات و حسنات کا خاصا ذخیرہ فراہم کر لیا تھا۔ وہ بڑا
> ہی پاک طینت، صاف باطن، متقی، پرہیزگار، بہادر رسول طاہر

۱۔ MAC MUIN ؛ ۲۔ سرجارج بیکن کی کتاب ص ۲۴۷ ؛ ۳۔ موجیلار ص ۱۶۱

۴۔ سین کی کتاب کا پیش لفظ ر ۱۷

اور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہم نام تھا۔ اس نے نصاریٰ کے لشکر پر حملہ کر کے پہلے ہی حملے میں شکست دے دی۔[1]

اس کے بعد مولانا فضل حق شاہ صاحب کی شہادت کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ انگریز بھاگ کر ایک قصبے کے ہندو زمیندار کے مستحکم حصار میں پناہ گزین ہوئے اور اپنے اکابر کے پاس پیغام بھیج کر مدد مانگی۔ چنانچہ مدد آگئی۔ احمد اللہ شاہ سے کافر زمیندار نے داؤ کھیلا۔ قسمیں کھا کر اطمینان دلایا کہ جب دونوں جماعتیں یعنی مجاہدین اور انگریز کے درمیان مقابلہ شروع ہوگا تو میں چار ہزار کا لشکر لے کر مجاہدین کی امداد کے لیے آجاؤں گا۔ احمد اللہ شاہ نے اس وعدے پر اعتماد کر کے تھوڑے سے آدمیوں کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ ہوا یہ کہ سامنے سے نصاریٰ نے گولیاں برسائیں۔ پیچھے سے اس غدار زمیندار نے آتشباری کی۔ اس طرح احمد اللہ شاہ نے شہادت پائی اور ان کی جماعت نے بھی سردار کے نقش قدم پر چل کر جام شہادت نوش کیا۔

شہادت کی سابقہ کیفیت کے مقابلے میں یہ زیادہ قرین قیاس ہے، تاہم عام روایت وہی ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یہ روایت صرف مولانا فضل حق کی ہے۔

مولانا کا حلیہ

میلی سن نے احمد اللہ شاہ کا حلیہ بھی بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف کا قد لمبا، جسم دبلا پتلا لیکن خوب مضبوط تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی، بھویں گھنی، ناک کا بانسہ اونچا اور جبڑے پتلے تھے۔[2] مفتی انتظام اللہ نے اتنا اضافہ کیا ہے کہ سر کے بال کالے تھے اور زلفیں دونوں کاندھوں پر لٹکی رہتی تھیں۔[3]

---

[1] الثورۃ الہندیہ یا باغی ہندوستان ص۲۱۲۔

[2] میلی سن جلد چہارم ص۲۶۹۔

[3] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص۲۴۳۔

بادشاہی کا اعلان کہا جاتا ہے کہ احمد اللہ شاہ نے ایک وقت میں اپنی بادشاہی کا اعلان بھی کر دیا تھا اور سکہ مضروب ہوا جس پہ یہ بیت منقوش تھی۔ ۱

سکہ زد بر ہفت کشور خادم محراب شاہ
حامی دین محمد احمد اللہ بادشاہ [۱]

ہومز نے بھی لکھا ہے کہ احمد اللہ شاہ نے شاہ ہندوستان کا خطاب اختیار کر لیا تھا:

> اور اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ حکمرانی کی قابلیت کے لحاظ سے ساتھی باغیوں کے مقابلے میں وہ بادشاہی کے لیے سب سے بہتر استحقاق رکھتا تھا۔ [۲]

۲ مجھے اس دعوے کو صحیح ماننے میں تامل ہے۔ مولانا جب تک لکھنؤ میں تھے، برجیس قدر وہاں کا حاکم تھا اور حضرت محل سارے معاملات کی مختار تھی۔ شاہ جہان پور کے دور میں بھی حضرت محل موجود تھی لہٰذا مولانا کے لیے شاہی کا اعلان بے محل تھا۔ نیز انھیں ایسی کسی شے سے کوئی وابستگی نہ تھی۔ وہ صرف وطن کو اجنبی تسلط سے نجات دلانا چاہتے تھے۔ بایں ہمہ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت میں عہدے کی حرص کے لیے نہیں بلکہ قومی قوتوں کی تنظیم کے لیے اعلان شاہی ناگزیر ہو گیا، تاہم محولہ بالا دعویٰ قطعاً قابل قبول نہیں۔

۱

---

[۱] قیصر التواریخ، جلد دوم ص ۲۶۸ [۲] ، ، ، ص ۱۲۰

ڈھونڈوپنت ناتا

میراث مرہٹوں کے آخری پیشوا باجی راؤ ثانی نے ۱۸۱۸ء میں انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے تو اس کے لیے آٹھ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ مقرر ہوا تھا[1] ساتھ ہی کہہ دیا گیا تھا کہ وہ شمالی ہند میں اپنے قیام کے لیے جو جگہ مناسب سمجھے تجویز کرے۔ باجی راؤ نے بٹھور کو پسند کیا جو کان پور سے چند میل کے فاصلے پر مغربی سمت میں دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ حکومت انگلشیہ نے چھ میل کے حلقے کا علاقہ اس کے حوالے کر دیا۔ اور حد بندی کے لیے جا بجا پتھر نصب کر دیے۔

باجی راؤ نے چونتیس سال بٹھور ہی میں گزارے۔ اسے بیٹے کی بڑی آرزو تھی، اس غرض سے چھ شادیاں ۱۸۱۷ء سے پیشتر پونا میں کیں اور پانچ بٹھور میں، لیکن نرینہ اولاد سے محروم رہا۔ بالآخر اس نے تین بچوں کو متبنیٰ بنا لیا: اوّل ڈھونڈوپنت ناتا، دوم پنڈورنگ راؤ، سوم گنگادھر راؤ (عرف بالا راؤ)۔ پنڈورنگ راؤ اس سے پہلے فوت ہو چکا تھا، لہٰذا اس کے بیٹے سداشیوپنت عرف راؤ صاحب کو باپ کی جگہ مل گئی۔ چنانچہ باجی راؤ نے اپنے وصیت نامے میں ان تینوں کا ذکر صریحاً کیا تھا آخر میں لکھ دیا تھا کہ میرے بعد میرا بیٹا ڈھونڈو پنت

---

[1] مرہٹوں کی تاریخ (انگریزی) از کنکیڈ، جلد سوم صفحہ ۲۲۲۔

نانا "مکھ پردھان" ہوگا اور اسی کو پیشواؤں کی گدی کا واحد مالک سمجھا جائے۔[۱] گویا نانا اگرچہ پیشواؤں کی نسل سے نہ تھا لیکن اسے میراث پیشواؤں ہی کی مل گئی۔

خاندان

نانا کے والد کا نام مادھو راؤ نرائن بھٹ بتایا گیا ہے۔ وہ بہت ہی غریب برہمن تھا۔ وینی گاؤں اس کا اصل وطن تھا، جو بھور گھاٹ[۲] کے قریب ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ باجی راؤ پیشوا کے دل میں برہمنوں کی بڑی قدر ہے، ان کا احترام بھی کرتا ہے اور انھیں وہاں بھی دل کھول کر دیتا ہے تو اپنے وطن مالوف سے نکل کر ۱۸۲۷ء کے اوائل میں وہ بٹھور پہنچا۔ ۶ جون ۱۸۲۷ء کو پیشوا نے مادھو راؤ نرائن بھٹ کے بیٹے ڈھونڈو پنت کو اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ اس سے گراں تر اعزاز کی امید مادھو راؤ نرائن بھٹ کو کیا ہوسکتی تھی؟

ساورکر نے لکھا ہے کہ اس بچے نے باجی راؤ کا دل موہ لیا تھا اور تمام درباری اسے بہت پیار کرتے تھے۔ بچے کے جوہر ذہانت، اس کے متین انداز اور غیر معمولی سمجھ بوجھ نے باجی راؤ پر اتنا گہرا اثر ڈالا کہ اسے متبنیٰ بنانے کا فیصلہ کر لیا اور ۷ جون کو گود میں لینے کی رسم ادا ہوئی۔[۳]

نانا کی تاریخ پیدائش

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ نانا کی تاریخ پیدائش کیا تھی؟ اس بارے میں کسی بھی کتاب نے تعین نہیں کیا۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ متبنیٰ بنائے جانے کے وقت نانا کی عمر صرف اڑھائی سال کی تھی۔[۴] گویا اس کی پیدائش ۱۸۲۴ء کے اواخر یا ۱۸۲۵ء کے اوائل میں ماننی چاہیے۔ کیئی کا بیان ہے کہ جب باجی راؤ کا انتقال ہوا، یعنی ۱۸۵۱ء میں تو اس کا وارث ستائیس برس کا تھا۔[۵] اس سے

---

[۱] کیئی جلد اول ص۱۰۱ حاشیہ۔ [۲] یہ مقام پونا کے شمال مغرب میں اس ریلوے لائن پر ہے جو بمبئی سے پونا جاتی ہے اور تقریباً دونوں کے وسط میں ہے۔ [۳] ساورکر ص۲۳ [۴] ایضاً ایضاً۔

[۵] کیئی جلد اول ص۱۰۱۔

سے بھی ۱۸۲۴ء یا ۱۸۲۵ء ہی کی تاریخ درست ثابت ہوتی ہے۔ گویا نانا پیدا وِنی گاؤں میں ہوا، لیکن اس کی پوری تربیت بٹھور کے محل میں ہوئی۔

ہم بے تکلف یقین کر سکتے ہیں کہ نانا بہت ہی خوب صورت اور من موہن ہو گا، ورنہ ایک غریب برہمن کے بچے کو دیکھتے ہی باجی راؤ نہ محض اپنی دولت بلکہ اپنی مسند کا بھی وارث بنانے کے لیے کیوں تیار ہو گیا؟ بچے کی عمر ایسی نہ تھی کہ اس کی کسی نمایاں خدمت پر دل خوش ہوا ہوتا یا اس کے فہم و فکر، عقل و دانش اور تدبر و تدبیر نے متاثر کیا ہوتا۔ جو شے متاثر کر سکتی تھی، وہ صرف بچے کی شکل و صورت تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ بڑی ہی دلکش اور غیر معمولی طور پر جاذبِ نظر ہو گی۔[1]

تربیت

زمانے کے مذاق اور رواج کے مطابق نانا کی تربیت اور تعلیم ہوئی۔ دوسرے علوم و السنہ کے علاوہ اس نے انگریزی بھی پڑھی ہو گی۔ کان پور کے واقعات کے سلسلے میں ایک انگریز کا ذکر آتا ہے جو بٹھور میں اتالیق رہ چکا تھا اور انگریزی ۱
زبان کی تعلیم دیتا تھا۔ بعد میں نانا انگریزوں سے بے تکلف ملتا اور بات چیت کرتا رہتا تھا۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی جانتا تھا[2]۔ اس کے علاوہ اس نے شہسواری تفنگ زنی اور شمشیر زنی بھی سیکھ لی ہو گی، بلکہ دوسرے ہتھیاروں کے استعمال سے بھی پوری آگاہی حاصل کر چکا ہو گا۔ ساورکر نے اسپ سواری، فیل سواری اور تعلیم کا ذکر کیا ہے جس میں نانا کے ساتھ اس کا چچیرا بھائی اور منو بائی بھی شریک ہوتے تھے، جو آگے چل کر لکشمی بائی کے نام سے شہرت پذیر ہوئی یعنی رانی جھانسی[3]۔

---

۲ [1] انگریزوں نے نانا صاحب کی وضع قطع کے بارے میں جو نقشے پیش کیے ہیں، وہ الفاظ میں ہوں یا رنگ و روغن میں، ان سے نانا صاحب کی شکل کا کوئی اچھا تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔ [2] ٹامسن نے لکھا ہے کہ وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ بولتا تھا۔ [3] ساورکر ص ۳۵۔

باجی راؤ کی وفات

۱۸۵۱ء میں باجی راؤ نے وفات پائی۔ اس نے اپنے پیچھے بہت بڑی جایداد چھوڑی، جس کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے، سولہ لاکھ روپے سرکاری تمسکات کی شکل میں، دس لاکھ کے جواہرات، اسی ہزار روپے کے سونے کے زیور اور بیس ہزار روپے کی نقرئی چیزیں، تین لاکھ کی مہریں یا اشرفیاں۔ یعنی کل تیس لاکھ روپے۔

اس کے ساتھ معاہدے کا مفہوم یہی تھا کہ وظیفہ برابر پشت بہ پشت جاری رہے گا ویسے بھی اس کے پس ماندوں کا گزارا اسی صورت میں بہ اطمینان ہو سکتا تھا کہ پورا وظیفہ یا اس کا ایک حصہ جاری رہتا۔ کمشنر اور مجسٹریٹ دونوں کی رائے اور سفارش یہ تھی کہ وظیفہ جاری رہنا چاہیے لیکن صوبہ غرب و شمال کے لفٹننٹ گورنر مسٹر ٹامسن کی رائے اس کے بالکل خلاف تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اہل خاندان میں سے کسی کو کوئی امید نہ دلائی جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ جلد سے بٹھور کو چھوڑ کر دکن چلے جائیں۔

باجی راؤ نے وظیفہ خواری کے زمانے میں انگریزوں سے نہایت خوشگوار تعلقات قائم رکھے۔ کن کیڈ لکھتا ہے کہ ایک موقع پر چھ لاکھ روپے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہ طور قرض دیے۔ سکھوں سے جنگ چھڑی تو باجی راؤ نے اپنے خرچ سے دو رجمنٹیں تیار کیں، ایک سوار اور دوسری پیادہ اور یہ حکومت انگلشیہ کے حوالے کر دیں۔[۱]

تاہم انگریزوں کو معاہدے کی بدیہی اخلاقی ذمہ داریوں یا باجی راؤ کے احسان پرور طرز عمل کا کیا احساس ہو سکتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ خاص وقت گزر چکا ہے، مرہٹے ہمیشہ کے لیے مٹ چکے ہیں اور اب وہ اٹھ نہیں سکتے، لہٰذا کیوں اپنی گردن پر آٹھ لاکھ کا بوجھ باقی رکھا جائے؟ چنانچہ پس ماندوں کو بتا دیا گیا کہ متوفی پیشوا نے چوبیس سال

---

[۱] کن کیڈ جلد سوم صفحہ ۲۲۲۔

میں بہت کچھ جمع کر لیا ہے، اسی پر قناعت کی جائے اور حکومت سے کوئی اُمید نہ رکھی جائے ۔

ساورکر کے تاثرات ساورکر نے باجی راؤ کے خلاف نہایت تیز و تند اور شدید تاثرات کا اظہار کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے ؛

> باجی راؤ پر ایک بھی آنسو نہ بہانا چاہیے، اس لیے کہ اس نے اپنی سلطنت ۱۸۱۸ء میں ضائع کی ۔ پھر پیشواؤں کے نام کو بٹا لگانے والا یہ شخص دوسرے بادشاہوں کی سلطنتیں برباد کرانے میں امداد کے لیے وقف رہا ۔ کمپنی کی حکومت سے جو آٹھ لاکھ روپے ملتے تھے ، ان میں سے بہت کچھ بچا لیا اور کمپنی کو قرض دینے میں یہ بچت صرف کی ۔ بعد میں انگریزوں نے افغانستان کے خلاف جنگ چھیڑی تو باجی راؤ نے اپنے بچائے ہوئے روپے میں سے پچاس لاکھ روپے کمپنی کو اُدھار دیے ۔ کچھ دیر اور گزر گئی اور انگریزوں نے پنجاب میں سکھوں کے خلاف لڑائی چھیڑ دی ..... تو اس باجی راؤ نے جو شیواجی اور اس کے اخلاف کا پیشوا تھا، اپنی جیب سے روپیہ خرچ کر کے ایک ہزار سوار اور ایک ہزار پیادے انگریزوں کی امداد کے لیے بھیجے ۔[۱]

گویا باجی راؤ کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے تو کوئی فوج نہ تھی، لیکن دشمنوں کو تقویت پہنچانے اور امداد دینے کے لیے فوج مل گئی !

---

[۱] ساورکر صفحہ ۲۶ ۔

یہ سب کچھ درست ہے، لیکن اس زمانے میں اکثر ذی اثر اور ذی ثروت افراد کا پیمانہ فکر و نظر یہی تھا۔ جن سکھوں کی سلطنت برباد کرانے میں باجی راؤ نے نمایاں حصّہ لیا تھا، انھوں نے بھی تو اپنی تذلیل اور اپنے قومی و وطنی نقصان کو پس پشت ڈالتے ہوئے جنگ آزادی میں انگریزوں ہی کو تقویت پہنچائی بلکہ دہلی میں کامیابی و کامگاری کی تمام اُمیدوں کو برباد کرنے کے سب سے بڑے ذمہ دار سکھ ہی تھے۔

دیکھنا یہ چاہیے کہ انگریزوں پر اتنے احسان کرنے والے باجی راؤ کے پس ماندوں سے جو سلوک ہُوا، اس کی بھی مثال کہیں ملتی ہے؟ دوست کشی اور احسان فراموشی کے ایسے واقعات کسی قوم کے لیے زیبا سمجھے گئے ہیں؟

پنشن کے لیے تگ و دو

باجی راؤ کے تمام معاملات کا ناظم صوبیدار رام چند پنت تھا، جسے بڑا منتظم مانا جاتا تھا۔ اس نے انتہائی خلوص، سرگرمی اور ہمت سے کوشش شروع کر دی کہ وظیفہ جاری رہے۔ اس نے لکھا کہ نانا صاحب کمپنی ہی کو اپنے والد متوفیٰ مہاراجا کی جگہ محافظ اور حامی و ناصر جانتے ہیں اور انھیں یقین ہے کہ وظیفہ بدستور جاری رہے گا۔ اس کا انحصار صرف حکومت انگلشیہ کی مہربانی اور کشادہ دلی پر ہے۔[1]

لارڈ ڈلہوزی کو کب یہ منظور تھا کہ کمپنی کی حکومت پر آٹھ لاکھ روپے سالانہ کا بوجھ جاری رہے؟ اس نے ٹامسن کی رائے سے اتفاق کیا اور باجی راؤ کا وظیفہ پُورے کا پُورا ضبط کر لیا گیا۔

ولایت میں عرض داشت

جب نانا پر واضح ہو گیا کہ حکومت ہند سے کوئی اُمید نہ رکھنی چاہیے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ کمپنی کے ڈائرکٹروں

---

[1] کیی جلد اوّل صہ ۱۰۲۔

کے پاس باقاعدہ عرض داشت بھیجی جائے۔ اس عرض داشت کے بعض اجزا مختلف کتابوں میں شائع ہوئے ہیں۔ یقیناً اس کا انداز و اسلوب خوشگوار نہیں۔ ممکن ہے حالات یا ضرورتِ استدلال نے ناخوشگواریوں کا صحیح احساس نہ ہونے دیا ہو۔ خلاصہ ذیل میں درج ہے:

۱۔ حکومتِ ہند نے جو مسلک اختیار کیا، وہ متوفی پیشوا کے ان بے شمار متوسلین کے لیے محض بے حسی ہی پر مبنی نہیں، جو کمپنی کے وعدوں پر بھروسا کیے بیٹھے رہے، بلکہ اس شخص کے تعلق میں شایانِ شان بھی نہیں جو حکمرانوں کے ایک طویل سلسلے کا نمائندہ ہے؟

۲۔ یہ مسلک تمام معاہدوں کی روح و معنویت کے خلاف ہے۔

۳۔ یہ مسلک اس کے بھی خلاف ہے جو حکومت نے دوسرے حکمرانوں کے اخلاف کے لیے اختیار کیا۔ مثلاً حکمرانِ میسور ٹیپو سلطان شمشیر بدست لڑتا ہوا مقتول ہوا تاہم ایسے جانی دشمن کے فرزندوں کو بھی کشادہ دلی سے وظیفہ دیا گیا۔ بادشاہ دہلی کو قید سے نکال کر تختِ حکومت پر بٹھایا گیا اور اس کے لیے خاصی رقم کا انتظام کیا گیا۔ کیا پیشواؤں کے حقوق مفتوح حکمرانِ میسور اور اسیرِ مغل بادشاہ سے بھی کم ہیں؟

۴۔ ہندو شاستروں کی رو سے متبنیٰ حقیقی بیٹے کے برابر ہوتا ہے۔ عدالتوں کے فیصلے اسی کے مطابق ہو رہے ہیں۔ حکومت جب تک ہندو دھرم کی اس رسم کو ختم نہ کر دے پیشوا کے متبنیٰ کو وظیفہ دینے سے انکار نہیں کر سکتی۔

۵۔ اس مفروضے کی بنا پر وظیفے سے انکار تعجب انگیز ہے کہ پیشوا نے پس ماندگان اور متوسلوں کے لیے خاصا ترکہ چھوڑا ہے۔ وظیفہ متوفی باجی راؤ اور اس کے متوسلین کے لیے مقرر ہوا تھا۔ اس رقم کے خرچ ہونے یا بچ رہنے کو اصل مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔

۶۔ معاملہ محض اہلِ خاندان ہی کے گزارے کا نہیں بلکہ وفادار متوسلین کی ایک بہت بڑی جماعت ہے جنھوں نے پیشوا کی خاطر جلا وطنی خوشی خوشی قبول کرلی۔

۷۔ دیسی حکمران اگرچہ اختیارات سے محروم ہو چکے ہیں تاہم انھیں اپنی عزت اور درجہ برقرار رکھنے کے لیے خاصا خرچ پڑتا ہے۔ چونتیس لاکھ کی آمدنی والی ریاست میں سے آٹھ لاکھ کی رقم ایسی نہیں جو پیش نظر مصارف کے لیے زیادہ ہو۔

۸۔ اگر بچت کی بنا پر وظیفہ بند کردینا مناسب قرار دیا جاتا ہے تو کیا یہ سمجھا جائے کہ متوفی مہاراجا کی کفایت شعاری اور احتیاط کوشی جرم تھی؟ کیا اس بنا پر مسلّمہ معاہدے کے خلاف وہ وظیفہ بند کردینا مناسب ہے جو متوفی اور اس کے متوسلین کے لیے تجویز ہوا تھا؟[1]

یہ عرض داشت ۹ دسمبر ۱۸۵۲ء کو بھیجی گئی تھی، لیکن جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا یہ بھی بے اثر رہی۔

وکلا کا ارسال

ابھی ولایت سے کوئی جواب نہ آیا تھا کہ نانا نے اپنے وکیل ولایت بھیجنے کا فیصلہ کرلیا۔ شاید اس خیال سے کہ بعض دوسری مسندوں کے دعوے داروں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔

کیئی کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ وظیفے کے جاری رہنے کی نسبت بے یقینی کا مسئلہ باجی راؤ کی زندگی ہی میں سامنے آگیا تھا اور اس زمانے میں صوبیدار رام چندر کے بیٹے کو ولایت بھیجنے کی تجویز ہوئی تھی،[2] لیکن عرضداشت کے بعد جب مناسب سمجھا گیا کہ خاص وکیل یا نمائندے بھیج کر کوشش کرنی چاہیے تو عظیم اللہ خاں کو بھیجا۔ ساتھیوں میں سے نانا کے

---

[1] کیئی جلد اوّل صفحہ ۱۰۴-۱۰۵۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۰۱۔

پچھیرے بھائی بالا صاحب اور محمد علی خاں عرف جمی گرین اور ایک انگریز بڈل کے نام ہمیں معلوم ہیں۔ اور آدمی بھی ہوں گے۔ اس وکالت کے حالات عظیم اللہ خاں کے سوانح میں بیان کیے جا چکے ہیں اور انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

صرف اتنا بتا دینا چاہیے کہ عرضداشت کا جواب آنے سے پیشتر یہ لوگ ولایت روانہ ہو چکے تھے۔ جواب یہ آیا کہ وظیفہ موروثی نہ تھا اور متبنیٰ کا دعویٰ ناقابل قبول ہے۔ وکیلوں کی مساعی بھی سراسر ناکام رہیں۔

غصہ اور جوش عمل

ظاہر ہے کہ انگریزوں کا یہ برتاؤ نانا صاحب کے دل میں اچھے جذبات پیدا نہ کر سکتا تھا۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اس واقعے سے پیشتر نانا کے دلی خیالات کیا تھے؟ آیا وہ پہلے ہی سے انگریزوں کے خلاف سازباز کی تدبیریں سوچ رہا تھا یا اس نے وظیفے کی بندش کے بعد جوش اور غصے کی حالت میں مخالفت کا فیصلہ کیا؟ جس طرح ہم بعض دوسرے مجاہدین کے سلسلے میں دیکھ چکے ہیں، مثلاً جھانسی کی رانی لکشمی بائی۔ جس حد تک میدان عمل میں مجاہدات کا تعلق ہے، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ مجاہد نے کب سے کام شروع کیا یا اس کے محرکات کیا تھے؟ بعض حساس اور بالغ نظر شخصیتیں اجنبیوں اور بیگانوں کے نفس تسلط ہی کو برداشت نہیں کرتیں اور مناسب موقعے کی تلاش میں رہتی ہیں۔ بعض کو بیگانوں کا غیر ہمدردانہ بلکہ حق سوز طرز عمل متنبہ کر دیتا ہے اور ان کی سوئی ہوئی قوت حافظہ جاگ اٹھتی ہے۔ بعض آخری وقت تک بیدار نہیں ہوتے۔

نانا صاحب میرے نزدیک دوسرے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قماش کے آدمی آہستہ آہستہ تذبذب کے چکر سے باہر آتے ہیں اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا، نانا صاحب پر خاصی دیر تک تذبذب طاری رہا لیکن جب یہ طلسم ٹوٹا تو پھر اس نے آخری دم تک اسی مسلک کی پیروی و پابندی جاری رکھی جس کی امید ایک غیور محب وطن سے ہو سکتی تھی۔

خفیہ تنظیمات

سادرکر نے لکھا ہے کہ نانا نے خفیہ تنظیمات شروع کر دی تھیں اس نے بہت سے برہمن، درویش اور عالم اپنے ساتھ ملا لیے اور اُنھیں ملک کے مختلف حصوں میں بھیج دیا۔ عظیم اللہ خاں ولایت سے آیا تو وہ نئے خیالات لے کر آیا۔ اس نے ترکوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ ممکن ہے جنگ کریمیا میں انگریزی فوج کی درگت نے اُسے یقین دلا دیا ہو کہ ہمت کی جائے تو انگریزوں کو پاک و ہند سے باہر نکال دینا کچھ مشکل نہیں۔ جو حالات اب تک روشنی میں آئے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے سازباز کے سلسلے زیادہ تر ولایت سے وکیلوں کے ناکام آنے کے بعد شروع ہوئے تھے۔ مولانا احمد اللہ شاہ میرے نزدیک بہ طور خود جہاد کے لیے تنظیمات شروع کر چکے تھے۔ اغلب ہے عظیم اللہ خاں اور نانا سے ملنے کے بعد اُنھوں نے سرگرمیوں میں ایک گونہ وحدت و یک جہتی کا بندوبست کر لیا ہو۔

نانا کا دورہ

انگریزی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ نانا نے ۱۸۵۷ء کے اوائل میں ایسی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں جن کا وہ عادی نہ تھا اور انگریز ان پر متحیر ضرور تھے لیکن اُنھیں کوئی شبہ پیدا نہ ہوا۔ مثلاً وہ کالپی گیا۔ پھر دہلی پہنچا، بعد ازاں لکھنؤ گیا۔ عظیم اللہ خاں اس کے ساتھ تھا۔ لکھنؤ میں اُن کے طرزِ عمل سے کچھ شبہات پیدا ہوئے تاہم اُنھیں کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ علاوہ بریں انبالہ اور کارنگا جانا بھی ثابت ہے۔[1]

تحریک کے لیے پروپیگنڈے کے بارے میں زیادہ شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے یا اُسے جاننا چاہیے کہ بڑی تحریکیں اُٹھانے کے لیے کچھ نہ کچھ اہتمام ضرور کیا جاتا ہے اور ۱۸۵۷ء کی تحریک کا اہتمام اُنھیں لوگوں نے کیا ہوگا جو اس میں ممتاز حیثیت کے کارفرما تھے اور جنھوں نے یا تو میدانِ جنگ میں جانیں دے دیں یا گرفتار

---

[1] کیی ص ۵۴۴-۵۰؛ ہومز ص ۹۰-۹۱

ہوئے اور پھانسی پاگئے یا حبس دوام بعبور دریا ے شور کے مستوجب ٹھہرے یا انھوں نے سب کچھ لٹا چکنے کے بعد غربت کی زندگی اختیار کرلی، اس لیے کہ اگر وطن میں اطمینان اور عزت سے رہنے کی صورت پیدا نہ ہو تو اس سے باہر نکل جانا اور اصل نصب العین کی یاد میں زندگی گزار دینا ہزار درجہ بہتر ہے۔ وطن اسی صورت میں محبوب ہے کہ اس کے اندر محبوبیت کے خاص پہلو موجود ہوں یا ان پہلوؤں کے لیے جدو جہد کا موقع حاصل ہو۔ اگر دونوں چیزیں نہ ہوں تو پھر اس میں جاذبیت کا کون سا جوہر باقی رہ جاتا ہے؟ یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ انگریز چھان بین کرکے جس نتیجے پر پہنچے تھے، یہ تھا کہ تحریک جہاد آزادی کے بانیوں نے ۳۱۔مئی کی تاریخ آغاز جہاد کے لیے مقرر کی تھی، لیکن اتفاقیہ میرٹھ کی فوج نے ۱۰۔مئی کو ہنگامہ شروع کر دیا۔ لہٰذا سب کو قبل از وقت اور تیاریاں مکمل کیے بغیر اس میں شریک ہونا پڑا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ۳۱۔مئی کو جنگ آزادی شروع ہوتی تو نتیجہ کیا نکلتا اور اس وقت تک کیا کچھ پایۂ تکمیل پر پہنچا لیا جاتا، لیکن یہ معلوم ہے کہ تیاریاں مکمل کیے بغیر سب کو اس میں شریک ہونا پڑا۔ ناکامی کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا۔

نانا سے طلب امداد میرٹھ کے واقعے کے بعد کان پور میں حالات بگڑنے لگے تو وہاں کے ارباب بست و کشاد نے خود نانا سے امداد طلب کی کہ ہمارے خزانے اور میگزین کو بچانے کے لیے اپنے آدمی مقرر کر دیجیے۔ چنانچہ نانا اور اس کے آدمی نواب گنج میں متعین ہوئے۔ اس سلسلے میں تانتیا ٹوپے کا بیان خاص توجہ کا محتاج ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> ماہ مئی ۱۸۵۷ء میں کان پور کے کلکٹر[1] نے ایک تحریر نانا کے پاس بٹھور میں بھیجی اور التجا کی کہ میری بیوی بچوں کو

---

[1] کلکٹر کا نام ہلرس ڈن HILLERSDEN

انگلستان بھجوا دیا جاتے۔ نانا نے یہ التجا قبول کر لی۔ چار روز بعد کلکٹر نے (نانا کو) لکھا کہ تھوڑے سے اپنی فوج اور توپیں لے آیئے۔ میں (تانتیا) نانا کے ساتھ گیا۔ ہمارے ساتھ کوئی ایک سو سپاہی تھے، تین سو توڑے کی بندوقوں والے آدمی اور دو توپیں۔ ہم کلکٹر کے بنگلے پر گئے۔ وہ اس وقت بنگلے پر نہ تھا۔ بلکہ اس مقام پہ تھا جہاں انگریزوں نے قلعہ بندی کر رکھی تھی۔ اس کا پیغام آیا کہ رات میرے ہی گھر پہ گزارو، جو کان پور میں تھا۔ چنانچہ ہم نے رات وہاں گزاری۔ ہم چار روز وہاں ٹھہرے رہے کلکٹر نے کہا کہ بڑا ہی اچھا ہوا تم آ گئے، اس لیے کہ سپاہیوں نے نافرمانبرداری اختیار کر لی ہے۔ ساتھ ہی کہا کہ میں جرنیل صاحب سے بھی آپ لوگوں کے متعلق بات کروں گا۔ چنانچہ اس نے بات کی۔ جرنیل نے آگرہ خط لکھا۔ وہاں سے جواب آیا کہ ہمارے آدمیوں کے لیے تنخواہ کا انتظام کر دیا جائے گا[1]

یہ اقتباس کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ البتہ اس میں ایک پیچیدگی بڑی عجیب ہے اور اس کے حل کی کوئی مناسب صورت ذہن میں نہیں آتی یعنی آیا اس وقت تک نانا نے اٹھنے کا فیصلہ ہی نہ کیا تھا۔ اور وہ ۲۱ مئی کا انتظار کر رہا تھا؟ یا وہ خود کسی اقدام میں نمایاں حصہ لینے پر آمادہ نہ تھا؟ کم از کم یہ ظاہر ہے کہ انگریزوں کو اس وقت تک نانا پہ پورا اعتماد تھا، نیز وہ اعتماد کے لائق ثابت ہوا اس لیے کہ چار روز یا اس سے بھی زیادہ مدت تک خزانے کی حفاظت کرتا رہا اور اسے کوئی نقصان نہ پہنچنے دیا۔

۲

---

[1] تانتیا کا پورا بیان میلی سن نے جلد پنجم میں دے دیا ہے۔ جس حصے کا ترجمہ متن میں درج ہے یہ اقتباس جلد دوم ص۱۲۶ کے حاشیے پر منقول ہے۔

انگریزی ذہنیت کا نقشہ

کان پور کے حالات یقیناً بگڑے ہوئے تھے۔ سپاہی مسلسل اُنہیں لائنوں پر سوچ رہے تھے جن لائنوں پر میرٹھ اور بعض دوسرے مقامات کی سپاہ عمل کر چکی تھی۔ تاہم ہنگامے کے آغاز میں سپاہیوں کو تامل تھا۔ فلیچر ہیز نے ہنری لارنس کے نام ۲۶ مئی کو ایک خط بھیجا تھا۔ اس میں وہ لکھتا ہے :

> سپاہیوں کی سرکشی اور بغاوت میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ فیصلہ نہیں کر سکے کون سبقت کرے۔ وہ کئی روز سے باہم جھگڑ رہے ہیں۔ ایک دیسی افسر نے رسالے کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا تھا کہ ہتھیار سنبھال کر بغاوت شروع کر دی جائے اور اس نے ایک ترمچی کو ترم بجانے اور اُٹھنے کا سگنل دے دینے پر بھی راضی کر لیا، دوسرے دیسی افسر نے ترم چھین کر ایک طرف رکھ دیا[۱]

گویا ۲۶ مئی تک تذبذب کی حالت جاری تھی لیکن انگریز اس حالت میں بھی انتہائی بے پروائی سے دیسیوں کے ساتھ بدسلوکی کر رہے تھے۔ مثلاً کاکس[۲] نام ایک گورے نے ۲ جون کی رات کو ع۲ رسالے کے ایک پہرے دار پر گولی چلا دی۔ گورے پر مقدمہ چلا لیکن دوسرے دن اسے بدیں وجہ بری کر دیا گیا کہ گولی چلانے کے وقت وہ شراب پی کر مدہوش تھا۔ اس واقعہ نے رسالے ہی میں نہیں بلکہ عام سپاہیوں میں بھی حد درجہ بے اطمینانی پیدا کر دی اور اُنھوں نے کھلم کھلا کہنا شروع کر دیا کہ ہو سکتا ہے کسی روز ہماری بندوقیں بھی اتفاقیہ سر ہو جائیں[۳]

حاشیہ

[۱] FLETCHER HAYS [۲] بیل سن جلد دوم صفحہ ۱۳۱ [۳] COX بیل سن جلد دوم صفحہ ۱۳۲

آغاز نانا اس وقت تک خزانے اور میگزین پر پہرہ دے رہا تھا۔ پھر کیا سمجھ لیا جائے کہ پہرہ داری کے دوران میں وہ ساز باز بھی کرتا رہا؟ میلی سن لکھتا ہے:

> بیان کیا جاتا ہے کہ رسالے کا جو صوبیدار بغاوت کا سرگرم
> داعی تھا، اس کے اور نانا صاحب ساکن بٹھور کے درمیان
> بہت جلد ملاقات کا بندوبست کر دیا گیا[۱]

میلی سن خود ہی اعتراف کرتا ہے کہ دیسی گروہوں کے بیانات کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے ہے اس سے خفیہ ملاقاتوں کی پوری تاریخ مرتب کر لینا آسان نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جون کے اوائل میں سرکش سپاہیوں کے افسروں اور بٹھور کے محل میں رہنے والوں کے درمیان پے در پے ملاقاتیں ہوئیں۔ سپاہیوں کو علم تھا کہ اگر انھوں نے راہ بغاوت میں قدم رکھا تو نانا ان کے ساتھ ہوگا۔[۲]

بہرحال ۴۔ جون کو ہنگامے کا آغاز ہو گیا۔ میلی سن کہتا ہے کہ سپاہی نواب گنج کے حوالی میں پہنچے، نانا کے ملازمین سے بھائی چارہ پیدا کیا، خزانہ لوٹا، جیل کے دروازے کھول دیے اور قیدی چھوڑ دیے۔ سرکاری عمارتوں کو آگ لگائی اور ریکارڈ جلا دیے۔ میگزین پر بھی قبضہ کر لیا، جس میں گولی بارود اور بھاری توپیں موجود تھیں۔[۳]

تانتیا ٹوپے کا بیان تانتیا ٹوپے نے واقعات کو بالکل دوسری شکل میں پیش کیا ہے۔ اس بیان کی عمومی حیثیت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ دانستہ توڑ مروڑ سے کام لیا گیا ہے یا نانا کو ذمہ داریوں سے بچانے کے لیے غلط بیانیاں کی گئی ہیں۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے جو کچھ دیکھا ہے کم و کاست اسی شکل میں بیان کر دیا۔ وہ

۱۔ میلی سن جلد دوم ص ۲۳۱۔ ۲۔ ایضاً ص ۲۳۲، ۳۔ ایضاً ص ۲۳۲

کہتا ہے کہ آگرہ سے ہمارے آدمیوں کے لیے تنخواہ کا انتظام کر دینے کی اطلاع آگئی تو:

> دو روز بعد ہمیں پیادہ ۳ رجمنٹوں اور ۲ رسالے نے ہمیں گھیر لیا۔
> نانا صاحب اور مجھے خزانے میں قید کر دیا۔ میگزین اور خزانے
> میں سے ہر چیز اٹھا لی اور کچھ بھی باقی نہ چھوڑا۔ روپے میں سے
> سپاہیوں نے دو لاکھ گیارہ ہزار روپے نانا کو دیے لیکن سنتری
> اپنے مقرر کر دیے۔ نانا بھی انھیں سنتریوں کے پہرے میں تھا۔
> جو سپاہی ہمارے ساتھ تھے، وہ بھی باغیوں میں شامل ہو گئے۔[1]

ہمیں نانا کے دلی افکار و عزائم سے بحث نہیں، لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ ہنگامہ آرائی میں جلد بازی اور تیزی کا خواہاں نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی وہ ہنگامے کے لیے تیار نہ ہو اور سپاہیوں نے واقعی اسے قید کر کے اپنا مطلب پورا کر لیا ہو۔

میرا تاثر یہی ہے کہ تانتیا ٹوپے کا بیان درست ہے۔ انگریزوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ کسی مستند اطلاع پر مبنی نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ باغی سپاہی نواب گنج پہنچے۔ ان کے وفد نے نانا سے ملاقات کی اور کہا: مہاراج، مملکت آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے، لیکن اگر ہمارے دشمنوں کا ساتھ دیا تو موت کی سزا دی جائے گی۔ نانا نے کہا کہ مجھے انگریزوں سے کیا سروکار ہے، میں ہمہ تن تمہارا ہوں۔[2]

اس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ نانا بغاوت سے پیشتر سپاہیوں کے ساتھ نہ تھا۔

دہلی کی طرف کوچ اور مراجعت

انگریزی بیانات میں بتایا گیا ہے کہ خزانے اور میگزین کی لوٹ کے بعد سپاہی جلد

---

[1] بیلی سن جلد پنجم ص ۲۰۵، [2] ٹریولین، کان پور ص ۶۹؎

سے جلد دہلی روانہ ہونے کے خواں تھے۔ اُنھوں نے نانا کو ساتھ لیا اور چل پڑے۔ اُن کے پاس روپیہ تھا، ساز و سامان جنگ تھا۔ سفر کے لیے گاڑیاں تھیں اور اُمید لگائے بیٹھے تھے کہ دہلی میں بادشاہ کو گدّی پر بحال کر دیا تو بہت انعام ملے گا۔[1]

تانتیا کہتا ہے کہ فوج نے دہلی کی طرف کوچ شروع کر دیا۔ مجھے نانا صاحب اور ہمارے آدمیوں کو بھی ساتھ لے لیا۔

کان پور سے تین کوس جا چلے تو نانا نے کہا کہ دن ختم ہو رہا ہے بہتر یہ ہے کہ یہاں ٹھہر جائیں اور کل صبح روانہ ہوں۔ سپاہیوں نے یہ بات مان لی اور ٹھہر گئے۔ دوسرے دن صبح کو پوری فوج نے کہا کہ ہمارے ساتھ دہلی چلو۔ نانا نے انکار کر دیا۔ اس پر سپاہیوں نے کہا اچھا ہمارے ساتھ کان پور چلو اور انگریزوں کے خلاف جنگ کرو۔ نانا نے اُسے بھی قبول نہ کیا۔ سپاہیوں نے ایک نہ سُنی۔ انہیں قیدی کی حیثیت میں ساتھ لے کر کان پور کی طرف چل پڑے اور وہاں جنگ شروع ہو گئی۔[2]

مراجعت کے وجوہ انگریزی بیانات مظہر ہیں کہ نانا نے اپنے مشیروں خصوصاً عظیم اللہ خاں کے مشورے کے مطابق سپاہیوں کو کان پور میں روک لیا تھا۔ پھر اُنھیں ساتھ لے کر کان پور لوٹا۔

اس کے پیش نظر یہ حقائق تھے:

۱۔ دہلی گیا تو اس کی حیثیت ثانوی رہ جائے گی، اس لیے کہ وہاں مغل بادشاہ تمام معاملات پر حاوی ہوگا۔

۲۔ کان پور میں رہا تو وہ اپنے معاملات میں مختارِ کل ہوگا۔

---

[1] میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۴۲ ؛ [2] ایضاً جلد پنجم صفحہ ۳۰۵ ؛

۳۔ لکھنؤ، بنارس، الہ آباد اور آگرہ ہی وہ بڑے بڑے مقامات تھے جہاں سے کان پور کمک بھیجی جا سکتی تھی۔ ان شہروں کے حالات نانا پر روشن تھے اور وہ جانتا تھا کہ یہ کچھ مدد نہیں دے سکتے لہٰذا وہ اطمینان سے حکمرانی کی گدی مستحکم کرے گا۔

۴۔ عظیم اللہ خاں یہ بتا ہی چکا تھا کہ ہم پہلے دوآبے پر قبضہ کریں گے، پھر کلکتہ کی طرف بڑھیں گے اور بڑا علاقہ قبضے میں لے کر اپنے مستقبل کے متعلق بہتر سے بہتر تجویزیں منظور کرا سکیں گے۔

محاصرہ اور روانگی

۶ جون سے ۲۷ جون تک سات دن پورکی انگریزی فوج اور دوسرے انگریز محصور رہے۔ محاصرے کی تفصیلات زیر بحث موضوع سے خارج ہیں۔ ختم محاصرہ کے متعلق بیانات مختلف ہیں:

۱۔ انگریز کہتے ہیں کہ ۲۶ جون کو مسز جیکوبی یا مسز گرین کے ذریعے سے ایک رقعہ پہنچا جس کا مضمون یہ تھا کہ جو انگریز لارڈ ڈلہوزی کے افعال و اعمال سے بے تعلق ہیں وہ اگر ہتھیار ڈال دینے پر آمادہ ہوں تو انھیں بہ خیر و عافیت الہ آباد بھیج دیا جائے گا۔ پھر عظیم اللہ خاں اور جوالا پرشاد انگریز جنرل سے ملے اور کشتیوں کے انتظام روانگی کے وقت اور رسد کا فیصلہ ہوا۔[1]

۲۔ تانتیا کا بیان ہے کہ محاصرے کے بیسویں دن انگریز جرنیل نے صلح کا جھنڈا بلند کیا اور لڑائی بند ہو گئی۔ اس وقت نانا نے ایک انگریز عورت کے ذریعے سے انگریز جرنیل کو پیغام بھیجا کہ سپاہی میرا حکم ماننے کے لیے تیار نہیں۔ میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کے لیے (جرنیل کے لیے) اور آپ کے ساتھیوں کے لیے الہ آباد

---

[1] سیل سن جلد دوم صفحہ ۲۵۱، ۲۵۲

تک کشتیوں کا انتظام کر دوں جرنیل نے یہ پیش کش منظور کر لی۔[1]

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں سے کس بیان کو درست مانا جائے۔ مجھے تانتیا کا بیان زیادہ قرین یقین معلوم ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف سب لوگ کرتے ہیں کہ انگریز جرنیل کے پاس رسد ختم ہو رہی تھی۔ محصورین کی حالت نازک تھی اور وہ زیادہ دیر تک مقابلہ جاری نہ رکھ سکتے تھے۔ اغلب ہے جرنیل نے صلح کا جھنڈا بلند کر کے بات چیت کی صورت پیدا کی ہو۔ ہاں، یہ بھی ممکن ہے کہ محاصرین نے ایک بے سود کش مکش کو طول دینے کے بجائے حسنِ تدبیر کے ساتھ اسے ختم کر دینے کے لیے پیغام بھیجا ہو، یعنی انگریزی بیان بالکل غیر اغلب نہیں۔

دردانگیز واقعہ

۲۷۔ جون کو صبح کے وقت تمام انگریز قلعہ بندیوں سے نکلے۔ ستی چورا گھاٹ پر ان کے لیے کشتیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ عورتوں اور کمزوروں کے لیے سواریاں بھی مہیا کر دی گئی تھیں۔ وہ کشتیوں پر سوار ہو گئے تو اچانک حملہ ہوا اور قتل شروع ہو گیا۔ بہت سے مارے گئے یا ڈوب گئے یا اسیر ہو گئے۔

انگریزی بیانات مظہر ہیں، نانا، اس کے بھائی بند، عظیم اللہ خاں، تانتیا ٹوپے، ٹیکا سنگھ اور دوسرے لوگ موقع پر موجود تھے۔ انگریزوں نے بعد میں جو شہادتیں لیں، ان میں سے ایک میں بتایا گیا ہے کہ تانتیا ٹوپے نے صوبیدار ٹیکا سنگھ کو حکم دیا اور تاکید کر دی کہ ایک انگریز کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے۔ دوسری شہادت میں بتایا گیا کہ تانتیا ٹوپے نے نانا کے حکم کی تعمیل کرائی۔[2] مفتی انتظام اللہ کہتے ہیں کہ نانا کے بھائی بالا صاحب نے فسخ عہد کیا اور کشتیوں پر گولیوں کی باڑ ماری۔ اس وجہ سے تانتیا ٹوپے، عظیم اللہ خاں اور مینا (دختر نانا) نانا سے ناراض ہو گئے۔[3] سوال یہ ہے کہ اگر اس فعل کا ذمہ دار بالا صاحب تھا نہ کہ نانا تو نانا سے ناراضی کی کون سی وجہ تھی؟

تانتیا نے لکھا ہے کہ روانگی کا فیصلہ ہو جانے کے بعد انگریز جرنیل نے تقریباً ایک لاکھ

---

[1] میلی سن جلد پنجم ص ۳۰۲۔ [2] میلی سن جلد دوم ص ۲۵۱ حاشیہ۔ میلی سن نے تسلیم کیا ہے کہ ممکن ہے تانتیا نے کشتیوں کی روانگی کا اشارہ کیا ہو اور اسے دیکھنے والے نے قتل کا اشارہ سمجھ لیا ہو۔ [3] غدر کے چند علماء ص ۱۱۔

سے روپے کی رقم نانا کے پاس بھیج دی کہ اسے محفوظ رکھا جائے۔ نانا کے حکم سے میں نے چالیس کشتیوں کا انتظام کیا۔ سب کو ان میں سوار کرایا اور روانہ کر دیا۔

> اس وقت سپاہی پانی میں کود پڑے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل شروع کر دیا۔ کشتیوں کو آگ لگا دی۔ اس طرح انتالیس کشتیاں تباہ ہو گئیں۔[1]

سپاہیوں کے جوش کا سبب

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ سپاہی انگریزوں کے معاملے میں جوش غضب سے بے قابو تھے۔ لکھنؤ، دہلی، جھانسی اور بعض دوسرے مقامات پر جو الم افزا واقعات پیش آئے، ان کی وجہ یہی تھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ انگریزوں نے ان کے ساتھ حد درجہ رنجدہ اور قلق افزا برتاؤ کیا تھا۔ انھوں نے اندھا دھند اہل ملک کو قتل کیا تھا۔ انھوں نے مجرم و بے جرمی کی تمیز روا نہ رکھی تھی۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ کان پور میں جہاں جنگ آزادی کے لیے رضا کار پہنچ رہے تھے، وہاں الہ آباد اور بنارس سے بھی ہزاروں لوگ آئے تھے، جن کے ہم منزلوں کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا گیا تھا۔ سیکڑوں نوجوان تھے، جن کے باپ انگریزوں کے ہاتھوں پھانسی پا چکے تھے۔ ایسے شوہر بھی تھے جن کی بیویوں اور بچوں کو جنرل نیل نے جلوایا تھا، جن کی جائدادیں تباہ ہو چکی تھیں[2] ان کے دل انتقام کے جذبات سے لبریز تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہ تانتیا ٹوپے کی بات سن سکتے تھے، نہ نانا کی اور نہ کسی اور کی۔

نیل یا دوسرے انگریز افسر جوش وحشت میں بھول رہے تھے کہ اہل ملک پر جتنے ظلم کیے جائیں گے، جتنی بے دردی سے انھیں موت کے گھاٹ اتارا جائے گا، اتنے ہی حالات پرسکون ہوتے جائیں گے۔ انھیں یہ احساس نہ تھا کہ ظلم و جور کا خمیازہ ان انگریزوں کو بھگتنا پڑے گا جو

---

[1] بیل سن جلد پنجم ص ۲۰۵ ۔ [2] ساورکر ص ۴۸۹۔

اہلِ ملک سے قبضے میں تھے۔ نیل نے اوائل جون میں الہ آباد، بنارس اور دوسرے مقامات پر جو ظلم کیے تھے، انھوں نے تمام اہلِ ملک کا غصہ و برافروختگی کی حد پر پہنچا دیا تھا۔ کان پور میں قتل کے جو دو واقعے پیش آئے، وہ یقیناً بڑے رنجدہ اور بڑے افسوسناک تھے اور ان کے لیے کوئی بھی عذر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم اگر کہا جائے کہ ان کی حقیقی ذمہ داری نیل یا اس جیسے دوسرے تنگ دل انگریز فوجیوں پر عاید ہوتی ہے تو اسے درست ماننے میں کسی کو کیا تامل ہو سکتا ہے؟

ناناکی پیشوائی کا اعلان

یکم جولائی کو نانا کی پیشوائی کا اعلان ہوا۔ ایک حکم جاری کیا گیا جس کا مضمون یہ تھا کہ خدا کے احسان اور شاہنشاہ کے اقبال سے نصاریٰ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا۔ دہلی، پونا، ستارہ اور کان پور، غرض ہر جگہ انھیں جہنم رسید کر دیا گیا۔ اب عوام اور کارکنانِ حکومت کو چاہیے کہ اس واقعے پر خوشی کے شادیانے بجائیں اور اپنے فرائض آرام و امن سے انجام دیتے رہیں۔

بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم اللہ خاں نے ۱۰۔ جولائی کو کان پور میں علمِ جہاد کی پرچم کشائی کی تھی۔ اس عہد کے کارکنوں میں سے متعدد کے نام تاریخوں میں آئے ہیں، مثلاً جمال الدین حوالدار، شیر خاں حوالدار، مدد علی ساکن باندہ، ٹیکا سنگھ صوبیدار، شمس الدین صوبیدار، رحیم خاں ساکن کشن پور، حوالدار میجر گوپال سنگھ، سردار بیگ، رائے سنگھ، جمعدار نجو خاں، تلیار خاں، قاضی اسماعیل، جسے عظیم خاں کا ایجنٹ بتایا گیا ہے، احمد علی خاں وکیل بھی، قاضی وصی الدین اکبر علی، مولوی عبدالرحمان، ڈاکٹر رحیم خاں، بلاس سنگھ، اکبر علی، زین العابدین (نانا کا بخشی) مولوی سلامت اللہ، عزیزن طوائف۔

منادی ان لفظوں میں کرائی گئی:

"خلق خدا کی، ملک بادشاہ سلامت کا، حکم نانا صاحب اور فوج بہادر کا۔"

کان پور کی تسخیر بعد کے حالات زیادہ تفصیل کے محتاج نہیں۔ انگریزی فوج ہیو لاک کی سرکردگی میں الہ آباد سے روانہ ہوئی ؛

۱۔ ۱۲ جولائی کو فتح پور میں جنگ ہوئی۔ انگریزوں نے فتح کے بعد شہر کو لوٹنے کی اجازت دے دی۔

۲۔ ۱۵ جولائی کو اونگ میں ایک جھڑپ ہوئی۔

۳۔ اسی دن بالا صاحب (برادر نانا) نے پانڈو ندی پر شکست کھائی اور کان پور کا راستہ کھل گیا۔

۴۔ نانا نے اس کے بعد بھی لڑائی جاری رکھی لیکن انگریز کامیاب ہوئے اور ۱۷ جولائی کو کان پور میں داخل ہو گئے۔ وہاں یا دوسرے مفتوحہ مقامات پر انھوں نے جو ظلم دجور کیے وہ تاریخ جنگ آزادی کا حصہ ہیں نہ کہ نانا کے حالات کا۔

۵۔ ۱۹ جولائی کو انگریزوں نے بٹھور جا کر پیشوائی محل کو تباہ کر دیا اور تمام اشیا پر قبضہ کر لیا۔ نانا اس سے پیشتر دریا عبور کر کے لکھنؤ کی جانب روانہ ہو چکا تھا۔

اسیروں کا قتل کان پور کے سلسلے میں صرف ایک ضروری واقعہ باقی رہ گیا اور وہ انگریز اسیروں کا قتل ہے جو پانڈو ندی کی جنگ کے روز پیش آیا۔ اسے سب سے زیادہ دردناک واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ واقعہ پہلے قتل سے بھی زیادہ رنج دہ ہے، تاہم اس کا بھی خاص سبب تھا۔ "قیصر التواریخ" کا بیان ہے کہ ان قیدیوں کو اچھی طرح رکھا گیا تھا۔ ایک روز ان کے لباس میلے دیکھے تو حکم دیا کہ دھوبیوں سے باس دُھلوا دو۔ مہتاب خاں اور محراب خاں برقنداز ان کے لیے کھانے کا بندوبست کرتے تھے۔ حسینی خانم کھانا بانٹا کرتی تھی ؛

> مگر ہم لوگ گویندوں کے ہاتھ ہر طرح سے بہ اخفا چٹھیاں اپنے
> احوال گزران کی لکھ کر بھیجتی تھیں چنانچہ ایک دن دو گویندے
> مع چٹھی پکڑے گئے۔ بس یہی ان سب کی قضا کا باعث ہوا۔
> ادھر بالا راؤ انگریزی فوج کے مقابلے کے لیے روانہ ہوا، ادھر نانا
> نے سمجھا کہ اس بنا پر سب کے قتل کا حکم دے دیا کہ تم نے فوج ہمارے
> قتل کو بلائی ہے۔[1]

وجہ خواہ کچھ ہو، اس واقعہ الیمہ کے لیے بھی کوئی عذر معقول یا قابلِ قبول نہیں سمجھا جا سکتا۔

لکھنؤ میں داخلہ

نانا بٹھور سے نکلا تو لکھنؤ گیا۔ پہلے اپنا وکیل بھیج کر حضرت محل سے اجازت منگوائی۔ حضرت محل نے نہ صرف اجازت دی بلکہ راجا جے لال سنگھ کو حکم دیا کہ بیس اونٹ، انتیس چھکڑے، دس گاڑیاں، بیس تیس ہاتھی لے کر فتح پور چوراسی جاؤ اور نانا کو لے آؤ۔ نانا بارش ہی میں جیا سنگھ چودھری کی گڑھی سے مع اہل و عیال روانہ ہوا۔ لکھنؤ پہنچنے پر حضرت محل کے حکم سے پھر راجا جے لال سنگھ نے استقبال کیا، جس کا خطاب نصرت جنگ تھا۔ پیشتر شیش محل کو نانا صاحب کے لیے آراستہ کیا جا چکا تھا۔ اس میں شطرنجیاں، چاندنیاں، پلنگ، کرسیاں اور دوسری چیزیں قرینے سے سجا دی گئی تھیں حتیٰ کہ دیواروں پر تصویریں بھی آویزاں کر دی گئی تھیں۔

گیارہ ضرب توپ سے نانا کی سلامی ہوئی۔ پھر حضرت محل نے میر واجد علی کو پرسش مزاج کے لیے بھیجا۔ نانا نے کہا کہ اکیس ضرب توپ کی سلامی ہوتی تو مضائقہ نہ تھا، ورنہ سلامی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ میر واجد علی نے جواب دیا کہ اکیس ضرب توپ کی سلامی صرف بادشاہ کے لیے معمول ہے۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۴۹

حضرت محل نے پچیس ہزار روپے بطور ضیافت بھیجے اور خلعت بھی دیا، جس کی تفصیل قیصر التواریخ میں یوں بیان کی گئی ہے:

قبائے زریں، شمشیر و سپر، مالائے مروارید، دھکدھکی مرصع الماس کی، کنٹھا مروارید، نورتن مرصع، دست بند مروارید، دوشالہ، رومال، عمدہ زریں کار بادہ، کمر بند، شال، اسپ مع ساز و زین نقرہ، ہاتھی مع ہودج نقرہ[۱]

لکھنؤ سے نکلنے کے بعد جب تک انگریز لکھنؤ نہ پہنچے، ناناؔ وہیں رہا۔ جب انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی تو وہ بھی اپنا ساز و سامان چھکڑوں میں لدوا کر چلا گیا۔ شاہجہان پور کی جنگ میں مولانا احمد اللہ شاہ کے ہمراہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بعد ازاں حضرت محل کے ہمراہیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے کہ:

۱۔ ۱۵۔ دسمبر کو کالن کیمبل بہرائچ پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت محل اور ناناؔ اس پر قابض تھے۔ ۱۴۔ دسمبر کو اُسے خالی کیا تھا[۲]

۲۔ ۲۹۔ دسمبر ۱۸۵۸ء کو کیمبل نانپارہ پہنچا تو طلایہ گرد خبر لائے کہ نانا صاحب اور بینی مادھو چند ہزار سپاہیوں کے ہمراہ نیکی میں مقیم ہیں، جو نانپارہ سے بیس میل شمال میں دریائے راپتی پر واقع ہے[۳]

۳۔ یکم جنوری ۱۸۵۹ء کو اطلاع ملی کہ باغیوں میں سے جو لوگ نیپال میں داخل ہوئے ان میں حضرت محل اور نانا بھی شامل تھے[۴]

ناناؔ کی باقی عمر نیپال ہی میں گزری۔ مختلف لوگوں نے بیان کیا کہ انھوں نے ناناؔ کو دیکھا

---

[۱] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۵۰؛ [۲] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۵۱۹؛

[۳] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۵۲۴؛ [۴] ایضاً صفحہ ۵۲۵؛

ہے۔ بعض نے ہندوستان میں آنے کی اطلاعات بھی دیں لیکن کوئی خبر مستند نہ مل سکی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ نانا نے فقیری اور درویشی اختیار کر لی تھی اور چند ساتھی ان کے ہمراہ رہ گئے تھے۔ موت کی خبر بار ہا مشہور ہوئی۔ یہ بھی بار ہا سنا گیا کہ نانا کو دیکھا گیا ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں کئی مرتبہ مختلف آدمی نانا کے دھوکے میں گرفتار بھی ہوئے۔

آخری دور بیان کیا جاتا ہے نانا اس شرط پر اپنے آپ کو حوالے کرنے کے لیے تیار تھا کہ ملکہ وکٹوریہ اپنے ہاتھ سے خط لکھے اور اپنی مہر لگا کر فرانسیسی کمان افسر یا اس کے ماتحت کے ہاتھ بھیجے۔ عام انگریزوں کو دغا باز سمجھتا تھا۔ ایک خط میں اس نے میجر رچرڈسن کو لکھا تھا کہ زندگی دائمی نہیں، عارضی ہے:

پھر میں کیوں بے عزتی کی موت مروں؟ جب تک میں زندہ ہوں میرے اور تمہارے درمیان جنگ جاری رہے گی۔ خواہ میں مارا جاؤں یا مجھے قید ہونا یا پھانسی پانی پڑے۔ میں جو کچھ کروں گا، تلوار کے بل پر کروں گا۔

بہرحال وہ بہرائچ سے ترائی کے جنگلوں میں چلا گیا۔ ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ قدرت نے اسے غیر معمولی تاریخی احساس سے بہرہ مند کیا ہوگا:

ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ بعد میں اسے کیا حالات پیش آئے۔ حکومت نیپال کو یقین تھا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ حکومت ہند کو اس باب میں پورا اطمینان نہ تھا۔ نانا نے ایسے کابوس کی شکل اختیار کر لی، جس سے بہ آسانی چھٹکارا ممکن نہ تھا۔[1]

---

[1] سین کی کتاب صفحہ ۳۷۰۔

اہل وعیال

معلوم نہیں نانا نے کتنی شادیاں کیں۔ اس کی ایک بیٹی مینا کا ذکر بعض کتابوں میں دیکھا ہے۔ چند کنیزیں تھیں یعنی تاج بی بی، چندر خانم، گنگی افروز، حسینی خانم، حسینی کو سب پر فوقیت حاصل تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بڑی خوب صورت تھی ۱۸۵۷ء کے وقت اس کی عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔

وضع وعادات

ٹریویلین نے نانا کو اٹھائیس سال کی عمر میں دیکھا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ چالیس کا معلوم ہوتا تھا۔ جسم میں فربہی کے آثار نمایاں تھے۔ چہرہ گول، آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی، ان میں شیر کی آنکھوں کی سی چمک اور بے تابی پائی جاتی تھی۔ چہرے کا رنگ ایسا تھا جیسا اہل ہسپانیہ کا ہوتا ہے۔ بات چیت میں مزاج کی جھلک تھی۔

ڈاڑھی منڈواتا تھا، لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ڈاڑھی چھوڑ دی تھی۔ جتنی تصویریں نظر سے گزریں، ان میں ڈاڑھی تھی۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ نانا دربار کے موقع پر کمخواب کا لباس پہنتا تھا۔ اس کے پاس ایسے بیش بہا جواہرات تھے، جنھیں دیکھ کر انگریز سراپا مدح و ستایش بن جاتے تھے۔ طبیعت میں سخاوت تھی اور دل ہمدردی سے لبریز۔ لوگ اس سے بڑی محبت کرتے تھے۔
انگریزوں نے واقعاتِ قتل کے باعث سب سے بڑھ کر اس کی مذمت کی ہے۔

بالا صاحب اور راؤ صاحب

بالا راؤ بھی نانا کے ساتھ نیپال چلا گیا تھا۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ وہ ۱۸۵۹ء میں معافی مانگ کر واپس آنے کے لیے تیار تھا اور کہتا تھا کہ کان پور کے واقعاتِ قتل سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ترائی کی خراب آب و ہوا نے بالا راؤ کی صحت تباہ کر دی اور وہ جلد مر گیا۔

نانا کا بھتیجا راؤ صاحب مختلف مقامات پر لڑا۔ پھر وہ وسط ہند میں تانتیا ٹوپے سے جا ملا۔ بالآخر بھیس بدل کر اودے پور، دہلی، تھانیسر، جوالا مکھی، کانگڑہ ہوتا ہوا ریاست جموں کے ایک مقام چنانی میں مقیم ہو گیا۔ اودے پور میں بیوی بھی اس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

آخر ایک مرہٹے نے اس غریب کی مخبری کی۔ سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر نے جو دھوں پہنچ کر اس کی گرفتاری کا انتظام کیا۔ کانپور میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس نے اپنے بیان میں ہر واقعہ قتل سے کامل برأت کا اظہار کیا، کرنیل ․ بیمز نے کان پور کے حالات کی چھان بین کی تھی اور اکثر گواہیاں لی تھیں۔ ایک میں بھی راؤ صاحب کو ملزم نہ گردانا گیا تھا۔ با ایں ہمہ اس کے لیے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی اور ۲۰۔ اگست ۱۸۶۲ء کو اسے کان پور میں ناحق پھانسی دی گئی۔ لاش اس کی منہ بولی والدہ کو دے دی گئی جس نے گنگا کے کنارے آخری رسوم ادا کیں۔ بیوی بھی پاس تھی۔ تانا کے مشیر جوالا پرشاد کو مئی ۱۸۶۰ء میں ستی چوڑا گھاٹ کے قریب پھانسی دی گئی۔

جنرل بخت خاں

ابتدائی حالات

جنرل بخت خاں کے ابتدائی حالات تفصیلاً معلوم نہ ہو سکے۔ صرف اتنا پتہ چلا ہے کہ اس کے والد کا نام عبداللہ خاں تھا اور اسے نجیب الدولہ روہیلہ کے خاندان سے قرابت قریبہ تھی۔ اس خاندان پر نجیب الدولہ کے بیٹے ضابطہ خاں اور پوتے غلام قادر خاں دونوں کے عہد میں گردش کا دور آیا۔ یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ کب؟ لیکن ایسے ہی کسی ناساز گار وقت میں خاندان کے افراد بکھرے تو عبداللہ خاں نے اودھ کے ایک ضلع سلطان پور میں اقامت اختیار کر لی۔

وہ بڑا وجیہہ اور خوش رو تھا اور بہادری میں بھی یگانہ مانا جاتا تھا۔ غالباً انہیں اوصاف کی بنا پر شجاع الدولہ والیِ اودھ کے خاندان کی ایک شہزادی کی توجہات کا مرکز بن گیا۔ شادی ہو گئی۔ اس طرح پریشان روزگار عبداللہ خاں کا رشتہ والیانِ اودھ کے خاندان سے استوار ہو گیا۔[1]

نجب خاں کا بیان

منشی جیون لال نے اپنے روزنامچے میں ۱۱۔ مارچ ۱۸۵۷ء کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

[1] حیات علامہ فضل حق خیرآبادی بحوالہ بہادر شاہ ظفر ص ۲۳۶

بخت خاں نے بادشاہ (بہادر شاہ) کی بارگاہ میں عرض کیا کہ میں سلطان پور علاقہ لکھنؤ کا باشندہ ہوں اور اودھ کے شاہی خاندان سے میری رشتہ داری ہے۔ میری درخواست ہے کہ اس بیان کی تصدیق فرما لی جائے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ کسی تصدیق کی ضرورت نہیں۔ آپ یقیناً شریف و نجیب خاندان ہیں۔ سے ہیں۔ جنرل نے پھر عرض کیا، میں تصدیق پر اس وجہ سے زور دے رہا ہوں کہ جب انگریزوں کو دہلی، آگرہ اور میرٹھ سے نکال دیا جائے گا تو میں اعزاز کے کسی امتیازی نشان کے لیے استدعا کروں گا۔[1]

اس سلسلے میں یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ جیون لال کے بیان کے مطابق بخت خاں نے خود بادشاہِ دہلی کا ہم خاندان ہونے کا بھی ذکر کیا۔[2]

انگریزی فوج میں ملازمت

تمام روایتیں متفق ہیں کہ بخت خاں نے انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ وجہ خواہ یہ ہو کہ اس کی بے چین اور عزیمت دوست طبیعت سکون کی زندگی بسر کرنے پر راضی نہ تھی، خواہ یہ ہو کہ جو جاگیر اس کے خاندان کو حاصل تھی، وہ گزارے کے لیے کافی نہ تھی۔ البتہ ایک امر غور طلب ہے اور وہ یہ کہ جب اودھ کے فرمانرواؤں سے قرابت کا علاقہ تھا اور اودھ میں اچھی فوجی ملازمتوں کی کمی نہ تھی تو بخت خاں نے انگریزی ملازمت کو کیوں ترجیح دی؟ کیا اودھ کے فرمانرواؤں سے رشتہ داری ان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی کہ وہ بخت خاں کی سرپرستی پر آمادہ نہ ہوئے یا کیا بخت خاں کا والد پہلے سے

---

[1] روزنامچے (انگریزی) ص ۱۴۱، [2] ایضاً ایضاً ص ۱۴۶۔

انگریزی فوج میں ملازم تھا اور بیٹے نے بھی اسی کو پسند کیا یا کیا بخت خاں کو انگریزی فوج میں ملازم ہو کر سنئے فنون جنگ سیکھنے کے مواقع زیادہ نظر آتے ہو اور دھلی ملازمت میں میسر نہ آ سکتے تھے؟ ان سوالات کا کوئی قطعی جواب ہمارے سامنے موجود نہیں اور ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ بخت خاں نے انگریزی فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

توپ خانے کا اعزاز وہ پہلی جنگ افغانستان میں جنرل سیل کی فوج کے ہمراہ تھا اور اس وقت توپخانے ہی کا افسر تھا۔ رکٹس[1] نے لکھا ہے:

> بخت خاں توپخانے کی میدانی باٹری کا سب سے بڑا دیسی افسر تھا اور اس باٹری کے تمام توپچی دیسی تھے۔ یہ باٹری خاصی مشہور تھی، کیونکہ اس نے پہلی جنگ افغانستان میں جنرل سیل کے ماتحت بہ مقام جلال آباد اہم خدمات انجام دی تھیں اور اس کی توپوں پر بہ طور اعزاز پھولوں کا تاج بنا ہوا تھا۔[2]

ظاہر ہے کہ جس باٹری کو امتیاز کے طور پر ایک خاص نشان بنوا لینے کی اجازت دے دی گئی تھی، وہ یقیناً خاص حیثیت کی مالک ہوگی۔ باقی لوگوں نے بخت خاں کو توپخانے کا صوبیدار لکھا ہے اور ہومز کہتا ہے کہ وہ بڑا قابل اور ہوشیار صوبیدار تھا۔[3]

نیمچ اور بریلی افغانستان سے مراجعت کے بعد بخت خاں نیمچ میں رہا، جو گوالیار کی مشہور چھاؤنی ہے۔ پھر کچھ معلوم نہیں کہ کہاں کہاں

---

[1] RICKETS[2] دو روزنامچے (انگریزی) صفحہ ۲۳ احاشیہ، بیانِ رکٹس [3] ہومز ص۲۱۶

منتقل ہوا۔ البتہ میرٹھ میں سپاہ کا ہنگامہ شروع ہوا تھا تو وہ بریلی میں مقیم تھا[1]

ایک بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سپاہ میں بے چینی کے آغاز پہ توپخانے کو انگریز اپنی تحویل میں لے لینا چاہتے تھے جس شخص نے رو رو کر احتجاجیں کیں اور بڑے بڑے افسروں کی ہمدردیاں اسے حاصل ہوگئیں، وہ بخت خاں ہی تھا جو سرکشی کے بعد بریلی کے برگیڈ کا کمانڈار بنا اور دہلی پہنچا تو اسے سپہ سالار اعظم بنا دیا گیا[2]

افکار میں تبدیلی

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں کے افکار و عزائم پہلے وہ نہ تھے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں نمایاں ہوئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ وہ اپنے پیر مولوی سرفراز علی کے حکم کی بنا پر انگریزوں سے بیزار ہوگیا[3] افسوس کہ مفتی صاحب نے اس کی تفصیل بیان نہ فرمائی یعنی یہ کہ مولوی سرفراز علی کون تھے؟ بخت خاں نے کہاں ان کی بیعت کی؟ انھوں نے کیا حکم دیا تھا اور کیا کہہ کر اس کے دل میں انگریزوں کے خلاف جذبہ پیدا کیا تھا؟

ہمیں مولوی سرفراز علی کے مفصل حالات کہیں سے نہ مل سکے۔ ان کا ذکر یقیناً مختلف مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً مولوی ذکاء اللہ مرحوم لکھتے ہیں:

> دہلی میں جب باغی سپاہ کے افسر اعلیٰ بخت خاں و غوث محمد خاں و مولوی امام خاں رسالدار جمع ہوئے اور ان کے ساتھ مولوی عبدالغفار و مولوی سرفراز علی آئے تو پھر دہلی میں کا اجتماع دہلی میں شروع ہوا اور مولوی سرفراز علی جہادیوں کا میر لشکر اور بخت خاں اس کا معاون ہوا[4]

---

[1] میلی سن جلد دوم صـ۲۰۲ ؛ [2] ایضاً صـ۲۰۳ ؛ [3] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صـ۲۷ ؛ [4] میلی سن جلد سوم صـ۲۰۲ ؛

بالکل یہی مضمون حکیم احسن اللہ کے اس بیان میں درج ہے جو بہادر شاہ کے مقدمے میں دیا گیا تھا۔

میرا احساس یہ ہے کہ مولوی ذکاء اللہ نے جو کچھ لکھا، حکیم احسن اللہ خاں کے بیان ہی سے ماخوذ ہے اور حکیم صاحب کا درجہ طبابت یا بعض دوسرے علوم میں کتنا ہی بلند ہو تاہم ان کی دینی معلومات بہت ہی عامیانہ سی تھیں۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے "وہابی" کا لفظ ان مسلمانوں کے لیے استعمال کیا، جو سید احمد شہید کے مسلک پکار بند تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ جب کوئی اسلامی سرزمین کسی غیر مسلم طاقت کے قبضے میں چلی جائے تو مسلمانوں پر جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کے سرگرم داعی تھے۔ اسی لیے حکیم احسن اللہ خاں نے لکھا کہ بخت خاں خود "وہابی" تھا، جیسا کہ محمد غوث خاں اور مولوی امام خاں "وہابی" تھے۔ مولوی عبدالغفار اور مولوی سرفراز علی بھی "وہابی" تھے[1] اگر سید صاحب سے ان کا تعلق نہ تھا تو کم از کم یہ ضرور ماننا چاہیے کہ وہ جہاد کو بھی نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کی طرح اسلام کے ارکان میں سے سمجھتے تھے اور اس پر عمل ضروری جانتے تھے۔ بعض بیانات میں مولوی سرفراز علی کو جون پوری بتایا گیا ہے لیکن ان کے حالات نہیں بتائے گئے۔

بریلی میں پرچم آزادی

بریلی میں بے چینی تو اسی وقت شروع ہو گئی تھی، جب میرٹھ اور بعض دوسرے مقامات میں ہنگامے کے آغاز کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ ۳۱۔ مئی ۱۸۵۷ء کو حالات نزاکت کی آخری منزل پر پہنچ گئے اور ہنگامہ کی ابتدا آتش زنی سے ہوئی۔ مختلف روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خان بہادر خاں، ابن ذوالفقار خاں، ابن حافظ رحمت خاں؛ محمد شفیع اور بخت خاں اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) صفحہ ۲۸۲

اعلانِ آزادی کے بعد خان بہادر خاں کو روہیل کھنڈ کی حکومت سونپ دی گئی، اوّل اس لیے کہ روہیل کھنڈ میں پہلے انھیں کے خاندان کی حکومت تھی اور وہاں اعزاز و اکرام کا جو درجہ انھیں حاصل تھا، وہ کسی دوسرے کو حاصل نہ تھا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خان بہادر خاں مدت العمر ذمہ داری کے عہدوں پر فائز رہنے کے بعد پنشن لے چکے تھے اور انھیں ملک داری کے معاملات کا خاصا تجربہ تھا۔

ایک شبہ

میل سن کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ خان بہادر خاں کو غالباً بخت خاں کے متعلق منصب حکومت کی دعوے داری کا شبہ تھا، لہٰذا اسے آمادہ کیا گیا کہ فوج لے کر دہلی چلا جائے اور خان بہادر خاں نے خود بھی ساتھ جانے پر مستعدی کا اظہار کیا، بلکہ ایک منزل تک ساتھ بھی دیا۔ پھر مراجعت کی[1]

یہ شبہ بالکل بے سروپا ہے۔ دہلی جانے کا فیصلہ یقیناً اس بنا پر ہوا ہوگا کہ مجاہدینِ آزادی کا اصل مرکز دہلی میں تھا اور وہاں کی پوزیشن انگریزوں کے مقابلے میں حد درجہ مستحکم رہنی چاہیے تھی۔ اگر دہلی کو انگریزوں کے مقابلے میں محفوظ رکھا جا سکتا تو دوسرے مقامات کے مجاہدین زیادہ سے زیادہ سرگرمی سے کام کرتے لیکن اگر دہلی کا مرکز چھن جاتا، تو دوسرے مقامات پر بھی یقیناً افسردگی طاری ہو جاتی جیسا کہ ہوئی۔ یہاں رقابت کا کوئی سوال نہ تھا، اس لیے کہ نہ بخت خاں روہیل کھنڈ کی ریاست کا مدعی تھا، نہ اس کے بعد کے دور میں کسی جگہ کی حکومت طلب کی۔ نہ عہدے اور منصب سے وہ کبھی متاثر ہوا۔ جس حیثیت میں بھی کام کا موقع ملا، برابر اس میں لگا رہا۔ جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ خان بہادر خاں سے اس کے تعلقات آخری دم تک حد درجہ خوش گوار رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز ہر معاملے کو اپنے ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے اور مجاہدینِ آزادی میں سے

---

[1] میل سن جلد سوم صفحہ ۲۰۳

بہت ہی کم لوگ ہیں، جن کے متعلق انھوں نے ہمیں حسن ظن سے کام لیا ہو۔

دہلی میں ورود

میل سن نے لکھا ہے کہ دیل کھنڈ یا بریلی کا بریگیڈ (جیسا کہ بخت خاں کا بریگیڈ مشہور تھا) یکم اور ۲۔جولائی کو دہلی میں داخل ہوا اور اس میں مندرجہ ذیل رجمنٹیں شامل تھیں!

۱۔ ۱۸ پیادہ
۲۔ ۲۸ "
۳۔ ۲۹ "
۴۔ ۶۸ "
۵۔ ۸ بے قاعدہ رسالہ
۶۔ ۱۵ گھوڑا باٹری
۷۔ دو چھ پونڈ کے گولے والی توپیں[1]

جیون لال کے روز نامچے میں یکم جولائی کے حالات کے ماتحت درج ہے:

محل میں خبر آئی کہ بریلی کی فوج جمنا کے کنارے آ پہنچی ہے۔[2]

چونکہ پل خراب ہو چکا تھا اور اس پر سے گزرنے کی کوئی صورت نہ تھی، لہٰذا بادشاہ نے چار سو تیلیوں اور سفر مینا کی دو کمپنیوں کو میر فتح علی کی سرکردگی میں پل کی درستی کے لیے بھیج دیا۔ اس اثنا دوربین کے ذریعے سے بریلی کی فوج کا معائنہ کیا۔ فوج کے ہاتھیوں اور رسالے کے متعلق اظہار رائے بھی فرمایا۔ پھر معلوم ہوا کہ:

---

[1] میل سن جلد دوم ص ۲۲۵ حاشیہ۔ [2] دو روز نامچے انگریزی ص ۱۳۲۔ خواجہ حسن نظامی نے ان روز نامچوں کا جو ترجمہ "غدر کی صبح و شام" کے نام سے چھاپا تھا اس میں یہ موجود نہیں۔ غالباً اتفاقیہ ترجمہ نظر انداز ہو گیا۔

صبح تک پل سے بریلی کی فوج گزر سکے گی۔ بادشاہ نے احمد قلی خاں کو اس فوج کے استقبال کا حکم دیا۔[1]

بادشاہ سے ملاقات

۲۔ جولائی کے حالات میں مرقوم ہے کہ نواب احمد قلی خاں فوج بریلی کے استقبال کی غرض سے گئے۔ حکیم احسن اللہ خاں، جنرل صمد خاں، ابراہیم علی خاں، غلام علی خاں اور دوسرے اصحاب بھی تھے۔ احمد قلی خاں اور بخت خاں نے بارگاہ شاہی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ جہاں ارشاد ہو فوج کو متعین کر دیا جائے۔

بادشاہ نے پہلے سے حکم جاری کر رکھا تھا کہ شہر کے باشندوں کو ہرگز نہ لوٹا جائے اس موقع پر فرمایا:

میرے احکام جاری کرنے سے فائدہ کیا ہوگا؟ ان احکام کی تعمیل ہوتی نہیں اور نہ یہاں کوئی ایسا آدمی ہے جو انھیں نافذ کر سکے۔ میرا فرمان یہ ہے کہ انگریزوں کے لیے یہاں رہنے کی گنجایش نہ چھوڑی جائے۔

بخت خاں نے عرض کیا کہ میں سپہ سالار کی حیثیت میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں تاکہ عام ڈسپلن بحال ہو جائے۔ بادشاہ نے نشان مودت کے طور پر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

بخت خاں اپنی فوج میں پہنچا تو صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات

---

[1] دو روز نامچے صفحہ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ تھیو فلس مٹکاف نے اردو روز ناموں کا ترجمہ انگریزی میں کرتے وقت ناموں کے متعلق متعدد مقامات پر غلطیاں کی ہیں مثلاً یہاں "محمد علی خاں" نام لکھا تھا حالانکہ یہ نواب احمد قلی خاں تھے یعنی زینت محل کے والد اور بہادر شاہ کے خسر۔

قبول فرمائی ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ آپ میں سے کون کون میرا حکم ماننے کے لیے تیار ہے؟
سب نے بخت خاں کی اطاعت و وفاداری کا حلف اُٹھایا۔

منصب سالاری

پھر اس نے دوبارہ بادشاہ سے ملاقات کی۔ عبدالرحمان خاں والی جھجر کے دار وغہ کو حکم ملا کہ لال محل[1] بخت خاں کی فوج کے لیے خالی کر دیا جائے۔ اس کی تعمیل ہوئی۔ پھر بخت خاں۔ نے شہزادہ میرزا مغل سے ملاقات کی:

> محمد بخت خاں کو ایک ڈھال اور ایک تلوار کے علاوہ "جنرل" کا خطاب دیا گیا اور اسے تمام افواج کا کمانڈر اعظم بنا دیا گیا۔ منادی کرا دی گئی کہ تمام رجمنٹوں کے افسر محمد بخت خاں سے ہدایت حاصل کریں۔ میرزا مغل کو ایڈجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا۔

محمد بخت خاں نے عرض کیا کہ اگر شہزادوں نے شہر میں لوٹ مار کی کوشش کی تو میں ان کے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔ بادشاہ نے فرمایا:

> تمھیں پورا اختیار ہے۔ جس کام میں بہتری نظر آئے، وہی کرو۔ اس فرمان کے مطابق شہر کے کوتوال کو اطلاع دے دی گئی کہ اگر اب لوٹ مار ہوئی تو تمھیں پھانسی دے دی جائے گی۔[2]

بہادر شاہ کے ایک فرمان سے مترشح ہوتا ہے کہ بخت خاں کو "معز الدولہ" کا خطاب بھی ملا تھا۔[3] ایک بیان یہ ہے کہ اسے "فرزند" کا خطاب بھی عطا ہوا تھا۔[4]

---

[1] اصل نام "کلاں محل" تھا اور عام لوگ اسے کالا محل کہتے تھے۔ [2] "دو روزنامچے" صفحہ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔

[3] "بہادر شاہ کا مقدمہ" انگریزی صفحہ ۶۲۔ [4] "دو روزنامچے" ص ۱۳۸۔ ایک بیان کے مطابق اسے "بخت بلند خاں" خطاب ملا تھا (۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ص ۶۵)، لیکن یہ ۲۰ مئی کا واقعہ بتایا گیا ہے۔ اس وقت تک بخت خاں دہلی آیا ہی نہ تھا۔

فوج کی کیفیت خود بخت خاں نے فوج کی جو کیفیت بتائی وہ ذیل میں درج ہے:

۱۔ چار پیادہ رجمنٹیں،

۲۔ سات سو سوار،

۳۔ چھ اسپ سوار توپیں،

۴۔ تین میدانی توپیں،

۵۔ چودہ ہاتھی،

۶۔ تین سو کوتل گھوڑے جو باڑے کے اصطبل سے حاصل کیے گئے تھے۔

۷۔ ایک سو مجاہدین، جنھیں بعض لوگوں نے علما، قرار دیا ہے۔

یہ بھی بتایا کہ میں نے فوج میں چھ ماہ کی تنخواہ پیشگی تقسیم کر دی ہے اور چار لاکھ روپے نقد اپنے ساتھ لایا ہوں۔ غرض میں بادشاہ سلامت کو کسی امداد کے لیے تکلیف نہ دوں گا۔ اگر مجھے کامیابی حاصل ہوئی تو مال غنیمت خزانہ عامرہ میں داخل کر دوں گا۔ بادشاہ نے فوج بریلی کی ضیافت کے لیے چار ہزار روپے تقسیم کرنے کا حکم دیا۔[1]

سید ظہیر دہلوی فرماتے ہیں کہ بخت خاں چودہ ہزار کا کیمپ، چند توپ خانے، دو تین رجمنٹیں سواروں کی اور کئی لاکھ روپے خزانہ بریلی سے لے کر دہلی پہنچا۔[2]

میرا خیال ہے کہ فوج کی تعداد زیادہ بیان ہوئی ہے۔ سید ظہیر کو یہی اطلاع ملی ہوگی۔

ہومز کا بیان ہومز نے لکھا ہے کہ اگرچہ پے در پے امتناعی احکام جاری ہوتے رہتے تھے، لیکن شہر میں لوٹ مار جاری تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ بادشاہ کے پاس روپیہ نہ تھا جو سپاہیوں میں تقسیم ہوتا رہتا اور وہ اپنی ضرورتوں کے باب میں

---

[1] دو روزنامچے ص ۱۳۵ ۔ [2] "داستان غدر" ص ۹۷۔

مطمئن ہو جاتے۔ مجبور ہو کر وہ شہریوں کو لوٹتے تھے۔

آخر توپخانے کا ایک ہوشیار صوبیدار مسمی بخت خاں بریلی کی فوج کے ساتھ پہنچا اور بادشاہ کی عنایت سے فوج کی کمان سنبھال لی۔ بادشاہ میرزا مغل کے مغرورانہ و متکبرانہ طرز عمل سے بہت خفا تھا۔ بخت خاں نے بے لگام سپاہ کو قابو میں رکھنے کی انتہائی کوشش کیں، لیکن وہ غریب تائید وحمایت کے بغیر کیا کر سکتا تھا؟[1]

مہر کی تیاری

معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے بخت خاں کے لیے ایک مہر بھی تیار کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اس زمانے میں بدرالدین علی خاں دہلی میں بہترین مہر کن تھا۔ اگست کو اس کے نام حکم جاری ہوا:

تمھیں ہدایت کی جاتی ہے کہ ہمارے مشیر سلطنت کے لیے ایک مہر تیار کر کے پیش کرو، جس کی وضع قطع بھی بہت عمدہ ہو اور اس کی تیاری میں بھی حسن وخوبی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ اس میں مومی الیہ کے تمام خطابات درج ہوں۔ یعنی "معز الدولہ، مابدولت کا بندۂ خاص محمد بخت خاں لارڈ۔ گورنر بہادر، ناظم جملہ امور فوجی و دیوانی۔ دستور کے مطابق اس میں اکیس سن جلوس درج کیا جائے۔"[2]

---

[1] ہومز صفحہ ۲۴۲ - ۲۴۳۔

[2] بہادر شاہ کا مقدمہ انگریزی ص۱۲۱۔

انگریزوں سے پہلی جنگ

بخت خاں نے دہلی پہنچتے ہی انگریزی فوج کے ساتھ زبردست جنگ کا فیصلہ کر لیا۔ اس زمانے میں ہنری برنارڈ انگریزی فوج کا کمانڈر تھا اور اس نے ۲۔ یا ۳۔ جولائی کو شہر پر حملے کی ایک سکیم بنائی تھی۔ وہ اس وجہ سے ملتوی کرنی پڑی کہ اطلاع مل گئی تھی خود انگریزی فوج پر ایک زبردست حملہ ہونے والا ہے۔ نیز ایک پلٹن میں بغاوت کے کچھ آثار نمودار ہو گئے تھے۔

بخت خاں نے فیصلہ کیا تھا کہ حملہ ۳۔ جولائی کی صبح کو ہو۔ اس سے جنرل موصوف کی مستعدی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ طویل سفر کے بعد ۲۔ جولائی کو دہلی پہنچا تھا اور قیام کے انتظامات نیز بعض مشوروں میں خاصا وقت صرف ہوا۔ تاہم اس نے کارروائی کے آغاز میں غیر ضروری توقف روا نہ رکھا۔

افسوس کہ ہمیں اس حملے کی تفصیلات دیسی ذرائع سے نہ مل سکیں اور جو کچھ یہاں درج کیا جا رہا ہے وہ صرف انگریزوں کی اطلاعات پر مبنی ہے جنھیں یقینی طور پر درست ماننا اس وقت تک مشکل ہے جب تک کسی دوسرے ذریعے سے تصدیق نہ ہو جائے۔

انگریزی بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ حملہ ۳۔ جولائی کی صبح کے بجائے ۳۔ اور ۴۔ کی درمیانی شب میں ہوا۔ بخت خاں کا جیش، جس میں سوار، پیادے اور توپ خانے والے کل چار پانچ ہزار آدمی ہوں گے، رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر علی پور کی طرف بڑھا۔ گویا اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں پر پیچھے سے حملہ کرے۔ اس اثنا میں زخمیوں کا ایک قافلہ انبالہ بھیجا جا رہا تھا نیز فیروز پور سے سامانِ جنگ اور نقد روپیہ آ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں قافلوں پر حملہ کرنا مقصود ہو۔

عمومی کیفیت

میجر کوک[1] کو فوج دے کر مقابلے پر بھیجا گیا۔ اس میں پیادے بھی تھے سوار بھی، اور توپخانہ بھی۔ میجر کوک کے نام کی دھاک بھی خاصی بیٹھی ہوئی تھی، لیکن:

> نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ زمین دلدل ہو رہی تھی۔ پیش قدمی کی رفتار بہت سست تھی۔ ہم بڑی تاخیر سے کام شروع کر سکے۔ ۹۔ جولائی کو صبح کے وقت ہمارے کالم نے سپاہیوں کی رجمنٹیں دیکھیں، جب وہ علی پور سے واپس آ رہی تھیں۔ ہماری توپوں کی گولہ باری شروع ہوگئی لیکن کوک نے درمیانی فاصلے کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا۔ ہلکی توپوں کا اثر غنیم پر کچھ نہ پڑ سکا اور ہماری پیادہ فوج لڑائی میں حصہ لینے کے لیے بروقت نہ پہنچ سکی۔ سپاہیوں کا جرنیل بخت خاں ہمارے قریب آنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے اپنی فوج کو پیچھے ہٹا کر دہلی کا رخ کر لیا۔ وہ کچھ سامان بھی پیچھے چھوڑ گیا جو زیادہ تر رسد کے مالِ غنیمت پر مشتمل تھا ــــ گولہ بارود کی گاڑیاں یا چھوٹے کارتوسوں کے چند بورے۔[2]

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ دہلی سے آٹھ دس میل باہر نکل کر حملہ کرنے کے باوجود کیوں زبردست جنگ نہ ہوئی اور کس وجہ سے بخت خاں نے لڑے بغیر مراجعت منظور کر لی۔

بعض انگریزی روایات سے واضح ہوتا ہے کہ گوروں کو آفتاب کی حدت نے

---

[1] COKE

[2] میلی سن جلد دوم ص ۲۲۵۔ ۲۲۶

سخت پریشان کر دیا تھا۔ وہ درختوں کے سایے میں گر گر جاتے تھے اور انھیں کیمپ میں لانے کے لیے ہاتھی بھیجنے پڑے۔ ہڈسن کہتا ہے کہ اس لڑائی میں تیس چالیس گورے مارے گئے اور میرے تین دیسی افسر عارضی طور پر لڑائی کے ناقابل ہو گئے۔[1]

جیون لال کا بیان

جیون لال کے روزنامچے میں بھی ایک جگہ اس لڑائی کا ذکر ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بخت خاں خود فوج کے ساتھ نہیں گیا تھا، صرف دو رجمنٹوں کو بھیج دیا تھا تاکہ انگریزوں کی رسد کے سلسلے کاٹ دیے جائیں۔ وہ دونوں رجمنٹیں سامان کی دو بھری ہوئی گاڑیاں لے کر واپس ہوئیں۔ کشمکش میں پٹیالہ کی فوج کے نو سوار مارے گئے۔ علاوہ بریں ان رجمنٹوں نے علی پور میں توپ خانے کی باٹری قائم کر دی۔ انگریزوں نے رات کے وقت اس پر حملہ کیا جس میں آٹھ سو سپاہیوں کا نقصان ہوا۔

اب سوچیے کہ میل سن لکھتا ہے، مال غنیمت انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ جیون لال نے تصریحاً کہا ہے کہ مال غنیمت شہر کے اندر پہنچا۔

ایک اور بیان مظہر ہے کہ بخت خاں نے دس ہزار پیادوں اور رسالے کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کیا۔ بہت سے آدمی اور افسر مارے۔ انگریزوں کے توپخانے نے بخت خاں کو پہچان لیا۔ اس جنگ میں مجاہدین بھی ساتھ تھے۔ جب انگریزی توپوں کا رخ حملہ آوروں کی طرف ہوا تو وہ شہر کی طرف پلٹ گئے۔

دہلی میں انتظامات

بخت خاں کے پہنچنے سے پیشتر دہلی کے حالات بڑے ابتر تھے۔ بہادر شاہ اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ وہ کوئی کام خود دیکھ ہی نہ سکتا تھا۔ شہزادوں میں میرزا مغل، میرزا خضر سلطان اور میرزا ابوبکر تمام معاملات کی باگ

---

[1] میل سن جلد دوم صفحہ ۴۲۶ حاشیہ۔

خود سنبھالے بیٹھے تھے، انھیں انتظام کا کوئی بھی سلیقہ نہ تھا۔ جن آدمیوں نے ان کی حاشیہ نشینی اختیار کر لی تھی، وہ بھی حالات سے عموماً ناواقف تھے اور خوشامد یا احمقانہ بنیاں آرائیوں کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ بخت خاں نے سپہ سالار اعظم بنتے ہی اصلاح احوال کے لیے کوششیں شروع کر دیں، افسوس کہ شہزادوں کی مداخلت اور ان کے مشیروں کی خود غرضیوں کے باعث مقصد پورا نہ ہو سکا، یہاں تک کہ دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

بخت خاں کی مساعیٔ اصلاح کا سرسری مرقع یہ ہے:

۱۔ دربارِ دہلی کی سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کے پاس روپیہ نہ تھا۔ بخت خاں نے جہاں لوٹ مار بند کی، نظم قائم کیا، وہاں ساہوکاروں اور سیٹھوں کے ذریعے سے روپیہ قرض لینے کے لیے بھی تدبیریں اختیار کیں۔ اس کے حوالے منشی جیون لال کے روزنامچے میں جا بجا ملتے ہیں، یہاں تک کہ خود بادشاہ نے بھی اپنے ملازموں کی تنخواہوں کا انتظام اسی کے ذمے لگا دیا تھا۔[1]

۲۔ اس نے منادی کرا دی کہ تمام دکاندار اپنے پاس ہتھیار رکھیں۔ جن کے پاس ہتھیار نہ ہوں، وہ مفت سرکار سے لے جائیں۔ جو سپاہی لوٹ مار کرتا ہوا پکڑا جائے گا، اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ جس کے پاس گولی بارود ہو، وہ میگزین کے حوالے کر دے ورنہ سزا پائے گا۔[2]

۳۔ شہر میں چینی اور نمک کی درآمد پر محصول لگا دیا گیا تھا۔ بخت خاں نے اسے موقوف کرایا اور کہا کہ محصول باقی رہا تو ان جنسوں کی درآمد رک جائے گی۔ عوام بھی تکلیف اٹھائیں گے اور فوج بھی پریشان ہو گی۔[3]

۴۔ جس شخص پر انگریزوں کی طرف داری کرنے یا انھیں چھپانے کا الزام لگتا تھا، اس کے

---

[1] روزنامچہ ص ۱۳۶، [2] ایضاً ص ۱۲۵، [3] ایضاً ص ۱۵۲۔

گھر پر سب چڑھ دوڑتے تھے۔ چنانچہ نواب جھجر کے ایک ہندو داروغہ پر ایسا ہی الزام لگا اور لوگوں نے اس کی پچاس ہزار کی جائداد لوٹ لی۔ بخت خاں کو پتہ چلا تو سپاہی اس ظلم کی روک تھام کے لیے بھیج دیے۔[1]

۵۔ بہادر شاہ کی ایک بڑی کوشش یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ نہ پڑے۔ اسی مصلحت کے پیش نظر اُس نے شہر میں ذبیحہ گاؤ بند کرا دیا تھا۔[2]

۶۔ بخت خاں نے مختلف راجاؤں اور والیانِ ریاست سے بھی خط و کتابت کا انتظام کیا تھا اور بعض کی عرضداشتیں اسی کے ذریعے سے دربار میں پیش ہوتی تھیں۔

اختلافات اور رقابتیں

افسوس کہ شہزادوں کو بخت خاں کی یہ کارکردگی اور [illegible] ایک آنکھ نہ بھائی۔ انھوں نے مختلف ذریعوں سے دراندازیاں شروع کر دیں۔ ان کے خاص کارندوں نے شکایتیں کیں کہ ہمیں بخت خاں کی قیادت منظور نہیں اور ہم میرزا مغل ہی کو اس بڑے اعزاز کے لیے موزوں سمجھتے ہیں۔ پھر کہا گیا کہ جب تک بخت خاں نہیں آیا تھا، انگریزوں سے روزانہ لڑائیاں ہوتی تھیں اور جب سے بخت خاں نے دہلی میں قدم رکھا ہے، لڑائیاں بالکل بند ہو گئی ہیں۔ یہ الزام سراسر غلط تھا، اس لیے کہ ابتدا میں انگریزی فوج بہت تھوڑی تھی اور اس کے پاس سازو سامان بھی کم تھا۔ اس کے تمام مورچے بھی تیار نہ ہوئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی تعداد اور سازو سامان کی مقدار ترقی پذیر رہی۔ یقیناً انگریزوں پر حملہ جتنا آسان ابتدائی دور میں تھا، اتنا آخری دور میں نہیں رہا تھا۔ تاہم لڑائیاں برابر ہوتی رہیں۔

خود میرزا مغل نے بھی بخت خاں کے خلاف شکایات میں تامل نہ کیا۔ مثلاً اُس نے ایک عرضداشت لکھی کہ پہلے قرض کے انتظام کا حکم مجھے دیا گیا تھا، اب بخت خاں

---

[1] روزنامچے ص۱۶۶ ۔ [2] ایضاً ص۱۰۱ ۔

کو مختار بنا دیا گیا۔ مناسب یہ ہے کہ حضور بخت خاں کو روک دیں۔ جو قرض کا انتظام کر چکا ہوں؟

فوج کی تقسیم

ان جھگڑوں اور شکایتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ نے فوج کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے کی سالاری میرزا مغل کو دے دی، دوسرے کی بخت خاں کو اور تیسرا حصہ غالباً میرزا ابوبکر بن شہزادہ فخرو بن بہادر شاہ کے حوالے کیا۔ یہ تفریق و تقسیم احوال جنگ پر ہرگز اچھا اثر نہ ڈال سکتی تھی۔ انگریزوں نے دہلی کے خلاف خاصی بڑی قوت فراہم کر لی تھی، اس کے مقابلے کے لیے مجاہدین میں اتحاد و اتفاق حد درجہ لازم تھا۔ افسوس کہ شہزادوں نے اس کا کوئی موقع نہ چھوڑا۔ پھر لطف یہ کہ وہ نہ فنونِ جنگ سے آگاہ تھے، نہ انھیں اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کا کوئی صحیح تصور تھا اور نہ یہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ رعایا کی دلداری اور تالیفِ قلوب کی مناسب تدبیر اختیار کر سکتے ہیں، جن کے بغیر کسی کو ساتھ ملانا ممکن ہی نہ تھا۔

بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ بخت خاں نے خود کہہ دیا تھا کہ میں صرف اپنی فوج کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں۔ باقی سے مجھے کوئی سروکار نہ ہوگا۔

حقیقت کچھ ہو، ایک طرف حالات ناسازگار ہوتے چلے گئے، دوسری طرف دہلی کے اندرونی نظم و نسق میں تفرقے کی کارفرمائی بڑھ گئی۔

انگریزوں کے خلاف منصوبے

اس دور میں بھی بخت خاں کا دماغ انگریزوں کے خلاف منصوبے سوچنے میں لگا رہا۔

منشی جیون لال نے ۴۔ اگست کے حالات میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے کوئی ڈیڑھ سو فوجی افسر بلائے اور ان سے کہا کہ میں نے میرزا مغل اور جنرل بخت خاں کو فوجوں کی قیادت کے لیے

لہ مقدمہ بہادر شاہ انگریزی صفحہ ۶۶

تجویز کیا ہے، انھیں ان میں سے جو پسند ہو، اُسے منتخب کر لو۔ ہمارے لشکری ہر وقت بڑھا نکلتے رہتے ہیں کہ ہم انگریزوں سے لڑنے کے لیے جا رہے ہیں، لیکن لڑتے نہیں اور واپس چلے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ انگریز دہلی لے لیں گے اور مجھے قتل کر دیں گے۔ افسر اس گفتگو سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضور ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں، ہم جانیں لڑا دیں گے۔ بخت خاں نے کہا: اب خدا کے فضل سے میں ضرور کامیابی حاصل کروں گا۔ میری تجویز یہ ہے کہ انگریزوں پر علی پور کی جانب سے حملہ کروں۔[1]

گویا بخت خاں آخری دم تک اس کوشش میں سرگرم رہا کہ جس انگریزی فوج نے دہلی کا محاصرہ کر رکھا تھا، اس کا تعلق پنجاب، انبالہ اور فیروزپور سے توڑ دیا جائے۔ ۵۔ ستمبر کے حالات میں مرقوم ہے کہ بخت خاں میگزین کو شہر سے باہر لے جانا چاہتا تھا اور اس نے چالیس توپوں کے لیے دمدمے بنانے کا انتظام شروع کر رکھا تھا۔[2]

انتظامِ جہاد

بخت خاں کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی ایک مرتبہ بعض علما نے جامع مسجد میں جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ بخت خاں نے تمام علما کو جمع کر کے کہا کہ جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیں۔ چنانچہ یہ فتوے جاری ہوا۔ مقصود یہ تھا کہ اس کے ذریعے سے مسلمانوں میں مذہبی جوش پیدا ہو۔ سرسید نے لکھا ہے کہ ایسا کوئی فتوے حقیقتاً موجود نہ تھا اور بعض علما کے دستخط بنا لیے گئے تھے۔ نیز جن علما کے دستخط فتوے پر چھپے تھے، ان میں سے بعض نے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔[3]

ممکن ہے یہ رائے درست ہو، لیکن اعلانِ جہاد کے بعد کسی پناہ گیر کی جان بچانا اور

---

[1] دو روزنامچے ص ۱۴۱۔ [2] ایضاً ص ۲۲۱۔ [3] ایک انگریز عورت کی جان حضرت میاں نذیر حسین مرحوم محدث دہلوی نے بچائی تھی۔ یہ معلوم نہیں کہ ان کے دستخط فتوے پر ثبت تھے یا نہیں۔

اس کی حفاظت کرنا عین واجب ہے، اس میں تضاد کیا ہے؟ جہاد انھیں لوگوں سے ہے جو منظم جنگ کریں، باقی کسی کو چھیڑنا ہرگز جائز نہیں۔

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ ایک فتوے ضرور تیار ہوا تھا۔ یہی فتویٰ تھا جس پر دستخط کرنے کے باعث مفتی صدر الدین آزردہ کی جائداد ضبط ہوئی تھی اور انھیں نے "کتبت بالجزیہ" کو "کتبت بالجبر" قرار دے کر جان بچائی تھی۔ اسی فتوے پر دستخط کرنے کے باعث مولانا فضل حق خیرآبادی پر مقدمہ چلا تھا۔

دہلی سے روانگی

جب انگریز دہلی میں داخل ہو گئے تو عزیمت دوست بخت خاں نے اپنی فوج فراہم کی اور بادشاہ سے درخواست کی کہ میرے ساتھ لکھنؤ چلے چلیں۔ یہ بھی کہا کہ میں دہلی سے باہر تمام سپاہیوں کو اکٹھا کر کے پھر انگریزوں سے لڑوں گا۔ بادشاہ نے یہ مشورہ قبول نہ کیا اور بخت خاں لکھنؤ چلا گیا۔[1]

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور فرماتے ہیں کہ بخت خاں نے آخری دور میں دہلی کے اندر فوج کی کمانداری سنبھالی تھی۔ وہ دیانت کیش انسان تھا اور بڑے خلوص سے فتح حاصل کرنے کی کوششیں کیں، لیکن فوجی لیڈروں نے اسے شکست دلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ بخت خاں جب لڑائی کے لیے قدم اٹھاتا تو اسے بہت کم یا قطعاً کوئی امداد نہ دی جاتی۔[2]

میلی سن کا بیان

میلی سن نے تصریحاً لکھا ہے کہ بخت خاں ۱۹۔ ستمبر کو دہلی سے روانہ ہوا تھا۔ اس نے تمام جنگ آزماؤں کو ساتھ لے لیا تھا، جن پر اُسے پورا بھروسا تھا۔ اس وقت دہلی دروازے اور اجمیری دروازے سے لوگ باہر جا سکتے تھے۔ نیز جمنا کے پل سے بے تکلف گزر سکتے

۱۔ دو روزنامچے ص ۔ ۲۔ میلی سن جلد چہارم ص

لکھتے ہیں:

> بخت خاں نے بادشاہ کو ساتھ چلنے پر آمادہ کرنے کی غرض سے پورا زور کلام صرف کر دیا۔ اُس نے کہا کہ سب کچھ ضائع نہیں ہوا۔ بے شک انگریز شہر پر قابض ہو گئے ہیں اور قلعہ انھوں نے لے لیا ہے، لیکن پورا ملک ہمارے سامنے کھلا پڑا ہے۔ بادشاہ کے نام اور وجود کے سایے میں جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے اور کامیابی کے امکانات بھی موجود ہیں[1]

غرض وہ بہادر شاہ کی طرف سے مایوس ہو کر ۱۹۔ ستمبر کو نکلا اور ولیم میور نے فوجی اطلاعات کا جو مجموعہ شائع کرا دیا تھا، یہ بیان درست ہے تو ظاہر ہے کہ وہ بدایوں ہوتا ہوا ۲۳۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو فرخ آباد پہنچا۔ گویا دہلی سے فرخ آباد پہنچنے میں ایک مہینے سے زیادہ مدت صرف ہو گئی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں کہاں ٹھہرا، کیا کیا کارروائیاں کیں اور زیادہ وقت کس مقام پر گزارا؟

لکھنؤ میں سرگرمیاں

لکھنؤ پہنچنے کے بعد بخت خاں کی سرگرمیوں کے پورے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ وہ اوائل نومبر میں لکھنؤ وارد ہو گیا ہو گا اور آئندہ فروری تک یقیناً وہیں رہا۔ مختلف لڑائیوں میں اس کی شرکت ثابت ہے۔ ایک موقعے پر اس کی کچھ توپیں چھن گئیں، تو بہت غمگین ہوا۔ حضرت محل نے فرمایا: رنج نہ کرو، میں اور توپیں دوں گی[2] کہا جاتا ہے کہ حضرت محل نے

---

[1]

[2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۱۲

بخت خاں کو خلعت اور رومال بھی عطا کیا تھا۔ نیز وہ پانچ ہزار فوج لے کر گیا تھا۔ دہلی اور فرخ آباد کے بہت سے لوگ اس کے ہمراہ تھے اور تین سو عورتیں بھی اس کے قافلے میں شامل تھیں۔

آخری دور

جب لکھنؤ پر بھی انگریز قابض ہو گئے تو بخت خاں مولانا احمد اللہ شاہ کے ہمراہ شاہ جہاں پور کی طرف چلا گیا۔ پھر وہ محمدی ہوتا ہوا نیپال میں داخل ہو گیا۔ باقی عمر وہیں گزاری، لیکن یقینی طور پر کسی کو معلوم نہیں کہ کس حالت میں گزاری اور کب وفات پائی۔

بعض اصحاب نے فرمایا ہے کہ وہ سرحد آزاد میں پہنچ گیا تھا، لیکن میرے نزدیک یہ بیان صحیح نہیں۔ رکس رقمطراز ہے۔

> غدر کے اختتام پر بخت خاں کی بڑی جستجو کی گئی لیکن وہ کہیں نہ ملا، نہ اس کے متعلق کچھ سنا گیا۔ یہ یقینی ہے کہ وہ کسی لڑائی میں مارا نہ گیا۔ ایسا ہوتا تو ہمیں معلوم ہو جاتا۔ ایک دو توپیں بھی نہ مل سکیں[2]

ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ ۱۳ مئی ۱۸۵۹ء کی ایک لڑائی میں بخت خاں کے مارے جانے کی رپورٹ پہنچی تھی، تاہم صحیح یہی ہے کہ اس بارے میں کوئی ایسی اطلاع نہ

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۶۲۔ مفتی انتظام اللہ کا بیان نظر ثانی کا محتاج ہے کہ بخت خاں جب لکھنؤ پہنچا تو سلطان بہو بیگم خلد منزل کے پاس بہ سبب قرابت قریبہ ٹھہرا تھا۔ قیصر التواریخ جلد دوم سے واضح ہے کہ یہ بخت خاں کا ذکر نہیں۔ شہزادہ فیروز شاہ کا ذکر ہے۔ شہزادے کی سلطان بہو سے قرابت قریبہ تھی اور اس کے لیے حضرت محل نے پانچ ہزار روپے بطور ضیافت بھیجے تھے۔

[2] دو روزنامچے ص ۲۳۳ حاشیہ۔ مطلب بظاہر یہ ہے کہ بخت خاں توپیں بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

ملی جو قابلِ اعتماد سمجھی جاتی۔

سچے مجاہد کی زندگی

بخت خاں نے زندگی انتہائی سادگی میں گزاری۔ خصوصاً راہِ جہاد میں قدم رکھنے کے بعد ایسا لباس اختیار کر لیا تھا کہ اُس میں اور عام سپاہیوں میں کوئی فرق نہ رہا تھا۔ سید ظہیر دہلوی نے اسے دیکھا تھا۔ فرماتے ہیں:

> سر پر انگوچھا لپٹا ہوا، گرچ گلے میں پڑی ہوئی۔ یہی حال کھلا۔ بریلی والا جرنیل وہی تھا۔ بظاہر تو اُس کا لباس تھس خدول کا سا تھا۔ میں تو سمجھا جیسے اور پوربیے سپاہی ہیں، یہ بھی کوئی سپاہی ہی ہوگا۔[1]

پھر اسے توپ خانے میں وہ عہدہ حاصل تھا، جو اُس زمانے میں شاید بہت کم لوگوں کو نصیب تھا۔ اگر وہ اطمینان سے بیٹھا رہتا تو یقیناً مزید اعزاز حاصل کرتا، لیکن سلطانِ فرض کی پکار نے اسے انتہائی مشقتوں اور پریشانیوں میں مبتلا کر دیا۔ انجام کار غربت اختیار کرنی پڑی۔ ستائش کے مستحق وہی ہیں جو اپنے فرض سے بوجہ احسن سرخرو ہوں۔ اگرچہ راستے میں کتنی ہی مشکلات سے

---

[1] سید ظہیر دہلوی بڑے سلیم الطبع آدمی تھے، لیکن ان کی زندگی ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک قلعہ معلیٰ میں گزری تھی اور ان کے نزدیک قلعہ کے عام معیار کے مطابق انسانوں کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا معاملہ لباس پر رہ گیا تھا۔ بخت خاں کی سادگی کو دیکھ کر سید ظہیر نے سمجھ لیا کہ کوئی گھاس کھودنے والا ہوگا۔ یہ نہ سوچا کہ انسان کی عظمت لباس پر نہیں، نسل اور خاندان پر نہیں، دولت پر نہیں، صرف حسنِ عمل پر موقوف ہے۔

سابقہ پڑے اور گردوپیش مصیبتوں کی کتنی ہی بجلیاں کوندتی پھریں۔ بخت خاں نے فرض ادا کرنے میں قطعاً کوتاہی نہ کی۔ وہ سچّا مجاہد تھا اور مجاہدین کی شان کے ساتھ اس دُنیا سے رُخصت ہوا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

شہزادہ فیروز شاہ

حسب و نسب اس حقیقت میں شبہ نہیں کہ شہزادہ فیروز شاہ مغلوں کے شاہی خاندان کا ایک معزز رکن تھا، البتہ اُس کے نسب کا معاملہ ذرا تشریح طلب ہے۔

قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ شہزادہ فیروز شاہ میرزا ناظم بخت کا بیٹا اور فرخ سیر کا نواسا تھا۔[1] مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ ناظم بخت شاہ عالم ثانی کا فرزند تھا۔[2]

مجھے شاہ عالم ثانی کی پوری اولاد کا نقشہ بہ قید تاریخ ولادت نہ مل سکا۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ شاہ عالم کا بڑا بیٹا میرزا جواں بخت تھا، جو ابتدا میں ولی عہد ہوا۔ اس کی وفات پر دوسرے بیٹے کو ولی عہد بنایا گیا جو معین الدین اکبر شاہ ثانی کے لقب سے ۱۸۰۶ء میں مسند نشین ہوا۔ اکبر شاہ کی تاریخ ولادت ۱۷۵۹ء ہے۔ ناظم بخت بہرحال اس سے بہت چھوٹا ہوگا۔

اب سوچیے کہ فرخ سیر کی وفات ۱۷۱۹ء میں ہوئی۔ اگر اس کی کوئی بیٹی ۱۷۱۹ء میں بھی پیدا ہوتی تو وہ ناظم بخت کی ولادت تک بہت بوڑھی ہو چکی ہوگی۔ لہٰذا محولہ بالا بیان قابل قبول

۱؎ جلد دوم صفحہ ۶۳۲۔ میں نے ناظم بخت کو نظام بخت لکھا ہے لیکن یہ املا کی غلطی ہو (۲۱۰) ۲؎ غدر کے چند علماء صفحہ ۱۲۷

نہیں۔

ہاں، یہ مان سکتے ہیں کہ شہزادہ فیروز شاہ کا رشتہ والد اور والدہ دونوں جانب سے بہادر شاہ اوّل ابن عالمگیر اعظم سے ملتا تھا۔ والد کی جانب سے شاہ عالم ثانی، عالمگیر ثانی اور جہاندار شاہ کے واسطے سے اور والدہ فرخ سیر کی کسی بیٹی کی اولاد میں سے ہوگی۔ خود فرخ سیر عظیم الشان ابن بہادر شاہ اول کا بیٹا تھا۔

تاریخ پیدائش

تاریخ پیدائش کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ جنگ آزادی کے وقت شہزادہ فیروز شاہ نے خوب سرگرمی دکھائی اور اس کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس اور چالیس کے درمیان ہونی چاہیے۔[1] بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء تک زندہ تھا بلکہ میرے پاس تو ایک ایسی روایت بھی موجود ہے جس میں ۱۹۰۶ء تک اس کا زندہ ہونا بتایا گیا ہے۔ جن صاحب سے شہزادہ ملا تھا، ان کا بیان ہے کہ عمر ستر اور اسی کے درمیان ہوگی۔ اس وجہ سے سمجھنا چاہیے کہ شہزادہ کی ولادت ۱۸۲۰ء اور ۱۸۲۵ء کے درمیان ہوئی۔ بے شک یہ محض قیاس ہے۔ لیکن اس کی بنیادیں خاصی معقول ہیں۔

لکھنؤ سے تعلق

آگے چل کر معلوم ہوگا کہ شہزادہ جب جہاد کے سلسلے میں لکھنؤ پہنچا تو وہ قرابت قریبہ کے سبب سلطان بہو کے پاس قیام پذیر ہوا۔ یہ امجد علی شاہ کی بیگم تھی لیکن مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون تھی؟ آیا لکھنؤ کے شاہی خاندان میں سے تھی، یا اس سے شہزادے کے والد میرزا ناظم بخت کی قرابت تھی یا وہ مغلیہ خاندان کی کوئی شہزادی تھی، جس کی شادی لکھنؤ کے شاہی خاندان میں ہوئی تھی؟ میں نے صحیح کیفیت معلوم کرنے کی کوشش بہت کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔

---

[1] ڈاکٹر سین نے عمر بیس اور تیس کے درمیان بتائی ہے (۳۱۱)

ابتدائی حالات

شہزادے کے متعلق بتایا گیا ہے کہ والد نے علوم مروجہ اسے بخوبی سکھادیے تھے اور فنونِ حرب کی مشق بھی اس قدر کرادی تھی کہ وہ تمام فنون میں ماہر ہوگیا تھا۔ یہ چیزیں اس عہد کی تعلیم و تربیت میں شامل تھیں اور شہزادوں کے تعلق میں تو ان امور کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

بعد میں شہزادے نے جس سرگرمی سے جہادِ آزادی میں حصہ لیا، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طریقِ زندگی وقت کے عام شہزادوں کے خلاف خاصا زاہدانہ اور جفاکشانہ تھا۔ اگر وہ بھی دوسرے شہزادوں جیسا ہوتا تو چپ چاپ کہیں بیٹھا رہتا یا کسی لڑائی میں حصہ لیتا تو جوش، ہمت اور استقامت کے وہ ثبوت پیش نہ کرتا، جن کی تفصیل آپ آئندہ اوراق میں ملاحظہ فرمائیں گے۔

سفرِ حج

مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی طبیعت کا رجحان مذہب کی طرف بہت زیادہ تھا۔ شب و روز اوراد و وظائف کا مشغلہ رہتا تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ شہزادے نے بالاہتمام حج کیا، حالانکہ مغل شہزادوں کا عام طریقہ نہیں تھا۔ یقیناً وہ اس سفر میں تنہا نہ گیا ہوگا بلکہ ایک جماعت ساتھ ہوگی اور اس زمانے میں حج کے لیے اتنی سہولتیں میسر نہ تھیں، جتنی ہمارے عہد میں میسر ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شہزادہ ۱۸۵۶ء میں حج کے لیے گیا اور اسی سال اس نے حج کیا جو ۱۲ اگست ۱۸۵۶ء کو ہوا تھا۔ پھر غالباً مدینہ منورہ کی زیارت کرتا ہوا ۱۸۵۷ء میں ہندوستان آیا اور وہ وسط اگست ۱۸۵۷ء میں کھرود پہنچا، جو مندسور کے قریب ایک مقام ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ شہزادہ سورت سے جہاز پر سوار ہوا تھا اور اسی بندر پر واپس آیا[۱]

---

[۱] ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ وہ ۱۸۵۵ء میں حج کے لیے گیا اور مئی ۱۸۵۷ء میں بمبئی واپس آیا (ص ۱۱۳)

علمِ جہاد شہزادے کی آمد سے پیشتر ہندوستان میں آزادی کے لیے جنگ چھڑ چکی تھی اور مختلف مقامات میں معرکے بپا تھے۔ دہلی کا محاصرہ جاری تھا۔

قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ شہزادہ سفرِ مراجعت میں اندور پہنچا تو:

> خبر ہنگامہ فساد سن کر وہیں ٹھہرا جب حکم سرکار ان کی گرفتاری
> وقتل کا پہنچا تو یہ لُک کر نربدا پار آیا۔[1]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت اسے گرفتار کرکے قتل کر دینے کا تہیہ کر چکی تھی اور شہزادے نے جو قدم اٹھایا، اس میں مقصدِ آزادی کے علاوہ مقصدِ حفظِ ذات بھی شامل تھا۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ شہزادے جیسا صاحبِ عزیمت پیش آمدہ حالات میں خاموش نہ بیٹھ سکتا تھا۔ مغربی ہندوستان میں اس کے لیے تنظیم قواے ملی کے بڑے اچھے مواقع تھے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ ان سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ حکومت کی ظالمانہ روش نے اس کی سرگرمی کے لیے ایک نئے تازیانے کا کام دیا۔

مندسور مندسور ریاست گوالیار کا ایک مشہور مقام ہے جو اجین سے تقریباً اسی میل شمال میں واقع ہے۔ یہاں جولائی ۱۸۵۷ء میں ریاست گوالیار کی بعض سرکش افواج قابض ہو چکی تھیں۔ آہستہ آہستہ ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ پورے مغربی مالوہ میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑک اٹھی۔ اس مقام پر ادھر ادھر سے بہت سی فوج جمع ہو گئی تھی۔ یہی فوج تھی جس نے شہزادہ فیروز شاہ کو اپنا قائد و سپہ سالار بنا لیا۔

حالات خاصے نازک تھے۔ مندسور کے آس پاس متعدد مقامات تھے، جہاں ساز

---

[1] جلد دوم صفحہ ۲۹۵۔

بانڈے رشتے پہنچ چکے تھے۔ ریاست دھار کا نوجوان راجا اور اس کا وزیر رام چند۔ بالوجی، نیز راجا کی والدہ اور چچا انگریزوں کے خلاف بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ نیمچ اور بعض دوسرے مقامات میں بھی آگ سلگ رہی تھی۔ اگر یہ فوج ترتیب سے بمبئی کی طرف بڑھتی تو اس کے لیے خاصا خطرہ پیدا ہو سکتا۔ اس وقت ناناکی فوج کالپی میں تھی۔ اگر وہ وسط ہند کی طرف پیش قدمی کرتی تو انگریزوں کے لیے اس حصے میں بچاؤ کا کوئی بھی امکان باقی نہ رہتا۔ پھر شاہی خاندان کے ایک شہزادے کی قیادت کا شہرہ عام ہوتا تو عام لوگ دوڑ دوڑ کر ساتھ ہو جاتے۔

ایک اور بیان

لفٹننٹ جنرل شاورز[2] اس زمانے میں ریاست میواڑ کے اندر ریزیڈنٹ کے طور پر مامور تھا۔ اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "غدرِ ہند کا ایک بھولا ہوا باب"۔ اس کتاب میں زیادہ تر مغربی اور وسطی ہند کے وہ حالات بیان کیے تھے جن پر عام مورخین نے زیادہ توجہ نہ کی تھی یا انھیں زیادہ تر حالات معلوم نہ ہو سکے تھے۔ شاورز لکھتا ہے کہ وسط اگست میں ۔لوہ کے اندر سرکشی نے خاصی خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کی سالاری کا منصب فیروز شاہ نام ایک مذہب دوست اور مجاہد شہزادے نے سنبھال لیا۔ مندسور کے مسلمانوں نے دوسرے طبقوں کو ساتھ ملا کر ریاست گوالیار کی حکومت ختم کر دی اور شہزادے کی حکمرانی کا اعلان کر دیا۔

وہاں بہت سے میواتی، مکرانی اور افغان موجود تھے، وہ ساتھ ہو گئے۔ مندسور کا حاکم اور کوتوال زخمی ہوئے۔ ایک افسر مارا گیا۔ پھر حاکم کے محل پر حملہ ہوا۔ خزانہ لوٹ لیا گیا۔ دفاتر جلا دیے گئے۔ "مرزاجی" نام ایک شخص کو جو وہاں کے قدیم امرا میں سے تھا، وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اہتمام کا یہ عالم تھا کہ جنوب سے تمام رستے منقطع

---

۲ SHOWERS

کر دیے گئے۔ انگریز کوئی خبر نہ بھیج سکتے تھے۔ سرکاری ڈاک کا سلسلہ بند کر دیا گیا۔ انگریزوں نے قاصدوں کے ذریعے سے خبریں بھیجنے کی کوشش کی تو انھیں پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا[1]

شہزادے کی تگ و دو

ہمیں متفرق لڑائیوں کا ذکر یہاں نہ کرنا چاہیے میرا اندازہ ہے کہ شہزادہ جلد سے جلد دہلی پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اس مرکز کو تقویت پہنچائی جائے، جس پر باقی حصوں میں جنگ جاری رکھنے کا انحصار تھا۔ قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ شہزادہ گوالیار سے دھول پور پہنچا اور وہاں کے تحصیلدار سے ایک لاکھ روپیہ لیا، مگر وہاں دہلی کے فتح ہو جانے کی خبر سنی تو آگرہ کا رخ کر لیا۔ ایک روز آگرہ کا محاصرہ بھی جاری رکھا، بعد ازاں میوات چلا گیا۔ وہاں سے شیخ فضل الٰہی۔ رسالدار اور جنرل عبد الصمد خاں کو ساتھ لے کر فرخ آباد اور شاہجہان پور ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچ گیا[2]

میلسن کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ شہزادہ انگریزوں کے حملے کے وقت دہلی کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اب شہر پر حملہ بے سود اور بے نتیجہ ہوگا تو دہلی سے مجاہدین کی جو فوجیں باہر نکل چکی تھیں، ان میں سے خاصی بڑی تعداد کو ساتھ لے کر ۲۶ ستمبر کو متھرا پہنچا۔ وہاں اس کے ساتھ ایک اور فوج مل گئی جس میں زیادہ تر دیسی پیادہ فوج کے آدمی تھے اور ہیرا سنگھ اس کا صوبیدار تھا۔ پھر وسط ہند سے جو لوگ آئے تھے، وہ بھی شامل ہو گئے[3] آگرہ کے لیے یقیناً بھاری

---

[1] شاور ز کی کتاب صفحہ ۸۹-۹۲۔ ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ مندسور سے شہزادے کو نکال دیا گیا تھا اور وہ درویش بن کر مسجد میں بیٹھ گیا تھا۔ اسی حالت میں افغان اور مکرانی اس کے پاس جمع ہوئے (۲۱۱)۔ [2] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۶۵۔ [3] میلسن جلد چہارم صفحہ ۶۷۔

خطرہ پیدا ہُوا تھا۔ لیکن اس کی تفصیلات اس لیے بیان نہیں کی جا سکتیں کہ وہ شہزادے کی سرگرمیوں میں نہیں آتیں۔

لکھنؤ میں ورود

میلی سن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شہزادہ نومبر ۱۸۵۷ء میں روہیل کھنڈ پہنچا تھا اور وہاں سے اپریل ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ گیا۔ یہ صحیح نہیں، اس لیے کہ جس زمانے میں انگریز بیلی گارد سے خارج ہوکر عالم باغ میں جا بیٹھے تھے اور لڑائی بڑے زور سے جاری تھی، اس زمانے میں شہزادہ لکھنؤ پہنچ گیا تھا۔ یہ یقیناً اواخر نومبر یا اوائل دسمبر کا واقع ہونا چاہیے۔

قیصر التواریخ کا بیان ہے کہ فیروز شاہ شہر میں پہنچا تو جنرل بخت خاں کے دو سو سوار، پانچ سو تلنگے ساتھ تھے۔ سلطان مہو صاحب کے پاس فروکش ہُوا۔ سلطان مہو نے حضرت محل سے کہلا بھیجا:

> میں محتاج ہوں، مجھ سے ان کی خدمت کیا ہو سکے گی۔
> سرکار سے دوسرا مکان ان کے رہنے کو ملے تو بہتر
> ہے۔ اس جہت سے ایک مکان علیحدہ ان کے
> قریب تجویز ہُوا۔ پانچ ہزار دعوت کے آئے[1]

ہمت و عزیمت

جب تک لکھنؤ میں مقابلہ جاری رہا۔ شہزادہ فیروز شاہ اسی جگہ رہا۔ جب لکھنؤ خالی ہُوا تو وہ اپریل ۱۸۵۸ء میں احمد اللہ شاہ کے پاس پہنچ گیا اور شاہ جہان پور کی جنگ میں شاہ صاحب کے ساتھ تھا۔

سید کمال الدین حیدر فرماتے ہیں کہ شہزادہ لکھنؤ سے نکلا تو تھوڑی سی جمعیت

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴

اور ایک توپ کے ساتھ خان بہادر کے پاس بریلی پہنچا۔ خاں بہادر نے داخلِ شہر کی اجازت نہ دی تو مراد آباد چلا گیا۔ مجو خان خان بہادر خاں کا چچا ناظم تھا۔ اس نے کہلا بھیجا کہ شہزادے کے لیے پہلے ہی جانا بہتر ہے۔ شہزادے نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ہم تھکے ہوئے ہیں اور حضرت سے ہیں، آج ٹھہرنے اور روزہ افطار کر لینے دیجیے، کل نجیب آباد چلے جائیں گے[۱]۔ ناظم نے قبول نہ کیا۔ ناظم کی فوج بھگا دی اور اس کا سارا سامان شہزادے اور اس کے ساتھیوں کو ملا، جن میں سے تین ہاتھی کچھ سامان اور دو ہزار روپے شہزادے نے اپنے پاس رکھے۔

اس کے بعد نواب رام پور کے بھائی کاظم علی خاں سے بھی جنگ ہوئی۔

پھر شہزادہ بریلی گیا تو خان بہادر خاں نے پرجوش خیر مقدم کیا۔ ہاتھی پر بٹھا کر شہر میں لایا اور چاہا کہ انگریزوں سے جنگ کا پورا کاروبار حوالے کر دے۔ شہزادے نے خدا جانے کیوں یہ پیش کش منظور نہ کی اور وہ شاہ جہان پور چلا گیا[۲]۔

میلی سن نے لکھا ہے کہ شہزادہ ۲۱۔ اپریل ۱۸۵۸ء کو مراد آباد پہنچا تھا اور روپیہ طلب کیا۔ نہ ملا تو اس نے بزور لینا چاہا۔ ۲۶۔ اپریل کو انگریزی فوج قریب پہنچ گئی۔ مراد آباد میں سخت لڑائی ہوئی، لیکن شہزادہ بچ کر نکل گیا۔

ایک بے سروپا افسانہ

قیصر التواریخ میں بتایا گیا ہے کہ شہزادہ فیروز شاہ، شاہ جہان پور سے محمدی پہنچا تو وہاں احمد اللہ شاہ نے بادشاہی کا سلسلہ قائم کر رکھا تھا:

> اور نشہ غرور و نخوت جو دماغ میں سما گیا تھا شاہزادے
> سے بھی طالب بیعت و فرمانبرداری مثل اور خادموں کے
> ہوا۔ شہزادہ اس حرکت ناپسندیدہ سے خفا ہو کر سندیلہ میں

---

۱ رمضان ۱۰۔ اپریل سے شروع ہو چکا تھا۔ ۲ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۶۵، ۲۶۶۔

آیا ۔[1]

لیکن یہ افسانہ سراسر بے بنیاد ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ احمد اللہ شاہ ۔نے نہ اپنی بادشاہی کا اعلان کیا تھا ، نہ اس کا کوئی موقع تھا ۔ شاہ جہان پور سے محمدی جانے اور وہاں سے ۵ ۔ جون کو پوایں میں شہادت پانے تک زیادہ سے زیادہ تین ہفتے کی مدت ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خطرات و تشویشات کے اس دور میں بادشاہی کے اعلان کا کون سا محل تھا ۔ پھر یہ لوگ جس اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہے تھے ۔ وہ اس طرح پورا نہ ہو سکتا تھا کہ ہر ایک جب چاہتا ، اعلان حکمرانی کر دیتا ۔ یہ افسانہ دشمنوں کا تراشا ہوا ہے ۔ افسوس کہ قیصر التواریخ کا مصنف ایسے امور کا خیال نہیں رکھتا اور دوسرے اصحاب جنھیں صحیح حالات کا بہتر تصور اور بہتر اندازہ ہونا چاہیے ، روایتوں کو سوچے سمجھے بغیر قبول کرتے رہے ہیں ۔

سیر و گردش

قیصر التواریخ میں جن مقامات پر شہزادے کے وردو د ذکر ہے ان کی کیفیت یہ ہے ؛ سندیلہ ، بانگرمئو ، صفی پو خیر آباد ، باڑی پھر بلہور کے گھاٹ سے دریائے گنگا کو عبور کیا اور ملاحوں کو سو روپے انعا دیا ۔ بعد ازاں کن پور ، درگاہ مدار ، حالی ، اٹاوہ وغیرہ سے ہوتے ہوئے شیر پور ۔ گھاٹ پر جمنا سے پار اترا ۔ لڑائیاں بھی ہوئیں ۔ خوب بہادری سے لڑا اور بسلامت ۔ چلا گیا ۔[2]

میلی سن کا بیان ہے کہ باغیوں کے ایک گروہ نے ۷ ۔ اگست ۱۸۵۸ء کو موہن حملہ کیا تھا جو سئی ندی کے کنارے لکھنؤ سے کوئی سترہ میل پر ہے اور یہ گروہ فیروز س کا ہراول تھا ۔ ستمبر ۱۸۵۸ء میں شہزادہ اودھ کے شمالی حصے میں باغیوں کا سرخیل رہا ۔ اس نے تانتیا ٹوپے کے کارناموں کا ذکر سنا تو اس کے پاس پہنچنے کا فیصلہ کر لیا ۔ چنا

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۶۵ ؛ [2] ایضاً ص ۲۶۸ ، ۲۶۲ ، ۲۶۳ ۔

وہ بیتا پیک کے پاس ایک مقام تبوا سے چلا۔ ۷۔ دسمبر کو اُس نے گنگا سے گنڈا۔ شاہزادہ اعظم
دگر اینڈ ٹرنک روڈ کے تار کاٹ دیے۔ عام افواہ پھیلا دی کہ میں شمال و مغرب کی طرف
جا رہا ہوں، لیکن اُٹاوہ گیا۔ انگریزوں نے تعاقب کیا، ایک افسر مارا گیا اور شہزادہ صاف بچ نکلا۔
۹۔ دسمبر کو جمنا سے گزر گیا[1] اور اس کے بعد سے پکڑنا بالکل مشکل تھا۔

بعد کے حالات

بعد کے حالات زیادہ تفصیل کے محتاج نہیں۔ اس لیے کہ لڑائیاں کم ہوئیں، صرف بچاؤ اور تعاقب کا طویل سلسلہ جاری رہا۔

۱۔ شہزادہ رانود پہنچا جو ریاست گوالیار کا مشہور مقام ہے، وہاں انگریزوں سے لڑائی ہوئی۔ پھر وہ آردنی کے جنگلستان میں چلا گیا۔

۲۔ ایک موقع پر اس نے انگریزوں کے ایک رسد رساں گروہ کا سامان لوٹ لیا۔

۳۔ ۱۳۔ جنوری ۱۸۵۹ء کو وہ اندر گڑھ میں تانتیا ٹوپے سے جا ملا۔ راؤ صاحب بھی ان کے ساتھ تھا۔

۴۔ ۲۱ جنوری ۱۸۵۹ء کو تانتیا ٹوپے سے الگ ہوا۔

۵۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں وہ سرونج کے جنگل میں تھا۔

۶۔ پھر وہ زائروں کا بھیس بدل کر کربلا چلا گیا اور ۱۸۶۹ء تک وہیں تھا[2]۔

دوسرا بیان

مفتی انتظام اللہ کا بیان ہے کہ حیدرآباد سندھ ہوتے ہوئے شہزادہ کابل گیا۔ وہاں سے ایران و روس ہو کر حجاز پہنچ گیا۔ مکہ معظمہ میں اقامت اختیار کر لی، جہاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ تھانوی، شاہ عبدالغنی دہلوی، مولانا یعقوب دہلوی، مولانا شاہ اسحاق دہلوی، مولانا محمد مظہر مجددی،

---

[1] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۲۵۱ ؛ [2] ایضاً صفحہ ۲۵۰

ہدایت و اصلاح کی غرض سے ایک جماعت بنا نے بیٹھے تھے۔ نواب فیض احمد خاں رئیس وتاولی، مولوی واعظ الحق بہاری، حکیم نوازش حسین بہاری اور شہزادہ فیروز شاہ بھی اسی جماعت کے رکن ہو گئے۔ ایک ترکی خاتون سے نکاح کر لیا تھا۔ صرف دو لڑکیاں یادگار چھوڑیں۔ ۱۸۹۰ء کے بعد انتقال ہوا۔ ان کی ایک ہمشیرہ کلثوم زمانی بیگم فقیرانہ لباس اختیار کر کے میرٹھ چلی گئیں اور باقی عمر نواب ممتاز علی خاں بیرزہ نواب خیر اندیش خاں کے یہاں بسر کر دی۔ بھائی کے لیے دعائیں کرتی رہتی تھیں۔[1]

تیسرا بیان

قیصر التواریخ میں مرقوم ہے کہ کئی برس جے پور کے جنگلوں، بیکانیر یا دامن کسار دکن میں سرگرداں رہا۔ وہاں قوم بھیل بھی شریک ہو گئی۔ آخر کار اٹک دریا اتر کر کابل سے داخل ملک ایران ہوا۔ وہاں سے رہبر پاکر روس چلا گیا۔

> کہتے ہیں کہ وہاں اپنی جماعت کے ساتھ بخوبی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہاں کی سلطنت سے بہ جہت ناموری کچھ کفالت ہوتی ۔۔۔ ان کی اولوالعزمی و شجاعت سرکار پر ثابت ہے کیا عجب تھا اگر برٹش ان کے واسطے بھی کچھ کفالت ہو جاتی، جس طرح زمانہ ماضیہ میں اللہ و ماثر صاحب نے صاحبان اولوالعزم کو کچھ ملک بسر اوقات کے واسطے دے کر سرکار کو نیک نام کیا، مثل نواب امیر خاں، ہولکر وغیرہ مگر یہ کہئے کہ وہ زمانہ اور تھا، حکام کی نیت بہ خیر تھی اب اور صورت ہے۔[2]

---

[1] غدر کے چند علماء ص ۱۳۵۔ یہاں صرف یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مولانا شاہ اسحاق ۱۸۵۷ء سے بارہ سال پیشتر فوت ہو چکے تھے۔

[2] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۲۶۵۔

ڈاکٹر سین کی تحقیق

ڈاکٹر سین کا بیان زیادہ مستند ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے!

۱۔ شہزادہ فیروز شاہ اور راؤ صاحب نے ڈاکٹر وزیر خاں اور سید ظہور علی کی وساطت سے حکومت کے ساتھ گفت و شنید کی کوشش کی تھی لیکن شہزادے نے جو شرطیں پیش کی تھیں، وہ مانی نہ گئیں۔ مثلاً یہ کہ گزارے کا اچھا انتظام کیا جائے۔ جو ساتھی ہیں ان میں سے کوئی بھی اپنے ہتھیار حکومت کے حوالے نہ کرے گا۔

۲۔ جب مایوسی ہو گئی تو ہندوستان سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ قیاس یہ ہے کہ وہ سندھ کے راستے افغانستان پہنچا۔ ۱۸۶۰ء میں سنا گیا تھا کہ وہ قندھار میں ہے۔

۳۔ ۱۸۶۱ء میں وہ قندھار سے بخارا گیا۔ اس زمانے میں مالی حالت اچھی نہ تھی۔

۴۔ ۱۸۶۲ء میں وہ بخارا سے تہران گیا۔ ۱۸۶۳ء کے اوائل میں تہران سے پوچھا گیا تھا کہ آیا حکومت نے شہزادے کی گرفتاری کے لیے کوئی رقم مقرر کر رکھی ہے؟ حکومت شہزادے کو ایران میں گرفتار کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

آخری دور

بعد کی کیفیت یہ ہے!

۱۔ شہزادہ ۱۸۶۴ء میں سوات پہنچ گیا تھا۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر سین کو معلوم نہ تھی، میں آگے چل کر پیش کروں گا۔

۲۔ سوات سے کابل گیا۔ اس زمانے میں شیر علی خاں امیر تھا۔ اسے یہ خوف ہوا کہ ممکن ہے انگریزوں کی طرف سے پرسش ہو، لہٰذا شہزادے کو بدخشاں بھیج دیا۔

۳۔ بدخشاں شہزادہ زیادہ دیر نہ ٹھہرا اور سمرقند چلا گیا۔ وہ انگریزوں کے خلاف کوئی تحریک منظم کرنا چاہتا تھا مگر اس زمانے کے افغانستان یا ایران یا وسط ایشیا میں کیا امداد مل سکتی تھی۔

اکتوبر ۱۸۶۷ء میں برطانوی سفیر مقیم قسطنطنیہ نے اطلاع دی کہ شہزادہ سلطنت

لشائینہ کے مرکز میں پہنچا ہوا ہے اور انگریزوں کے مخالف مسلمانوں کا ایک گروہ اس کے ساتھ ہے ۔

۵۔ ۱۸۷۵ء میں معلوم ہوا کہ شہزادہ فیروز شاہ میرزا محمد بیگ کے ہمراہ چند ماہ پیشتر مکہ معظمہ چلا گیا ہے۔ یہ اطلاع اس مخبر نے دی جو خود شہزادے سے مل چکا تھا۔

۶۔ جنوری ۱۸۷۵ء میں وہ مکہ معظمہ پہنچا اور ۱۷۔ دسمبر ۱۸۷۷ء کو جوار رحمت الٰہی میں پہنچ گیا۔ گویا مکہ معظمہ کی خاک پاک میں آسودگی پائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آخری عمر میں ایک آنکھ کی بینائی قریباً زائل ہو چکی تھی اور ایک ٹانگ سے بھی لنگڑانے لگا تھا۔ شریف مکہ نے جو وظیفہ مقرر کر دیا تھا اسی میں گزارا کر لیا تھا۔

۷۔ شہزادے کی بیوہ نے وظیفے کے لیے حکومت ہند سے درخواست کی۔ نومبر ۱۸۸۱ء میں اس کے لیے پانچ روپے ماہوار اس شرط پر مقرر ہوئے کہ وہ ہندوستان نہ آئے۔ لارڈ رپن کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو وظیفہ ایک سو روپے ماہوار کر دیا اور نومبر ۱۸۸۱ء سے پوری رقم ایک سو روپے کے حساب سے یکمشت دلا دی۔[1]

امیر مجاہدین سے ملاقات

اوپر مذکور ہے کہ شہزادہ ۱۸۶۹ء میں سوات آیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سوات نہیں بلکہ بونیر آیا تھا تاکہ سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے امیر مولانا عبداللہ سے ملے جو اس زمانے میں بمقام بارچ کنڈ ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ اپریل ۱۸۶۹ء کا واقعہ ہے۔

کچھ معلوم نہیں کہ شہزادہ اور امیر عبداللہ کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ قیاس یہ ہے کہ شہزادہ اس خیال میں ہوگا کہ مجاہدین انگریزوں سے برسر جنگ ہیں۔ جب اس نے دیکھا کہ ان کی تعداد بھی کم ہے اور ساز و سامان بھی معمولی ہے تو وہ مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

---

[1] سین کی کتاب ص ۳۷۹ - ۳۸۱۔

عام طور پر مشہور تھا کہ شہزادے کی وفات ۱۸۹۵ء میں ہوئی۔ میرے عزیز دوست سید اولاد علی شاہ گیلانی نے بتایا تھا کہ ایک بزرگ ۱۹۱۰ء میں ان کے پاس ٹھہرے تھے۔ (بمقام لاہور) اور بتایا تھا کہ وہ شہزادہ فیروز شاہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر سین کے مستند بیان کے بعد اب ان روایتوں کو درست ماننے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

شہزادے کی شخصیت

شہزادے کی شخصیت کے متعلق کچھ کہنے کی غالباً ضرورت نہیں۔ اس کی ہمت، عزیمت اور راہ حق میں سختیاں برداشت کرنے کی غیر معمولی صلاحیت اوپر کی سرگزشت کے ہر حصے میں نمایاں ہے۔ ڈاکٹر سین نے بالکل درست لکھا ہے کہ اس کی شخصیت و عزیمت کا آدمی ایک صدی پیشتر پیدا ہوتا۔ تو اپنے لیے سلطنت رسکتا تھا۔ ایک صدی بعد پیدا ہوتا تو عوام کا نہایت ہر دلعزیز لیڈر بن جاتا لیکن وہ یا تو ایک صدی پہلے پیدا ہوا یا ایک صدی بعد۔ لہٰذا اس کی تمام مجاہدانہ سرگرمیاں بے نتیجہ رہیں اور زندگی کے باقی اوقات اس نے جلاوطنی میں گزارے۔

وہ بڑا پاک طینت اور حق شناس تھا۔ ۱۷۔ فروری ۱۸۵۸ء کو اس نے ایک اعلان شائع کیا تھا جس میں صاف صاف کہا۔ انگریزوں کے خلاف ہماری کامیابی میں تاخیر کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ساتھیوں نے بے گناہ بچوں اور عورتوں کے قتل سے ہاتھ آلودہ کیے۔ ہمیں ایسے افعال سے احتراز کرنا چاہیے۔ کسی دوسرے لیڈر نے ایسے واقعات قتل کی کھلم کھلا مذمت نہ کی۔ اگر وہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی میں موجود ہوتا اور اسے اپنے عزائم کے مطابق کام کرنے کا موقع مل جاتا تو یقین ہے کہ کم از کم دہلی میں ۱۸۵۷ء کے واقعات کی سرگزشت تمنا و حسرت کا ویسا دردناک مرقع نہ رہتی، جس پر برابر آنسو بہائے گئے۔

یہ شہزادہ فیروز شاہ تھا جس کے متعلق میکن نے بالکل درست لکھا کہ اس نے اپنے ان عزیزوں اور رشتہ داروں کے مقابلے میں جو دہلی میں تھے، زیادہ اچھے کردار کا نمونہ پیش کیا۔[1]

۱؎ میکن ص ۱۱۲

مولانا فضل حق خیرآبادی

خاندان

مولانا فضل حق ایک ممتاز خاندان کے فرد تھے، جن کے علم و فضل اور یگانہ کمالات کے باعث پورے خاندان کی شہرت کو چار چاند لگے۔ مولوی رحمان علی مصنف تذکرۂ علماے ہند انھیں عمری، حنفی، ماتریدی اور چشتی لکھتے ہیں، یعنی مولانا کا نسب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ فقہی لحاظ سے وہ حنفی تھے، عقائد میں ماتریدی اور سلسلہ چشتیہ میں انھوں نے بیعت کی تھی۔[1]

ان کے والد مولانا فضل امام کو دہلی میں صدر الصدور کا منصب حاصل تھا۔ والد سے تعلیم پائی۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حدیث پڑھی۔ مولانا عبدالشاہد خاں شروانی نے اساتذۂ حدیث میں شاہ عبدالعزیز محدث کا اسم گرامی بھی شامل کیا ہے۔[2] ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے۔ تیرہ برس کی عمر میں تمام مروجہ علوم عقلیہ و نقلیہ سے فارغ ہو چکے تھے، حافظہ اتنا اچھا تھا کہ چار مہینے میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔[3]

علمی کمالات

ایک روایت ہے، جسے مولانا عبدالشاہد خاں نے تواتر کا درجہ دیا ہے کہ شاہ عبدالعزیز محدث کی تحفۂ اثنا عشریہ شائع ہوئی تو

---

[1] تذکرہ علماے ہند ص۱۶۳، [2] الثورۃ الہندیہ ص۱۹، [3] تذکرہ علماے ہند ص۱۶۴

ایران سے علامہ باقر داماد صاحب افق المبین کے خاندان کا ایک جید عالم شاہ صاحب سے مناظرے کے لیے دہلی آیا۔ شاہ صاحب نے اس کے قیام کا بندوبست کر دیا۔ شام کے وقت مولانا فضل حق اس عالم کی خدمت میں پہنچے اور مزاج پرسی کے بعد علمی گفتگو شروع کر دی۔ پہلے افق المبین پر اعتراضات کیے۔ جن کا جواب ایرانی عالم نہ دے سکا۔ پھر خود ہی شافی جوابات دیے۔ آخر میں کہا کہ میں شاہ صاحب کا ادنیٰ شاگرد اور کفش بردار ہوں۔ ایرانی عالم یہ سن کر اتنا متاثر ہوا کہ مناظرے کا ارادہ ہی ترک کر دیا[1] سوچا کہ جس شخص کے شاگرد کا یہ حال ہے، وہ خود خدا جانے کیسا ہو گا۔

مولوی رحمان علی لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں مولانا کی زیارت کا شرف حاصل کیا تھا۔ دیکھا کہ حقہ بھی پی رہے تھے اور شطرنج بھی کھیل رہے تھے، ساتھ ساتھ ایک طالب علم کو افق المبین کا درس بھی دے رہے تھے اور تمام مطالب بڑی خوبی سے بیان فرماتے جاتے تھے[2]۔

درس و تدریس

اس زمانے میں قاعدہ تھا کہ طلب علم سے فراغت کے بعد درس بھی دیا جاتا۔ اس کے بغیر حاصل کردہ علوم میں پختگی نہ آتی تھی۔ چنانچہ مولانا فضل حق نے بھی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا فضل امام نے ایک بڑی عمر کے طالب علم کو بھی آپ کے حوالے کر دیا تھا۔ جو غالباً کند ذہن تھا۔ سے تھوڑا سا سبق پڑھایا، پھر کتاب اٹھا کر پھینک دی اور درس سے اٹھوا دیا۔ وہ مولانا فضل امام کی خدمت میں پہنچا اور کیفیت عرض کی۔ چنانچہ مولانا فضل حق بلائے گئے۔ مولانا فضل امام نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ دستار فضیلت دور جا پڑی، پھر فرمایا:

تو تمام عمر بسم اللہ کے گنبد میں رہا۔ ناز و نعم میں پرورش پائی۔ جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۲۳-۲۴ ۔ [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۶۴ ۔

سے پڑھایا۔ طلبہ کی قدر و منزلت تو کیا جانے، اگر
مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت
معلوم ہوتی۔ طلب علم کی قدر ہم سے پوچھو۔[1]

بہر حال مولانا نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کسی بھی دور میں درس و تدریس ترک نہ کی۔ جو بھی فیض حاصل کرنے کے لیے آتا، اسے بے تامل مستفیض فرماتے۔ یہاں تک کہ مشاغلِ تفریح میں بھی اس کا خاص خیال رکھتے، جیسا کہ مولوی رحمان علی کے مذکورہ بالا بیان سے واضح ہے۔ مولانا نے دھومن شاہ دہلوی سے بیعت کی تھی۔

ملازمت

والد کے انتقال کے وقت مولانا کی عمر اٹھائیس سال کی تھی۔ اسی زمانے میں ملازمت اختیار کر لی اور ریزیڈنٹ دہلی کے دفتر میں سررشتہ دار بن گئے۔ پھر نواب فیض محمد خاں والیِ جھجر نے پانسو روپے ماہوار پر انھیں بلا لیا۔ روانگی کے وقت ولی عہد (بعد ازاں بہادر شاہ ظفر) سے ملنے کے لیے گئے تو اس نے اپنا خاص دوشالہ آپ کو اڑھایا اور آب دیدہ ہو کر کہا: جب آپ رخصت کا ذکر کرتے ہیں تو میرے لیے اسے قبول کیے بغیر چارہ نظر نہیں آتا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ رخصت کا لفظ دل سے زبان پر لانے کے لیے ایک سو آلات جرِ ثقیل استعمال کرتے پڑتے ہیں۔[2]

جھجر کے بعد الور چلے گئے۔ بعد ازاں آٹھ برس رام پور میں رہے۔ پھر لکھنؤ میں چلے، صدر الصدور بنا دیے گئے۔ جب ایک نئی کچہری "حضور تحصیل" کے نام سے بنی تو اس کے مہتمم قرار پائے۔ ایک روایت ہے کہ مولانا نے ہنومان گڑھی کے واقعہ الیمہ سے متاثر ہو کر لکھنؤ کی ملازمت چھوڑ دی۔ دوسری روایت ہے کہ ترک ملازمت مولانا احمد اللہ شاہ سے بات چیت کا نتیجہ تھا۔ بہر حال ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے نکل کر آپ الور چلے گئے۔

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۳۶۔ [2] کلیات نثر غالب فارسی۔

مولانا کی زندگی علم و فضل میں مولانا وقت کے ممتاز ترین اصحاب میں سے تھے، لیکن افکار و خیالات یا معتقدات کی بنا و پیمانی کی حیثیت بہت ہی معمولی تھی۔ زندگی بھی امیرانہ تھی جسے جفاکشی یا مجاہدے سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ دہلی میں میرزا غالب سے گہری دوستی تھی اور میرزا کی پوری زندگی لاابالی تھی۔ امتناع نظیر خاتم النبیین اور امکان نظیر کے بارے میں شاہ اسماعیل شہید سے نزاع چھیڑ لی، جو بالکل بے محل تھی۔ اس سلسلے میں مشیت و قدرت کا فرق نظر انداز کر دیا۔ بڑے نازک مزاج تھے۔ شطرنج کا بہت شوق تھا۔ غرض ان کا عام طریقہ وہی تھا، جو اس زمانے کے امرا کا تھا اور کسی کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آرام طلبی، تن آسانی اور امیری کے جنجال سے نکل کر آپ جفاکش مجاہدوں کے حلقے میں پہنچ جائیں گے۔

مولانا اور سیاست جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں مولانا کو ابتدائی زندگی میں کبھی سیاسی امور کی طرف توجہ نہ ہوئی ان کا خاص ذوق یہ تھا کہ جہاں رہیں عزت سے رہیں۔ اچھی تنخواہ ملے، اور آرام و اطمینان کی زندگی بسر کریں۔ علم کا ذوق رکھنے والوں کو درس بھی دے دیا کریں اور بس۔ چنانچہ اسی اسلوب و نہج پر ان کی زندگی گزر گئی۔ غالباً آخری دور میں بعض دوسرے حساس و دیدہ ور اصحاب کی طرح ان پر بھی انگریزی تسلط کی خرابیاں منکشف ہوئیں۔ انھوں نے سمجھا کہ انگریز سب کو عیسائی بنا لینے کے درپے ہیں اور ان کے نزدیک اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کی یہی بہترین تدبیر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سے انگریزوں کے متعلق طبیعت میں تکدر پیدا ہوا، جو آخری دم تک بڑھتا ہی گیا۔

محرکاتِ مخالفت مولانا نے انگریزوں کی مخالفت کے جو محرکات اپنی کتاب میں بیان کیے ہیں، انھیں یہاں خلاصۃً درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ داعیہ تبدیل مذہب۔

۲۔ پیداوار کا شتکاروں سے لے کر انھیں نقد روام دینا، اس طرح خود خام جنسوں پر قابض ہوکر منڈیوں کے نرخ بڑھانے گھٹانے کا مختار بن جانا۔ مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو خوراک نہ ملے گی تو وہ ان کے ہر حکم کی تعمیل پر مجبور ہوں گے۔

۳۔ مسلمانوں کو خطبہ لانے سے روکنا، پردہ نشین خواتین کا پردہ ختم کرانا نیز دوسرے احکام دین کو مٹانا۔

۴۔ ہندو اور مسلمان لشکریوں کو ان کے رسوم و اصول سے ہٹانا اور انھیں مذہب و عقاید سے گمراہ کرنا۔

ان محرکات پر بحث کی ضرورت نہیں ان میں سے بعض پر مفصل گفتگو جنگ آزادی کی سرگزشت میں ہو چکی ہے، بعض ایسے ہیں کہ انھیں آج شاید محض وسوسہ سمجھا جائے، لیکن اس زمانے میں مولانا کی طرح اکثر اصحاب کو قرآن کی بنا[1] پر یقین ہو گیا ہوگا کہ یہ سب کچھ ہونے والا ہے۔

دہلی میں ورود

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہونے کے وقت مولانا الور میں تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں بیٹھے ہوئے نشر و اشاعت کرتے رہے اور اگست ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے[2] مجھے اس نشر و اشاعت کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

دہلی پہنچنے کے بعد جس حد تک میں معلوم کر سکا ہوں، وہ دربار میں آتے جاتے ضرور تھے، بادشاہ سے مل کر باتیں بھی کرتے تھے۔ بعض اوقات فرامین بھی لکھتے تھے۔ لیکن ان سے کوئی خاص کام نہ لیا گیا۔ جیون لال کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۶۔ اگست کو انھوں نے دربار میں حاضر ہو کر ایک اشرفی بطور نذر پیش کی۔ یہ غالباً الور سے آکر پہلی حاضری تھی۔ ۱۸۔ اگست کے حالات میں مرقوم ہے کہ مولانا نے انگریزی اخباروں کی رپورٹ کا ذکر کیا، جس کا مفاد یہ تھا کہ فتح دہلی کے بعد قتل عام کیا جائے گا۔ شہر کا نشان مٹا دیا جائے گا، بادشاہ کے حق میں ایک بھی صدا

۱۔ الثورۃ الہندیہ صفحہ ۱۵۴۔ ۲۔ دو روزنامچے صفحہ ۱۹۶۔

بلند نہ ہونے دی جائے گی اور نہ اُسے پانی کا ایک قطرہ ملے گا۔ ساتھ ہی مولانا نے کہا: کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ سپاہی انگریزوں کی مخالفت چھوڑ دیں، کیونکہ وہ انگریزوں کے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتے۔[1]

۱۰ ستمبر اور ۱۱ ستمبر کے حالات میں محض مولانا کی شرکت دربار کا ذکر ہے۔ ۱۶ ستمبر کے حالات میں مرقوم ہے کہ مولانا نے عرض کیا، متھرا کی فوج آگرہ چلی گئی ہے۔[2]

بہادر شاہ کے مقدمے میں ذکر ہے کہ ۱۸ اگست ۱۸۵۷ء کو دوسرے افراد کے علاوہ مولانا نے بھی مختلف اشخاص کے نام فرامین لکھے لیکن اُن پر مُہریں نہ ہو سکیں۔ اس لیے کہ ملکہ عالم نواب زینت محل استراحت فرما رہی تھیں اور مُہر انھیں کے پاس تھی۔[3] دوسرے مقام پر مذکور ہے کہ مولانا نے مولوی عبدالحق خاں کے نام ضلع گوڑگانوہ کے مالیے کی تحصیل کے لیے فرمان لکھوایا اور مولانا کے ایک عزیز کو وہاں بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔[4]

صورتِ حال کے متعلق تاثرات

مولانا کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی میں صورتِ حال کے مطالعے کے بعد انھیں نتیجے کے متعلق کوئی حسنِ ظن نہ تھا۔ وہ فرماتے ہیں:

۱۔ بہادر شاہ ضعیف، غم زدہ اور ناتجربہ کار تھا۔

۲۔ وہ حاکم و حاکم ہونے کے بجائے اپنی اہلیہ اور وزیر یعنی زینت محل اور حکیم احسن اللہ خاں کا مورد محکوم تھا۔

۳۔ اس کے بیٹے عافیت نااندیش، سفیہ، خائن اور بزدل تھے۔ انھیں دیانت دار عقل مندوں سے نفرت تھی۔

---

[1] روزنامچہ ص ۱۵۴۔ مجھے یقین ہے کہ یہاں اردو روزنامچے کے انگریزی مترجم سے شدید غلطی ہوئی ہے۔ یہ رائے کسی اور کی ہوگی جو مولانا سے منسوب کر دی گئی۔ [2] روزنامچہ صفحہ ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۲۳ -

[3] مقدمہ بہادر شاہ ص ۸۲ [4] ایضاً ص ۱۴۲، ۱۰

۴۔ اُنھیں نہ کبھی میدانِ جنگ سے سابقہ پڑا تھا، نہ وہ فنونِ حرب سے آگاہ تھے۔ بازاری لوگوں کو اُنھوں نے اپنا ہم نشین و جلیس بنا لیا تھا۔

۵۔ انگریزوں کا مقابلہ کرنے والوں میں بعض بے سردار تھے اور بعض کی طاقت فقر و فاقہ نے سلب کرلی تھی۔

صرف ایک گروہ نصاریٰ کا جواب دیتے ہوئے بہادری سے لڑتا رہا۔

ظاہر ہے کہ ان تاثرات کے بعد مولانا یہ کیوں کر سمجھ سکتے تھے کہ نتیجہ حسبِ مُراد نکلے گا۔؟ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بحث نتیجے سے نہ تھی، صرف یہ مطلوب تھا کہ جو کچھ ہو سکتا ہے، اس میں توقف نہ ہونا چاہیے۔

فتویٰ

مولانا کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی بعض لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کیا تھا۔ مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہُوا، جس پر علماءِ دہلی سے دستخط لیے گئے۔ میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضلِ حق ہی کے مشورے سے تیار ہُوا تھا اور اُنھیں نے علما کے نام تجویز کیے جن سے دستخط لیے گئے۔ اسی فتوے پر مفتی صدر الدین آزردہ کے دستخط تھے، جن کے سلسلے میں بعد ازاں ایک لطیفہ ۔۔۔ کی گئی اور مفتی صاحب الزام شرکت سے بری ہوئے۔ غالباً یہی فتوے تھا جو انجام کار مولانا کے خلاف مقدمے کا باعث بنا، ورنہ اُنھوں نے نہ کسی جنگ میں حصّہ لیا تھا، نہ اُن کے پاس کوئی عہدہ تھا، نہ کسی کے قتل میں شرکت کی تھی اور نہ اُن کے خلاف کوئی اور سنگین الزام تھا۔

دہلی سے روانگی

۱۹۔ ستمبر کو شہرِ دہلی فتح ہُوا۔ مولانا کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ روز بھوکے پیاسے مکان میں بند رہے۔ پھر اہل و عیال کو ساتھ لے کر رات کے وقت چھپ چھپا کر نکلے اور منتعدد منزلیں طے کرنے کے بعد بھیکن پور ضلع علی گڑھ پہنچے۔ وہاں اٹھارہ روز چھپے رہے۔ ان کے فرزند ارجمند مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے۔ پھر نواب صدر یار جنگ بہادر کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور نے سانکرہ کے گھاٹ

سے جو میکن پور سے آٹھ میل پر ہے، دریا کے پار اتار دیا۔[1] کچھ مدت چھپے رہے، کچھ معلوم نہیں کہ یہ زمانہ کہاں کہاں گزارا۔

گرفتاری: جب ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے عفو عام کا اعلان ہوا تو مولانا بھی اس پر بھروسا کر کے خیرآباد پہنچ گئے۔ فرماتے ہیں:

> مجھے اس کا بالکل خیال نہ رہا کہ بے ایمان کے عہد و پیمان پر بھروسا اور بے دین کی قسم و یمین پر اعتماد کسی بھی حالت میں درست نہیں، خصوصاً جبکہ وہ بے دین جزا و سزائے آخرت کا بھی قائل نہ ہو۔[2]

چند روز اطمینان سے گزر گئے۔ پھر دو آدمیوں نے مولانا کی مخبری کی۔ جنھیں وہ مرتد، جھگڑالو اور تندخو بتاتے ہیں۔[3] چنانچہ انھیں مکان سے جا کر گرفتار کر لیا گیا اور مقدمے کے لیے لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ عبدالحلیم کا بیان ہے کہ مولانا ۱۸۵۹ء میں سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے اور ان پر سلطنت مغلیہ سے وفاداری یا فتوائے جہاد یا جرم بغاوت میں مقدمہ چلا۔

مقدمے کے حالات: مقدمے کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے کہ اسیروں میں ایک سے ایک نے واقعات سن کر مولانا کو رہا کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مولانا سرکاری وکیل سے خود بحث کرتے تھے۔ لطف یہ کہ

> چند الزام اپنے اوپر خود ہی قائم کیے، پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی و قانونی اوڑسے توڑ دیے۔ یہ جج یہ رنگ دیکھ کر پریشان تھا اور ان سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدرالصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام کیا

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص۱۵۰ [2] ایضاً ص۱۳۱ [3] ایضاً ص۱۳۱

تھا ۔ ۔ ۔ ۔[1]

دوسرے دن مولانا نے مخبری کی تصدیق کر دی اور کہا کہ واقعی فتویٰ ایں نے دیا تھا۔ گواہ نے پہلے سچ کہا تھا، اب ایسی صورت دیکھ کر مرعوب ہو گیا اور اس نے جھوٹ بولا۔ فتویٰ میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری رائے یہی ہے[2]

یہ بیان میرے نزدیک سراسر بے اصل ہے۔ اصل معاملہ بے حد نازک تھا اور اس کے ساتھ مولانا کی زندگی وابستہ تھی۔ یہ بات ذہن میں نہیں آ سکتی کہ انھوں نے اسے اپنے علمی کمالات یا زورِ استدلال کی نمائش کا ذریعہ بنا لیا ہو۔ وہ اس طرح کہ کبھی اپنے اوپر الزام لگا لیے اور کبھی رد کر دیے بجز خود ہی ہر شے کا اقبال کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ معقولات میں مولانا کی یگانگی کے پیشِ نظر لوگوں نے بہ طور خود داستان بافیاں کر لیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ جس جج کو مولانا کا شاگرد اور ہمدرد بتایا گیا اس کے متعلق خود مولانا اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

> میرا معاملہ ایسے ظالم حاکم کے سپرد کر دیا، جو مظلوم پر رحم کرنا
> ہی نہ جانتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس ظالم نے میری جلا وطنی
> اور عمر قید کا فیصلہ صادر کر دیا[3]

اس واضح ارشاد کے بعد کیوں کر مانا جا سکتا ہے کہ حاکم مولانا سے واقف تھا اور چونکہ ان سے کام سیکھ چکا تھا، اس لیے ہمدردی تھی؟

حبس دوام بہ عبور دریائے شور

بہر حال مولانا کے لیے حبس دوام کا حکم صادر ہوا اور ان کی کتابیں، جائداد، مال و متاع، اہل و عیال کے رہنے کا مکان غرض ہر شے ضبطی میں آگئی۔ میرزا غالب کے ایک مکتوب سے

---

[1] بحوالہ الثورة الہندیہ صفحہ ۱۰۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۱۶ تا ۱۱۷، [3] ایضاً صفحہ ۱۰۲۔

واضح ہوتا ہے کہ اس فیصلے کے خلاف مرافعہ کیا گیا تھا لیکن فیصلہ بحال رہا بلکہ تاکید کردی گئی کہ مولانا کو جلد انڈیمان روانہ کردو۔

مولانا بالکل بجا فرماتے ہیں کہ قید میں ہر ممکن اذیت پہنچائی گئی اور قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایمان و اسلام پر مضبوطی سے قائم رہے تھے اور ان کا شمار علماء اسلام میں ہوتا تھا۔[1]
مولانا نے پوری زندگی اعلیٰ درجے کے امیرانہ انداز میں گزاری تھی۔ قید میں انھیں ایسی خوفناک تکلیفوں سے سابقہ پڑا جو معمولی قیدیوں کو بھی شاید ہی پیش آئی ہوں۔ کس درد سے فرماتے ہیں:

دشمن میری ایذا رسانی میں کوشاں اور میری ہلاکت کے درپے ہیں۔ دوست میرے مرض سے لاچار ہیں۔ دشمنوں کے دل میں میری طرف سے بغض اور کینہ مذہبی عقائد کی طرح راسخ ہوگیا ہے۔ ان کے پلید سینے کینہ وعداوت کے گنجینے بن گئے ہیں۔ ان اسباب پر نظر کرتے ہوئے میں اپنی رہائی سے مایوس اور اپنی امیدوں کو منقطع پاتا ہوں۔[2]

انڈیمان کی زندگی

کچھ معلوم نہیں کہ کب انڈیمان پہنچے: ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ان سے پیشتر مفتی عنایت احمد کاکوروی، مفتی مظہر کریم دریابادی اور بہت سے دوسرے علماء وہاں پہنچ چکے تھے۔ لہٰذا جس حد تک صحبت و مجلس کا تعلق ہے انڈیمان یہاں کے اکثر شہروں سے زیادہ جاذب توجہ بن گیا تھا، لیکن معاملہ قید کا تھا اور قید اس زمانے میں بڑی ہی سخت تھی بلکہ انڈیمان میں تو بعد ازاں بھی بڑی سخت رہی۔

مولانا نے انڈیمان کا جو نقشہ چند الفاظ میں کھینچا ہے، وہ سر سال بعد بھی نادرست نہ تھا۔

---

[1] بحوالہ ثورۃ الہندیہ صفحہ ۲۵۲ / [2] ایضاً صفحہ ۲۲۰، ۴۱۴

اور مولانا کے زمانے میں تو حرف بہ حرف درست تھا۔ وہ فرماتے ہیں، آب و ہوا نا موافق پہاڑی علاقہ، اس میں دشوار گزار گھاٹیاں اور راہیں، وہاں کی نسیم سحر گرم و تیز ہوا سے بھی زیادہ سخت، غذا خنظل سے زیادہ کڑوی، پانی سانپوں کے زہر سے بڑھ کر ضرر رساں، اس کے سنگریزے بدن کی چھپنیاں۔

پھر قید خانے کی کیفیت بتاتے ہیں کہ ہر کوٹھری پر چھپر جس میں رنج و مرض بھرا ہوا تھا۔ اور چھتیں ٹپکتی تھیں۔ مرض ارزاں، دوا گراں۔ بیماریاں بے شمار، خارش و وبا عام۔ بیمار کے علاج، تندرستی کی بقائے صحت اور زخم کے اندمال کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ خود بھی متعدد سخت امراض میں مبتلا ہو گئے۔ خارش کے باعث بدن زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ روح کو تحلیل کر دینے والے درد اور تکلیف کے ساتھ زخموں میں اضافہ ہوتا رہا۔

حالات میں تبدیلی بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا انڈیمان میں پہنچے تو انھیں صفائی کی خدمت پر مامور کیا گیا۔ ٹوکرا لے لیتے اور کوڑا کرکٹ جمع کر کے پھینک آتے۔ اُن کے کپڑے اُتروا لیے گئے تھے، تہمد اور کملی دے دی گئی تھی۔ پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔

انڈیمان کے سپرنٹنڈنٹ کی پیشی میں ایک مولوی تھا۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس علم ہیئت کی ایک قلمی کتاب تھی، مولوی کو دے کر کہا کہ اس کی عبارت درست کر دی جائے۔ مولوی یہ کام مولانا کے پاس لے آیا۔ انھوں نے نہ صرف عبارتیں درست کیں، بلکہ مطالب میں اضافے اور حاشیے پر کتابوں کے حوالے بھی دے دیئے۔ اس طرح مولانا کے علم و فضل اور علو مرتبت کا حال سپرنٹنڈنٹ پر کھلا۔ اس وقت سے مولانا کے لیے برائے نام محرری کا کام تجویز کر دیا گیا اور تکلیفوں میں ایک حد تک کمی ہو گئی۔

وفات ادھر مولانا کے صاحبزادے نے ولایت میں مرافعہ کر دیا تھا۔ وہ منظور ہوا اور مولانا کی رہائی کا حکم آ گیا۔ صاحبزادہ انھیں لانے کے لیے انڈیمان

روانہ ہو گیا۔ جہاز سے اترتے ہی ایک جنازہ نظر پڑا، جس کے ساتھ بڑا مجمع تھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولانا کا جنازہ ہے۔ ۱۲- صفر ۱۲۷۸ھ (۲۰- اگست ۱۸۶۱ء) کو اس جہان فانی سے عالم بقا کی جانب سدھارے مولانا عبداللہ خاں فرماتے ہیں کہ مولانا کا مزار اب تک مرجع انام اور زیارت گاہ خاص و عام ہے[1]۔

دیکھیے جہاد آزادی نے خاک وطن کے کیسے جواہر پاروں کو ان سنسان اور وحشت ناک جزیروں کی آغوش میں پہنچا دیا، جہاں کوئی انسان بطیب خاطر ایک دن بھی بسر کرنا گوارا نہ کرے:

خیزند چوں زخاک شہیداں ما بحشر
در محشر آوریم دو عالم سیاہ را

تصانیف

مولانا نے گوناگوں مشاغل کے باوجود تصانیف بھی خاصی مقدار میں چھوڑی ہیں:

۱۔ الجنس الغالی شرح جواہر العالی
۲۔ حاشیہ افق المبین
۳۔ حاشیہ تلخیص الشفا
۴۔ حاشیہ شرح مسلم
۵۔ الہدیۃ السعیدیہ
۶۔ رسالہ تشکیک ماہیات
۷۔ رسالہ کلی طبعی
۸۔ رسالہ علم و معلوم
۹۔ الروض المجود فی تحقیق حقیقۃ الوجود
۱۰۔ رسالہ قاطیغوریاس
۱۱۔ رسالہ تحقیق حقیقۃ الاجسام
۱۲۔ الثورۃ الہندیہ یعنی حالات جنگ آزادی
۱۳۔ قصائد فتنۃ الہند
۱۴۔ مجموعۃ القصائد
۱۵۔ امتناع نظیر
۱۶۔ تحقیق الفتوی فی الطغوی

مولانا ویسے تو علم و فضل کا دریا تھے لیکن عربی ادب اور معقول میں ان کا درجہ بہت بلند تھا۔

---

[1] الثورۃ الہندیہ ص ۱۰

ازدواج واولاد

مولانا نے دو شادیاں کیں۔ پہلی اہلیہ سے تین صاحبزادیاں اللہ ایک صاحبزادہ یعنی شمس العلما، مولانا عبدالحق۔ دوسری اہلیہ سے دو صاحبزادے تھے، مولوی شمس الحق اور مولوی علاء الحق۔

تلامذہ کا حد وشمار نہیں، بلکہ کہنا چاہیے، بعد کے دور کے اکثر اکابر علم انھیں کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے۔

مولانا لیاقت علیؒ الہ آبادی

ابتدائی حالات

مولانا کا اصل وطن پرگنہ چائل ضلع الہ آباد کے کسی گاؤں میں تھا۔ علمی گھرانے کے فرد تھے۔ باقاعدہ تعلیم پائی۔ پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نرے عالم نہ تھے، زہد و تقدس میں بھی درجہ امتیاز حاصل تھا قادریہ سلسلے میں بیعت تھے۔ بہت سے لوگوں نے آپ سے بیعت کر رکھی تھی۔ مفتی انتظام اللہ لکھتے ہیں:

> وعظ و تذکیر میں اقتدار نصاریٰ پر تلمیحاً اشارے کر جاتے اور اپنے مریدین کو جہاد کی ترغیب و تشویق کی تلقین کرتے۔ سرکاری فوج میں بھی آپ کے اثرات تھے۔[1]

میلی سن کا بیان

میلی سن نے لکھا ہے کہ معاصر تاریخ نگار مولوی صاحب کا نام و نسب دریافت نہ کر سکے اور میں نے بعد میں جو تحقیقات کی، اس سے بھی کچھ زیادہ روشنی نہ مل سکی۔ ایک بڑے افسر نے بتایا کہ غدر سے پیشتر یہ شخص غیر معروف تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے لکھنؤ سے بھیجا گیا تھا۔ مسٹر ویلاک

---

[1] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۲۵ ، WILLOCK

نے لکھا ہے کہ مولوی لیاقت علی:

> ذات کے باندے تھے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ تھا۔ اتقا و تقدس کے باعث انھوں نے اپنے گاؤں میں بڑی عزت و حرمت حاصل کر لی تھی۔ جب بغاوت کا آغاز ہوا تو پرگنہ چائل کے زمینداروں نے جو کسی بھی قائد کی پیروی کے لیے تیار تھے، اس شخص کو اپنا سردار بنایا اور شہر پر بلہ بول دیا۔ شاہ دہلی کی طرف سے اسی کو ضلع کا گورنر بنا دیا گیا۔[1]

ضروری گزارشات

اس بیان کا تضاد کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ اگر مولانا لیاقت علی غیر معروف تھے تو انھیں اپنے گاؤں میں خاص عزت و احترام کا درجہ کیوں کر حاصل ہو گیا؟ اگر وہ واقعی محترم نہ تھے تو زمینداروں کو یہ خیال کیوں کر آیا کہ انھیں اپنا سردار بنا لیں؟

پھر ان کی ذات یا پیشے میں تحقیر کا کون سا پہلو ہے؟ اور باندگی کون سی ذات ہے؟ یہ تو بہرحال ایک پیشہ ہے جس طرح دوسرے سیکڑوں پیشے ہیں۔ یقیناً مولانا لیاقت علی ۱۸۵۷ء سے پیشتر خاص درجہ امتیاز و شرف حاصل کر چکے تھے، اول اس لیے کہ صاحب علم تھے، دوم اس لیے کہ حد درجہ خدا پرست، نیک اور صالح بزرگ تھے۔ عوام میں انھیں یقیناً خاصی شہرت حاصل ہو گی۔ باقی رہے حکام تو ان میں شہرت حاصل کرنا مولانا کا مقصد ہی نہ تھا اور انگریز حکام کے نزدیک وہی لوگ معروف سمجھے جاتے تھے جو یا تو بڑی جاگیروں کے مالک تھے یا رات دن انگریزوں سے ملتے جلتے اور ان کے مقاصد کی پیش برد کے لیے کوشش کرتے رہتے تھے۔

الٰہ آباد میں انقلاب

الٰہ آباد میں بے چینی تو اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب سپاہ میرٹھ کی سرکشی کے متعلق اطلاعات شائع ہوئی

تھیں۔ پھر میلی سن کے قول کے مطابق آہستہ آہستہ اک گونہ "منظم بغاوت" کا آغاز ہوگیا:

> وہاں ایک آدمی "مولوی" کرکے مشہور تھا۔ اس نے شاہنشاہ دہلی کی حکومت بحال ہونے کا اعلان کر دیا اور سرکش آبادی اس کے گرد جمع ہو گئی۔ بہت تھوڑے آدمی اس وقت بتا سکتے تھے کہ وہ کہاں سے آیا؟ البتہ بعد میں معلوم ہو گیا کہ وہ دوآبہ کے ایک مسلمان گاؤں کا باشندہ تھا، جس نے سرکشی اختیار کر لی تھی۔[1]

بہرحال مولانا نے جہاد کی قیادت سنبھال لی اور خسرو باغ کو اپنا مستقر بنا لیا۔ میلی سن کہتا ہے کہ ان کا نسب وحسب پوچھنے کی کسی کو کیا ضرورت تھی۔ پیش نظر مقصد کے لیے یہی کافی تھا کہ مولانا انگریزوں سے سخت متنفر تھے اور مسلمانوں کو یہ یقین دلا سکتے تھے کہ اسلامی حکومت بحال ہو گئی ہے:

> اس طرح تھوڑی دیر کے لیے وہ عارضی حکومت کا تجربہ اتارنے میں کامیاب ہو گئے اور مولوی کا نام پیروان حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں سے ہر ایک کی زبان پر تھا۔[2]

عارضی حکومت کی کیفیت

جتنے انگریز باقی رہ گئے تھے وہ قلعے میں جا بیٹھے تھے مولانا روزانہ اپنے ساتھیوں کو قلعے پر یورش کے لیے دعوت دیتے۔ وہ لوگ وقتاً فوقتاً مظاہرے کرتے بھی رہتے تھے، لیکن انگریزی توپوں کی زد سے ہمیشہ باہر ہی رہنے کا خیال رکھتے تھے۔

مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ خسرو باغ میں مولانا کے مریدوں کے علاوہ ہندوؤں کی بھی ایک تعداد جمع ہو گئی تھی، جن کا افسر رام چند تھا۔ مولانا نے اپنے آدمیوں کے ذریعے سے

---

[1] میلی سن جلد دوم صفحہ ۱۹۵، [2] ایضاً، ایضاً۔

شہر کا انتظام درست کیا۔ لوٹ کھسوٹ بند ہو گئی[1]

مولانا کا پہلا اشتہار

پنڈت کنہیا لال نے لکھا ہے کہ مولانا نے دو اشتہار بھی شائع کیے تھے جو اودھ، الٰہ آباد اور دوسرے مقامات پر بھیجے گئے۔ پہلے اشتہار میں تو اس جہادیہ میں سے ابتدائی اشعار دیے گئے تھے جو مولوی خرم علی صاحب بلہوری کے نام سے منسوب ہے اور جسے سید احمد شہید کے مجاہدین اکثر میدانِ جنگ میں پڑھا کرتے تھے۔ یہ پوری نظم ننانوے اشعار پر مشتمل ہے۔ مولانا کے اشتہار میں صرف ابتدائی ستائیس اشعار دیے گئے تھے نیز چوبیسویں، پچیسویں اور چھبیسویں شعر میں ترمیم کر لی گئی تھی۔

ممکن ہے مولانا نے اشتہار میں اتنے ہی شعر درج کرنا مناسب سمجھا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پنڈت کنہیا لال نے اشتہار کی پوری نظم درج کرنے کے بجائے صرف ابتدائی حصہ درج کرنے پر اکتفا کیا ہو[2]

دوسرا اشتہار

مولانا کا دوسرا اشتہار ایک تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے بدیں خیال یہاں درج کیا جاتا ہے کہ محفوظ ہو جائے:

"بعد حمد و صلوٰۃ کے واسطے رفع حجت بروز قیامت و تبلیغ احکام شریعت کہ طریقہ سنت ہے، خادم المطیع احقر الفقرا امیدوار رحمت رب غنی، محمد لیاقت علی الٰہ آبادی، چند باتیں ضروری۔ فرمان واجب الاذعان احکم الحاکمین قرآن مجید و فرقان حمید اور ارشاد فیض بنیاد برگزیدہ لم یزل حضرت نبی صلعم سے بخوبی ثابت و متحقق کر کے مسلمان باایمان کو سناتا ہے کہ جو بدعات ظلم و فساد ساری سلطنت ہندوستان میں خصوصاً ضلع الٰہ آباد میں کفرہ فجرہ نصاریٰ کا علی العموم

---

[1] غدر کے چند علماء ص ۱۲۳، ۱۲۴۔ ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب سید احمد شہید جلد دوم ص ۲۵۸-۲۹۰

[2] ثمارۂ عظیم ص ۱۹۹،

اور پر ہر ایک مومن متبع اسلام کرام نے از قبیل غارت گری و آتش زدگی و قتل و پھانسی و کندیدگی عنان وپے پہ زنی و خونریزی علماء و مشائخان و احراق کلام اللہ و احادیث و کتب فقہ وغیرہ ہو رہا ہے، اظہر من الشمس ہے۔ اس صورت میں مومنین مخلصین کو لازم ہے کہ متحد جہاد ہو جائیں، بہ موجب ارشاد فیض بنیاد آنحضرت صلعم کے لکل نبی حرفۃ و حرفتی الجہاد، واسطے ہر نبی کے پیشہ ایک مقرر رہا ہے اور پیشہ میرا ہے جہاد، بے شک جس نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا، وہ ذلیل و خوار اور فقر فاقے میں گرفتار ہوا۔ فقط ۔

دعوت عام

اب بہ موجب "ان الجنۃ تحت ظلال السیوف" فائدہ اخروی اٹھاویں اور درجہ شہادت کا جس میں ہمیشہ کی زندگی ہے اور نعما جنت اور ازواج حوران بہشت پاویں اور کسی طرح کا شک و خطرہ بد دل میں نہ لاویں اور جان و مال سے اور تکثیر سواد و رائے صاحب و ہتھیار وغیرہ سے جہاں تک ممکن ہو شرکت بجا لاویں۔ ایسا نہ ہو کہ اوقات سعید اور آوان حمیدہ میں شرکت سے محروم رہیں اور پچھتاویں اور جو شخص اس مقدمے میں پیشوائی کرے اسی کو اپنا امام سمجھ کر بہ موجب "الجہاد واجب علیکم مع کل امیر برّا کان او فاجرا" کی تابعداری کریں، کیونکہ قرآن مجید و فرقان حمید فضائل جہاد سے بھرا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ سورۂ توبہ میں جابجا ارشاد ہے اور احباب سے امید ہے کہ اشتہار نامہ و پیام نامہ بہ نام جداگانہ نہ کریں۔ صرف اس اعلام کو کافی و وافی سمجھ کر ہر صاحب اپنے ملاقاتی و احباب سے ارشاد کر دیں ۔

غیبی سامان

اور جہاد میں بڑا سامان یہ ہے کہ بندے توکل بہ خدا کریں اور امداد جانب خالق کون و مکان سے ہو۔ سو امداد غیبی صریح ظاہر و باہر کہ مسلمان ہندوستان کے بہ سبب بے استطاعتی زر و عدم موجودگی گولہ و بارود و توپ و لشکر مجبور و ناتواں ہو رہے تھے۔ سو اس خالق اللہ الصمد نے دین احمد صلعم کو جیسا باطناً قوی و توانا کیا ہے، ویسا ہی ظاہر نہ ہے۔ سب سامان واسطے تسکین خاطر فاطر تم ضعفا مسکینان

اور امداد دین متین کے انھیں کفار نابکار نصاریٰ سے بد اطوار سے بلا سبب و کوشش ہم لوگوں کے دلا دیا۔

چنانچہ لشکر، سوار و پیادہ و توپ و گولہ و بارود و زر کثیر خصوصاً قطعہ شدہ عطیہ حضرت فرمانروائے کشور ہند ظل سبحانی خلیفۃ الرحمانی بادشاہ دہلی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ عموماً امداد عساکر و انواع و میگزین جناب برجیس قدر ادام اللہ حشمتہ والی لکھنؤ سے اور ہمراہی تمام راجگان قلمرو لکھنؤ و راجگان قرب و جوار الہ آباد وغیرہ اور اخلاق و اتفاق سارے ہندوستان میں باوصف ہونے اختلاف اقوام و مذہب کے۔

نصب العین

سو یہ سب دلائل کامل و براہین مدلل کمربندی اور پرانداز اس قوم نصاریٰ طاغی و باغی کے ہے۔ مناسب ہے کہ جو بھائی مسلمان اس خبر فرحت اثر کو سنیں وہ فوراً مستعد ہو کر کمر ہمت جہاد باندھ لیں۔ اور تا شہر الہ آباد تشریف لائیں اور قلعہ بند کفار نابکار کا قلع قمع کر کے بہ زور تیغ بے دریغ اپنی کے خاک میں ملا دیں، اور باقی ماندوں کو اس ملک سے بھگا دیں۔ پھر بہ اطمینان حکومت عدالت اسلام فرما دیں۔[1]

آخر میں سورہ توبہ سے چند آیات مع ترجمہ درج ہیں۔

غور طلب امور

اب ملاحظہ فرمائیے، اس اشتہار میں انگریزوں کے ظلم و جور کیا تفصیل بتائی گئی ہے۔ غارت گری، آتش زدگی، قتل، پھانسی، مکان کھود ڈالنا، چھاپے مارنا، علماء و مشائخ کا خون بہانا، کلام اللہ، احادیث اور کتب فقہ کا جلانا۔

اسے الزام تراشی نہ سمجھیں بلکہ یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ انگریزوں کو جہاں موقع ملتا تھا، یہی کرتے تھے، جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے مفصل حالات سے واضح ہو سکے گا۔ مجاہدین آزادی نے جو زیادتیاں کیں، ان میں سے بیشتر جوابی اور انتقامی تھیں۔ انگریز جن افسروں کی ستایش میں

---

[1] مجاہد اعظم صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱۔

سرگرم رہے مثلاً نجلس، نیل، ہاڈسن وغیرہ، ان کا وصف یہی تھا کہ وہ بڑے ہی سنگ دل بے رحم، جابر اور ظالم تھے، جہاں جاتے تھے، لوگوں کو اندھا دھند پکڑ پکڑ کر پھانسیوں پر لٹکا دیتے تھے۔

فتح پور کی جنگ

افسوس کہ مولانا کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ الہ آباد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور مولانا کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ الہ آباد کی تسخیر کے بعد وہ کان پور پہنچ گئے تھے۔ نانا نے انگریزوں کے مقابلے کے لیے جوالا پرشاد کو اپنے مجاہدوں کے ساتھ فتح پور بھیجا تھا۔ ٹیکا سنگھ بھی ان کے ساتھ تھا۔ میلسن لکھتا ہے:

> معلوم ہوتا ہے الہ آباد کا مولوی بھی اس موقع پر نانا کے ساتھیوں میں شامل تھا۔ کرنیل ولیمز نے ایک گواہ کے بیانات چھاپے ہیں۔ جب اس سے پوچھا گیا جنگ فتح پور میں (مجاہدین آزادی کا) کمانڈر کون تھا؟ اس نے کہا کہ میں نے ٹیکا سنگھ جرنیل، الہ آباد کے مولوی اور جوالا پرشاد کو کمانداری کی غرض سے جاتے دیکھا۔ [1]

ایک اور بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ الہ آباد کا مولوی کان پور آیا تھا اور بخشی زین العابدین کے مکان پر ٹھہرا تھا۔ [2]

حکیم احسن اللہ خاں کا بیان

حکیم احسن اللہ خاں کے بیان میں بتایا گیا ہے کہ مجاہدین الہ آباد کے امیر مولوی لیاقت علی کی ایک عرضداشت آئی تھی، جس کا مضمون یہ تھا کہ میں دہلی روانہ ہونے والا ہوں تاکہ فوجی امداد لے کر واپس آؤں اور بقیہ ملک کو یعنی الہ آباد اور گرد و نواح کو مخالفوں کے خرخشے سے پاک کر دوں۔ اس

---

[1] میلسن جلد دوم صفحہ ۱۷۲، [2] فوجی ریکارڈز۔

عرضداشت کا کوئی جواب اس لیے نہ دیا گیا کہ مولوی صاحب خود آنے والے تھے :

> جب وہ آئے تو بخت خاں نے اُنھیں دربار شاہی میں
> پیش کیا۔ پھر وہ لکھنؤ کی گورنری کا فرمان لے کر واپس گئے۔
> یہ فسادات شروع ہونے سے تین مہینے بعد کا واقعہ ہے[1]

یہ بیان حد درجہ عجیب اور سراسر ناقابلِ قبول ہے۔ وقت کے لحاظ سے یہ اواخر جولائی یا اوائل اگست کا واقعہ ہونا چاہیے۔ بے شک بخت خاں اس زمانے میں موجود تھا اور مولانا لیاقت علی کا آنا بھی سمجھ میں آسکتا ہے لیکن لکھنؤ کی گورنری کا پروانہ اُنھیں کیوں کر مل سکتا تھا، جب کہ وہاں برجیس قدر موجود تھا؟ نیز کچھ مدت بعد برجیس قدر کا سفیر آ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مولانا لیاقت علی کو کوئی پروانہ ملا تو وہ الہ آباد کی گورنری کا ہوگا۔ حکیم احسن اللہ خاں سے اس بارے میں بھول ہوئی۔

ایک اور بات تعجب انگیز ہے اور وہ یہ کہ مولانا فوجی امداد کے طلب گار تھے تاکہ جا کر جنگ کریں۔ وہ گورنری کے پروانے کو لے کر کیا کر سکتے تھے، وہ آخیں لیکر الہ آباد پر انگریز قابض ہو چکے تھے؟ محض پروانہ تو مولانا کو کوئی ملک نہ دلا سکتا تھا۔

بعد کے حالات

مفتی انتظام اللہ نے لکھا ہے کہ مولانا لیاقت علی الہ آباد سے رخصت ہو کر لکھنؤ چلے گئے[2] ظاہر ہے کہ یہ بیان نظرِ ثانی کا محتاج ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا الہ آباد سے کان پور پہنچے۔ پھر انھوں نے نانا کی فوج کے ساتھ ہو کر فتح پور میں انگریزوں سے جنگ کی۔ بعد ازاں دہلی گئے اور مجھے یقین ہے کہ بخت خاں کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے۔

جب تک لکھنؤ میں مقابلے کی صورتیں باقی رہیں، وہیں ٹھہرے رہے۔ مولانا احمد

---

[1] مقدمہ بہادر شاہ صفحہ ۲۶۵۔ [2] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۴۱۔

اللہ شاہ کی میت کہیں مذکور نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اودھ سے وہ نیپال چلے گئے تھے۔ نیپال کی حکومت نے چند افراد کے سوا سب کو واپس کر دیا تھا۔ چنانچہ مولانا لیاقت علی بھی گرفتار ہو کر آئے۔ مقدمہ چلا اور انڈیمان بھیج دیے گئے۔ وہاں پہنچنے سے کچھ دن بعد انتقال ہو گیا۔ دینی حمیت، ایمانی غیرت اور حُبِ آزادی کا یہ گوہرِ نایاب بھی انڈیمان ہی کی آغوش میں محوِ خواب ہے۔

سین کا بیان

ڈاکٹر سین نے الٰہ آباد کے ہنگامے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:[1]

اس نازک موقع پر ایک غیر معروف آدمی نظم و نسق کو سنبھالنے کے لیے بروئے کار آیا، مولوی لیاقت علی پرگنہ چائل کے ایک غریب گھرانے کا فرد تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہ ذات کا بافندہ اور پیشے کے لحاظ سے معلم تھا، چونکہ اس کی سربلندی میں نسب اور دولت کا کوئی حصہ نہ تھا، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی برتری صرف ذاتی کردار اور تقدس میں شہرت کا نتیجہ تھی۔ وہ اپنے مذہب اور پرانے نظام کا نقطہ بن کر کھڑا ہو گیا، جس میں بادشاہ شانِ مرکزیت تھا، اس لیے کہ وہ شاہ دہلی کے نام پر اور اس کے نائب کی حیثیت میں حکومت کرتا رہا۔ اس نے امن کے قیام اور اپنے تصور کے مطابق قانون کی حکومت کے استحکام کی کوشش کی۔ اس کی ناکامی تعجب انگیز نہیں، اس لیے کہ اسے فنونِ جنگ کے مبادی سے بھی آشنائی نہ تھی اور جنگی صلاحیتوں ہی کے ذریعے وہ سرکشوں پر موثر اقتدار قائم کر سکتا تھا۔ نہ اسے وہ ممتاز شخصیت حاصل تھی، جس کے سامنے عوام بے تامل خراج

---

[1] سین کی کتاب صفحہ

اطاعت قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔[1]

ڈاکٹر سین نے بعض انگریزوں کی رپورٹوں کے اعتماد پر لکھا ہے مولوی لیاقت علی نے مسیحیوں کو تبدیل مذہب کے ذریعے جانیں بچا لینے کا موقع دے دیا تھا۔[2] ایک سچے اور شریعت کے پابند مسلمان کے خلاف اب کوئی بیان بے تکلف قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں جبری تبدیل مذہب کا کوئی جواز نہیں اور مولوی لیاقت علی عالم دین ہونے کی حیثیت میں اس سے ناواقف نہ ہو سکتے تھے۔ اغلب ہے مسیحیوں نے بدلے ہوئے حالات دیکھ کر خود مسلمان ہو جانے پر آمادگی ظاہر کی ہو اور بعد میں اس فعل کو دوسرا لباس پہنا دیا گیا ہو۔

---

[1] سین کی کتاب ص۱۵۵ [2] ایضاً ص۱۵۶ - آخر میں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ ہندوستان کی قومی حکومت نے مولانا لیاقت علی کے اخلاف کے لیے خاصی مالی امداد کا انتظام کر دیا۔

تانتیا ٹوپے

ابتدائی حالات

تانتیا کا اپنا نام رام چندر والد کا نام پانڈو رنگ تھا۔ یقیناً وہ باجی راؤ ثانی کے خاص آدمیوں میں سے ہوگا کہ ساتھ ہی بٹھور پہنچا اور زندگی کے باقی اوقات باجی راؤ کے ساتھ ہی گزار دیے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کب وفات پائی۔

پانڈو رنگ کا اصل وطن پرگنہ جولہ، ضلع پٹودہ (علاقہ ناسک) جیسا کہ خود تانتیا نے اپنے بیان میں بتایا، لیکن بٹھور میں مستقل قیام کی وجہ سے وطن کے ساتھ کوئی خاص تعلق نہ رہا ہوگا، لہٰذا تانتیا نے اپنا مسکن و موطن بٹھور ہی بتایا۔

تاریخ پیدائش کہیں مذکور نہیں۔ اپریل ۱۸۵۹ء میں گرفتاری کے بعد تانتیا نے جو بیان مرتب کیا[1] تھا، اس میں اپنی عمر پینتالیس سال بتائی تھی۔ اس بنا پر سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۸۱۴ء یا ۱۸۱۵ء میں پیدا ہوا۔ میلی سن نے تانتیا کی تاریخ پیدائش ۱۸۱۲ء بتائی ہے۔ اس وقت پیشواؤں کی مسند عملاً محفوظ تھی، گو اس پر زوال کے اسباب برساتی گھٹاؤں کی طرح چھا چکے تھے۔ دو تین سال بعد یہ مسند بھی انگریزوں کی توسیع اقتدار پر قربان ہوگئی، جس طرح اس وسیع ملک کی دوسری مسندیں قربان ہو چکی تھیں یا قربان ہونے والی تھیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تانتیا کی تربیت بٹھور ہی میں ہوئی اور غالباً باجی راؤ نے اسے نانا کا مصاحب بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو نانا کا مصاحب یا اے ڈی کانگ ہی بتایا ہے۔

---

[1] میلی سن کی کتاب جلد پنجم میں تانتیا کا بیان بہ طور ضمیمہ شائع ہوا ہے۔

۱۸۵۷ء

ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ تانتیا نے کہاں تعلیم پائی اور وہ کیا کچھ جانتا تھا؟ فنونِ جنگ کہاں سیکھے اور ان میں مشق کس مقام پر بہم پہنچائی! تاریخ اس کے نام سے صرف اس وقت روشناس ہوئی جب ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا آغاز ہوا۔

تانتیا نے کان پور میں اس جنگ کے آغاز کا جو نقشہ تیار کیا، اسے ہم نانا کے حالات میں پیش کر چکے ہیں، اسے دوبارہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ تانتیا کے نزدیک:

۱۔ نانا جنگ کے محرکین میں سے نہ تھا، بلکہ اسے سرکش سپاہیوں نے مجبور کر کے ساتھ ملایا تھا۔

۲۔ کان پور میں انگریزوں نے ہتھیار ڈال دیے تو کشتیوں میں سوار ہو چکنے کے بعد بھی جو دردناک حالات پیش آئے، اس کے ذمہ دار سپاہی تھے نہ کہ نانا یا خود تانتیا یا دوسرے لیڈر۔ سپاہی کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔

۳۔ جب یہ خبر ملی کہ انگریزی فوج الہ آباد سے فتح پور تک پہنچ گئی ہے تو سپاہیوں نے نانا کو ساتھ لے جانا چاہا۔ وہ نہ گیا۔ البتہ اپنے خاص معتمد جوالا پرشاد کو فوج کے ساتھ بھیج دیا۔

۴۔ فتح پور میں شکست کھانے کے بعد فوج واپس ہوئی۔ پھر کان پور کے لیے جنگ پیش آئی تو وہاں بھی شکست ہی سے سابقہ پڑا۔

بٹھور سے روانگی

کان پور پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد بٹھور میں ٹھہرے رہنے کی کوئی صورت نہ تھی، چنانچہ نانا، بالا صاحب، راؤ صاحب اور تانتیا مع اہل و عیال وہاں سے نکلے اور دریا عبور کر کے فتح پور پہنچ گئے، جو اودھ کے علاقے میں تھا اور وہاں چودھری بھوپال سنگھ نام ایک شخص کے پاس مقیم رہے۔ چند

کے بعد اطلاع ملی کہ ۴۲ویں دیسی فوج شیوراج پور پہنچ گئی ہے۔ اُس نے نانا کو لکھا کہ کسی اعتمادی آدمی کو بھیج دیجئے۔ نانا نے تانتیا ہی کو بھیجا۔ چنانچہ تانتیا اس فوج کو لے کر بٹھور گیا۔ وہاں پھر انگریزی فوج سے لڑائی ہوئی۔ شکست کھائی اور وہ دوبارہ نانا سے جا ملا۔

نانا سے علیحدگی

ابھی چند روز گزرے تو نانا نے تانتیا کو حکم دیا کہ گوالیار چلے جاؤ اور وہاں سے جتنی فوج مل سکے لے کر انگریزوں سے جنگ کرو۔

چنانچہ تانتیا اس حکم کی تعمیل میں روانہ ہو گیا۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، اس کے بعد نانا سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس لیے کہ تانتیا الگ رہا، نانا لکھنؤ میں ٹھہرا رہا۔ پھر وہ احمد اللہ شاہ اور حضرت محل کے ساتھ شاہ جہان پور کی طرف چلا گیا اور وہاں سے نیپال پہنچ گیا۔

کان پور میں جنگ

تانتیا نے گوالیار کی چھاؤنی سے خاصی فوج ساتھ لی۔ اس کا ایک حصہ کالپی میں چھوڑا۔ باقی فوج کے ساتھ دریائے جمنا عبور کر کے کان پور پر حملہ کیا۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ انگریزی لشکر کے دو جرنیل ہیوسے لاک اور آؤٹ رم لکھنؤ میں محصور بیٹھے تھے۔ کالن کیمبل سپہ سالار ونڈھم[1] کو کان پور میں چھوڑ کر خود لکھنؤ کی طرف گیا تھا۔ جنگی نقطہ نگاہ سے بہترین تدبیر یہ تھی کہ تانتیا نے جس طرح جمنا کو عبور کیا تھا اسی طرح چپ چاپ گنگا کو عبور کر کے اودھ میں داخل ہو جاتا اور کالن کیمبل پر عقب سے حملہ کرتا لیکن اس نے یہ مناسب سمجھا کہ ونڈھم کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کان پور پر قابض ہو جائے، پھر کالن کیمبل کے خلاف پیش قدمی کرے۔

یہ سکیم بھی بڑی اچھی تھی۔ تانتیا نے بڑی سرگرمی سے ونڈھم پر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس اثناء میں کالن کیمبل نے انگریز محصورین کو بیلی گارد سے نکال کر عالم باغ میں ٹھہرایا، خود تو

---

[1] WINDHAM

بھی اور خیموں کو لے کر وہ کالپی واپس ہوا، اس لیے کہ اندیشہ تھا، مبادا ونڈھم پر حملہ ہو جائے اور وہ کسی بڑی فوج کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ گیارہ روز کے جدال و قتال کے بعد تانتیا ٹوپے کان پور سے پس پائی پر مجبور ہو گیا۔ وہ پہلے گنگا کو عبور کر کے کیپرا میں رہا۔ پھر راؤ صاحب کے حکم سے کالپی چلا گیا۔ وہاں بالا صاحب پہلے سے مقیم تھا۔

چرکھاری پر یورش

وسط ہند میں باندا سے ذرا جنوب کی طرف چرکھاری نام ایک ریاست تھی۔ تانتیا کالپی پہنچا تو نانا کی طرف سے اس کے نام حکم آیا کہ چرکھاری پر حملہ کرو، اس لیے کہ وہاں کا راجا انگریزوں کا وفادار تھا اور اسے جلد سے جلد ختم کر دینا حد درجہ ضروری تھا۔ چنانچہ تانتیا نے فوراً چرکھاری پہنچ کر محاصرہ کر لیا۔ اس وقت تانتیا کے ہمراہ نو سو سپاہی، دو سو سوار اور چار توپیں تھیں۔ راجا محصور ہو گیا۔ گیارہ روز کے بعد چرکھاری کی حوالگی عمل میں آئی۔ تانتیا کو راجا سے چوبیس توپیں اور تین لاکھ روپے ملے۔ اسی زمانے میں آس پاس کے بعض راجے تانتیا کے ساتھ مل گئے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ خاص توجہ کا محتاج ہے۔ سر ہیوروز جھانسی سے صرف چودہ میل کے فاصلے پر تھا، جب اسے حکم ملا کہ چرکھاری جاؤ اور فرمانبردار راجا کو دشمنوں سے بچاؤ۔ چرکھاری ہیوروز سے اسّی میل دور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسّی میل کا فاصلہ طے کرنے تک چرکھاری مقابلہ نہ کر سکے گا اور اس اثنا میں جھانسی کو محصور کر لینے کا منصوبہ درہم برہم ہو جائے گا۔ اس نے حکم نہ ماننے کی بھاری ذمہ داری قبول کر لی، لیکن وہ قدم نہ اٹھایا جو فوجی نقطۂ نگاہ سے غلط تھا اور اپنے تیار کیے ہوئے نقشے پر عمل کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جھانسی کی تسخیر نے چرکھاری کے لیے بھی کشایش کا راستہ پیدا کر دیا۔ مطلب یہ کہ بڑے بڑے انگریز سپہ سالار بھی حد درجہ غیر مآل اندیشانہ طرز عمل پر کاربند ہوئے لیکن قابل اور فہیم ماتحت افسروں نے ان حرکتوں کو عام صورت حال پر اثرانداز نہ ہونے دیا۔

جھانسی کی امداد

ادھر چرکھاری مسخر ہوا، ادھر سر ہیوروز جھانسی کا محاصرہ کر چکا تھا۔ رانی لکشمی بائی نے امداد کے لیے لکھا تو تانتیا نے راؤ صاحب

کو اطلاع دی، جو کالپی پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے حکم آیا کہ رانی کی امداد ضرور کرنی چاہیے۔ چنانچہ تانتیا جھانسی کی جانب روانہ ہوا۔ اس کے پاس چوبیس ہزار جنگجو اور اٹھائیس توپیں تھیں۔ یہ بہت بڑی قوت تھی جس سے کام لے کر ہیوروز کو بہ آسانی کچلا جا سکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ ہم رانی لکشمی بائی کے حالات میں بیان کر چکے ہیں، یہ فوج کچھ نہ کر سکی اور تھوڑی ہی دیر میں شکست کھا کر بھاگی۔ یہ یکم اپریل ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔ اس شکست نے نہ صرف جھانسی کی قسمت کا فیصلہ کر دیا، بلکہ وسط ہند میں جنگ آزادی کے مقاصد کو بھی شدید نقصان پہنچایا، جس کی تلافی بعد میں نہ ہو سکی اور انگریز کامیاب ہو گئے

جنگ کونچ

شکست کے بعد تانتیا کی فوج کا ایک حصہ چار پانچ توپیں لے کر جھانسی سے کالپی چلا گیا اور وہ خود دو سپاہیوں کے ساتھ چکر لگاتا ہوا کالپی پہنچا۔ اس اثناء میں رانی لکشمی بائی بھی جھانسی کھو کر کالپی میں وارد ہو چکی تھی۔ اس نے جاتے ہی راؤ صاحب سے درخواست کی کہ مجھے فوج دیجیے تاکہ انگریزوں سے لڑوں۔ راؤ صاحب نے فوج کو پریڈ کا حکم دیا۔ پھر تانتیا سے کہا کہ رانی کے ساتھ جنگ کے لیے جاؤ۔ تانتیا نے کالپی اور جھانسی کے درمیان کونچ میں لڑائی کا فیصلہ کیا تھا اور وہاں استحکامات بھی کر لیے تھے لیکن سر ہیوروز کے مقابلے میں شکست کھائی اور وہ اپنے والدین سے ملنے کے لیے چرخی چلا گیا۔ رانی دوبارہ کالپی پہنچی اور وہاں انگریزوں سے جنگ کی۔ جب کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اسی نے تجویز پیش کی کہ گوالیار پہنچ کر وہاں کی فوج سے آزادی وطن اور دھرم کے نام پر اپیل کرنی چاہیے۔ ساورکر نے لکھا ہے کہ تانتیا نے کونچ سے پیچھے ہٹتے ہی گوالیار کا رخ کر لیا تھا تاکہ وہاں کے لوگوں کو انگریزوں کے مقابلے کے لیے تیار کر دے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔

مرار اور کوٹہ کی سرائے

رانی لکشمی بائی، تانتیا ٹوپے، راؤ صاحب اور نواب باندہ گوالیار پہنچے۔ سندھیا نے روکنا چاہا۔ فوج نے

اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ بھاگ کر بمشکل انگریزوں کے پاس آگرہ پہنچا، گوالیار مجاہدین آزادی کے قبضے میں آگیا۔ یہاں انگریزوں سے ایک لڑائی مرار میں ہوئی اور دوسری کوٹہ کی سرائے میں۔ دونوں جگہ انگریز کامیاب ہوئے۔ رانی لکشمی بائی ماری گئی اور تانتیا نے راجپوتانہ کا رخ کر لیا ۱۹ جون ۱۸۵۸ء کو جوڑا علی پور میں شکست کھانے کے بعد کم و بیش نو مہینے تک تانتیا مسلسل بھاگا دوڑا پھرتا رہا۔

فرار اور تعاقب

اس دوران میں اس نے راجپوتانہ، وسط ہند اور گجرات تک چکر لگائے۔ ان مقامات کے محض نام بھی بتائے جائیں تو پورا صفحہ بھر جائے۔ چند بڑے بڑے مقامات یہ ہیں: ٹونک، اندر گڑھ، کوٹرا، بوندی، نصیر آباد، سانگانیر، پھر کوٹرا، کنکرولی، ناتھدوارہ، جھالرا پٹن، بھیل واڑہ، راج گڑھ، سرونج، عیسیٰ گڑھ، چندیری، منگرولی، جکلاؤں، سلطان پور، ناگ پور، ہوشنگ آباد، راج پورہ، چھوٹا اودے پور، بانسواڑہ، اودے پور، پرتاپ گڑھ، زیرا پور، ناہر گڑھ، پیرون، دوبارہ اندر گڑھ، دیوانا، سیکر، نروار۔

اس بھاگ دوڑ میں کچھ مدت تک راؤ صاحب اس کے ساتھ رہا۔ شہزادہ فیروز شاہ نے بھی تھوڑی مدت کے لیے اس کی معیت اختیار کیے رکھی۔ مختلف مقامات پر جھڑپیں یا لڑائیاں ہوتی رہیں۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں بمقام سیکر (ریاست جے پور) آخری بڑی لڑائی ہوئی اور مجاہدین نے شکست کھائی۔

عزیمت اور منصوبے

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ تانتیا نے ہمت بالکل نہ ہاری۔ جب اس نے وسط ہند سے جنوب کا رخ کیا تھا تو اس کا ارادہ یہ تھا کہ مرہٹوں کی آبادیوں میں پہنچ کر ان کی قومی غیرت و حمیت سے اپیل کرے اور انگریزوں کے خلاف اٹھا دے، لیکن انگریز اس وقت تک ہندوستان کے مختلف حصوں پر قابض ہو چکے تھے اور انھوں نے متعدد جیش تانتیا کے گرد و پیش جگہ

جگہ متعین کر دیے تھے جنھوں نے تانتیا کو دو چار روز بھی کہیں اطمینان سے بیٹھنے اور منصوبوں کو جامہ عمل پہنانے کا موقع نہ دیا۔ اس کی گرفتاری کا واقعہ بڑا ہی عبرت افزا اور رنج دہ ہے، جو تھوڑی سی تمہید کا متقاضی ہے۔

مان سنگھ

گوالیار کے ایک ماتحت رئیس مان سنگھ تھا، جو کسی معاملے پر مہاراجا سندھیا سے بگڑا اور بغاوت کی ٹھان لی۔ سندھیا کے مقابلہ وہ کیا کر سکتا تھا۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد اہل و عیال اور متعلقین کو لے کر جنگل میں جا بیٹھا اور انگریزوں کے مخالفوں سے ساز باز شروع کر دیا۔ جس زمانے میں تانتیا ٹوپے نے چرکھاری پر قبضہ کیا تھا تو دوسرے امراء کے علاوہ مان سنگھ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ انگریزوں کو اعتراف تھا کہ جنگل میں اسے گرفتار کرنا آسان نہیں۔ یہی شخص تھا جس کے پاس اس لیے تانتیا نے پناہ لی کہ وہ دوست تھا اور اس پر بھروسا کیا، یہی شخص تھا جس نے اپنی ریاست بحال کرانے کے لالچ میں اس عزیز دوست اور اس مجاہد آزادی وطن کے ساتھ بے وفائی کر کے اسے گرفتار کرا دیا۔

انگریزوں کا منصوبہ

جو فوج تانتیا ٹوپے کے تعاقب کے لیے مقرر تھی، اس کا رابرٹ نیپئر تھا جو بعد میں لارڈ نیپئر آف میگڈالا بنا اور افواج ہند کا سپہ سالار اعظم بھی ہوا۔ اس نے یہ منصوبہ سوچا کہ جب تک مان سنگھ کو کسی ذریعے سے ساتھ نہ ملایا جائے گا، تانتیا کی گرفتاری عمل میں نہ آ سکے گی۔ چنانچہ اس نے مختلف آدمیوں کے ذریعے سے مان سنگھ کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کی تدبیریں اختیار کر لیں۔

سندھیا کو اس بارے میں ہم نوا بنا لینا ہرگز مشکل نہ تھا۔ وہ تو اپنی قسمت انگریزوں کے حوالے کر چکا تھا۔ جس افسر کو اس کام پر مامور کیا گیا اس کا نام میڈ[1] تھا۔

گرد و پیش کے حالات کی چھان بین کرتے ہوئے دریافت ہو چکا تھا کہ مان سنگھ کے علاقے

۱؎ MEADE

میں نرائن سنگھ نام ایک ٹھاکر رہتا ہے، جس پر مان سنگھ کو پورا بھروسا ہے اور آس پاس بھی اس کا خاصا اثر ہے۔ میڈ نے اس ٹھاکر سے بات چیت کی۔ اسے اس امر پر آمادہ کر لیا کہ مان سنگھ کو حوالگی پر راضی کر دے اور اسے ہرگز کوئی ضرر پہنچنے نہ دیا جائے گا۔ نیز مان سنگھ کے مشیر خاص یا دیوان کو ساتھ لے آئے تاکہ حکومت کی طرف سے اسے بھی یقین دلا دیا جائے اور مفصل بات چیت ہو جائے۔

دیوان سے ملاقات

۱۱۔ مارچ ۱۸۵۹ء کو میڈ نے دیوان سے ملاقات کی۔ کہا جاتا تھا کہ مان سنگھ صرف اس کی بات مانے گا۔ میڈ نے اسے پورا اطمینان دلایا۔ یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر مان سنگھ کے اہل و عیال انگریزی کیمپ میں آ جائیں گے تو ان کی عزت و حرمت بحال رہے گی۔ دربار گوالیار کے آدمیوں کو ہرگز اجازت نہ دی جائے گی کہ انھیں تنگ کریں۔ کھانے پینے کا بڑا اچھا انتظام کر دیا جائے گا۔ آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر مان سنگھ واپس آ جائے تو اسے بھی کوئی آزار نہ پہنچے گا۔ بعد میں میڈ نے یہ تمام وعدے لکھ کر دیوان کے حوالے کر دیے۔

مان سنگھ کی حوالگی

دیوان نے مان سنگھ سے بات چیت کی اور اسے حوالگی پر آمادہ کر لیا۔ سب سے پہلے وہ مان سنگھ کے اہل و عیال اور نوکروں چاکروں کو لے آیا۔ یہ کوئی ستر آدمی ہوں گے۔ میڈ نے انھیں بہ حفاظت مان سنگھ کے ایک گاؤں میں بھیج دیا جو سیپری کے قریب واقع تھا اور ان کے لیے تمام ضروری انتظامات کر دیے۔ یہ دراصل مان سنگھ کی حوالگی کا پیش خیمہ تھا۔ ممکن ہے وہ دیکھنا چاہتا ہو کہ اس کے متعلقین سے کیسا سلوک کیا جاتا ہے اور پورے اطمینان کے بعد آنا چاہتا ہو۔

جب اس پر واضح ہو گیا کہ سب کچھ حسب مراد ہو رہا ہے تو ۲۰ اپریل ۱۸۵۹ء کو وہ خود بھی انگریزی کیمپ میں آیا۔ تاہم اس وقت تک اسے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ انگریزوں نے جو جال بچھا رکھا ہے، وہ کیا ہے اور اسے اپنی انسانیت کو پستی کی کس گہرائی میں پہنچانا

پڑے گا۔ یعنی وہ سمجھتا تھا کہ صرف میری سرکشی ختم کرنی منظور ہے، یہ معلوم نہ تھا کہ اسے تانتیا کی گرفتاری کے لیے طعمے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

مان سنگھ پر ڈورے

اب مان سنگھ پر ڈورے ڈالے جانے لگے۔ اسے یقین دلایا گیا کہ جان یا آبرو کو کوئی بھی ضرر نہ پہنچے گا، لیکن مال کے متعلق کوئی وعدہ نہ تھا۔ اب مختلف کارکنوں کے ذریعے سے اس کے سامنے عجیب و غریب ترغیبات پیش ہونے لگیں، مثلاً یہ کہ وہ بہت بڑا امیر تھا۔ راجاؤں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کے سیکڑوں متوسلین ہیں، جب تک جاگیر نہ ملے گی، ان سب کا گزارا کیوں کر چلے گا اور خود وہ اپنی حیثیت کیوں کر بحال رکھ سکے گا؟ شروع میں تو مان سنگھ کچھ سمجھا ہی نہیں کہ مدعا کیا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اسے بھی پرانی ریاست کے خواب آنے لگے، سب کارندے یہی کہتے کہ جب تک کوئی نمایاں خدمت انجام نہ دوگے، ریاست واپس ملنے کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ ۲ اور ۳۔ اپریل کو خود میڈ نے اس سے مفصّل باتیں کیں۔ اس اثناء میں اطلاع ملی کہ مان سنگھ کا چچا، جو اسی کی طرح گھر بار چھوڑ کر جنگل میں بیٹھا تھا، ایک خاص جگہ موجود ہے۔ مان سنگھ خود فوج کے ساتھ ہو کر اسے پکڑوانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گویا انگریزوں کا جادو چل گیا۔ جو شخص اپنے حقیقی چچا کو پکڑوانے کے لیے تیار ہو چکا تھا، اس کے لیے ایک ایسے شخص کو پکڑوا دینے میں کیا تامل ہو سکتا تھا۔ جس کے ساتھ خون یا خاندان یا نسل کا کوئی بھی رشتہ نہ تھا۔

مان سنگھ کے چچا کو بر وقت اطلاع مل گئی اس لیے کہ اس کے اور خود مان سنگھ کے جاسوس انگریزی لشکر میں موجود تھے۔ مان سنگھ کو اس کے بچ نکلنے پر سخت تاسف ہوا۔ میلی سن نے بالکل صحیح لکھا ہے؟

لہ ان میں سے ایک مسمّی پرتھوی پال کا ذکر میلی سن نے کر دیا ہے۔ جلد پنجم صفحہ ۲۶۳: ہ

> یہ تذلیل و افتادگی کی طرف پہلا قدم تھا ـــــ کہنا
> چاہیے کہ یہ زیادہ تذلیل و افتادگی کی تمہید تھی[1]

بدبخت مان سنگھ

اب مان سنگھ کی صرف ایک آرزو تھی اور وہ یہ کہ جلد سے جلد تانتیا کو گرفتار کرائے اپنی ریاست یا جاگیر بحال کرا لے۔ اسے تاخیر میں یہ اندیشہ نظر آتا تھا کہ ممکن ہے تانتیا کسی دوسری جگہ چلا جائے۔ اسی اثنا میں تانتیا نے مان سنگھ کے ذریعے سے قاصد بھیج کر ساتھیوں کا حال دریافت کر لیا تھا اور اسے معلوم ہو چکا تھا کہ آٹھ نو ہزار آدمی سرونج کے جنگل میں موجود ہیں۔ راؤ صاحب الگ ہو چکا ہے، لیکن شہزادہ فیروز شاہ، نواب عادل محمد اور امام علی وردی میجر ان آدمیوں کے ساتھ ہیں۔ امام علی نے تانتیا کو ایک خط بھی بھیجا تھا کہ ہمارے پاس چلے آؤ۔ یہ خط ۵-اپریل کو ملا تھا۔ گویا اگر مان سنگھ غداری پر آمادہ نہ ہو جاتا تو اغلب تھا کہ تانتیا فوج سے جا ملتا۔ سوال یہ نہیں کہ اس حالت میں وہ لوگ کچھ کر سکتے یا نہ کر سکتے، تاہم تانتیا کے بچ نکلنے کی صورتیں ضرور موجود تھیں۔

اگرچہ تانتیا کو معلوم ہو چکا تھا کہ مان سنگھ انگریزوں سے مل گیا ہے، تاہم اسے پورا یقین تھا کہ وہ دوست ہے اور وہ کبھی اسے بھی دھوکا نہ دے گا۔ تانتیا نے اپنا مسکن بھی مان سنگھ کے مقرر کیے ہوئے آدمی کی رائے کے مطابق تجویز کیا تھا۔ مان سنگھ نے اسے تاکید کر دی تھی کہ جہاں یہ شخص تمہیں لے جائے، وہیں ٹھہر جانا۔

حوالگی

مان سنگھ سارے فیصلے کر چکنے کے بعد یہ کہہ کر چلا گیا کہ میں دو تین روز میں آؤں گا۔ اس اثنا میں وہ تانتیا کے پاس پہنچا ہوگا، اسے اطمینان دلایا ہوگا کہ کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اطمینان سے ٹھہرے رہو، تمہیں کوئی گزند نہ پہنچے گا۔

---

[1] جلد پنجم صفحہ ۱۶۱

خود تانتیا نے لکھا ہے کہ مان سنگھ نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کرنے سے پیشتر مجھ سے مشورہ کیا تھا۔ پھر وہ یہ کہہ کر چلا گیا دو تین روز میں آؤں گا واپس آیا تو دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اس میں یہ ذکر بھی کیا کہ میڈ کی نیت بخیر معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مجھے کیا مشورہ دیتے ہو، چلا جاؤں یا یہیں ٹھہرا رہوں؟ اس نے کہا کہ صبح اس سوال کا جواب دوں ۔

تانتیا کا اعتماد ملاحظہ ہو کہ مان سنگھ کی حوالگی پر بھی اس کے متعلق شبہ پیدا نہ ہوا۔ اس کے برعکس بدبخت مان سنگھ کی کمینگی دیکھیے، پہلے تانتیا کو یہ جھانسہ دینے کی کوشش کی کہ میڈ کے پاس چلے چلو تو تمہیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔ جب دیکھا کہ تانتیا اس قسم کی باتوں پر توجہ نہیں ہو سکتا تو اسے یہ کہہ کر سلا دیا کہ صبح فیصلہ کریں گے اور اسی رات پکڑوا دیا

گرفتاری کی کیفیت یہ ہے کہ ۷۔ اپریل ۱۸۵۹ء کو آدھی رات کے وقت مان سنگھ تانتیا کے مامن پر پہنچا۔ پیچھے پیچھے فوج کے آدمی تھے۔ تانتیا کو سوتے میں جا لیا اور اس کے بازو خود مان سنگھ نے پکڑ کر جکڑوا دیے۔ اسی وقت فوجی لوگ تانتیا کو لے کر میڈ کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ۸۔ اپریل کو صبح کے وقت کیمپ میں پہنچ گئے۔ بدبخت مان سنگھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ میں اپنے دوست کو پکڑوا دیتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ اسے کوئی گزند نہ پہنچے۔ بدعہدی کی بہت سی داستانیں تاریخ میں مذکور ہیں لیکن مان سنگھ کی بدعہدی چند منتخب بدعہدیوں میں شامل ہونی چاہیے۔

بے رحمانہ مان سنگھ کو جاگیر مل نہیں سکتی ہیں جاگیر مل گئی لیکن وہ جب تک زندہ رہا ہوگا، اس جاگیر کا ایک ایک ذرہ تانتیا ٹوپے کے خون ناحق کا پیغامی بنا رہا ہوگا اور ۷۔ اپریل ۱۸۵۹ء کی غداری یاد دلاتا رہتا ہوگا۔ ایک طرف تانتیا تھا جس نے آزادی وطن کے لیے جان کی بازی لگائی اور جان دے دی۔ دوسری طرف مان سنگھ تھا جس نے ایک چھوٹے سے اور بالکل غیر معروف قطعہ اراضی کے لیے دوستی، شرافت، انسانیت ہر ایک کو

بے پروائی سے قربان کر دیا۔ لوگوں نے میر جعفر اور میر صادق کو مثالی غدار بتایا۔ وہی کا میرزا الہی بخش اور گوالیار کا مان سنگھ بھی اسی درجے میں رکھے جانے کے مستحق ہیں لے

مقدمہ تانتیا کو بتاریخ ۸۔ اپریل سیپری لے گئے، جو گوالیار سے ٹونک جانے والی سڑک پر ایک مشہور مقام ہے اور یہ مان سنگھ کی جاگیر کا ایک حصہ تھا۔ وہاں اُس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ اس کے خلاف صرف ایک الزام تھا کہ انگریزی حکومت کے خلاف جنگ کی۔ اس کا جواب نہایت سادہ اور واضح تھا یعنی:

> میں نے کالپی پر قبضے تک تمام امور میں اپنے آقا و مالک نانا صاحب کے احکام کی تعمیل کی۔ بعد ازاں راؤ صاحب کے احکام مانتا رہا۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا الا یہ کہ فرنگی مردوں، عورتوں یا بچوں کے قتل سے مجھے کوئی سروکار نہیں اور نہ میں نے کبھی کسی کو پھانسی کا حکم دیا۔ ٢

بیان کی حیثیت تانتیا کا یہ بیان یقینی اور قطعی طور پر درست تھا۔ اس سلسلے میں چند حقائق پیش نظر رکھیے:

۱۔ تانتیا کی طرح ہر مرہٹے کے نزدیک صرف باجی راؤ اور اس کے اخلاف ہی حکمرانی کے مجاز تھے اور ان کے احکام کی تعمیل ہر حال میں ضروری تھی۔

۲۔ تانتیا باجی راؤ کے گھر میں پیدا ہوا اور وہیں پرورش پائی۔

لہ میلی نے لکھا ہے کہ وہ لوگ تانتیا کے ساتھ تھے جو ادھر اُدھر ہو گئے۔ تانتیا کے پاس ایک تلوار اور ایک گٹری، تین سنہری کڑے اور ایک سو اٹھارہ اشرفیاں تھیں۔

٢ میلی سن جلد پنجم ص ۲۹۲۔

۳ - میل سن کے بیان کے مطابق انگریزوں کو وہ اجنبی سمجھتا تھا جنھوں نے مرہٹوں کی سلطنت چھین لی تھی۔

۴ - یقیناً تانتیا نے کسی بھی انگریز کے قتل میں حصہ نہ لیا اور نہ کسی کو پھانسی پر لٹکانے کی سزا دی۔ ستی چوڑا کے گھاٹ کا قتل سپاہیوں کا کام تھا، جو نانا یا تانتیا یا کسی کی بات سننے پر آمادہ نہ تھے۔ دوسرے حکم قتل کا اگر کوئی ذمہ دار ہو سکتا تھا تو وہ نانا تھا نہ کہ تانتیا۔

سزا اور اُس کا نفاذ

۱۵- اپریل ۱۸۵۹ء کو فوجی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا اور اسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ لطف یہ کہ اس کے خلاف قتل کا کوئی الزام عائد نہ کیا گیا۔ ۱۸- اپریل کو سیپری میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس بارے میں ہم خود کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ صرف میل سن کا بیان درج کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

> وقت کی رائے عامہ نے اس سزا کے منصفانہ ہونے کی تصدیق کر دی تھی، لیکن میرا خیال ہے کہ شاید آئندہ نسلیں اس کی درستی میں شک کریں گی۔ تانتیا ٹوپے انگریزی حکومت کے دائرے میں پیدا نہ ہوا تھا اور نہ اس کا ماتحت تھا۔ اس کی پیدائش کے وقت، جو غالباً ۱۸۱۲ء میں ہوئی، اس کا آقا مغربی ہند کے ایک بہت بڑے حصے کا خود مختار حکمران تھا۔ اس کے لیے قطعاً واجب نہ تھا کہ اس قوم کی خدمت خلوص و وفاداری سے انجام دے، جس نے اس کے آقا کو سلطنت سے محروم کیا تھا جب اس کے آقا نے، جو انگریزوں کے ساتھ کسی بھی رشتے سے وابستہ

نہ تھا۔ پیشوا کے علاقے واپس لے لینے کا موقع دیکھ تو تانتیا نے
بھی مصاحب کی حیثیت سے اس کے احکام کی تعمیل کی اور اس
کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کردی۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ میں
کسی قتل کا مرتکب نہ ہُوا اور اس پر ایسا کوئی الزام لگایا بھی
نہ گیا۔ سابق پیشوا کے خاندان کا ایک متوسل ہونے کے باوجود
اس پر انگریزوں کے خلاف جنگ کا الزام عائد کیا گیا اور اسی
الزام کی بنا پر اسے مجرم قرار دے کر پھانسی پر لٹکایا گیا۔[1]

تاہم اسے کیا کیا جائے کہ انگریزوں پر وحشت سوار تھی۔ وہ خون کے پیاسے تھے اور اندھا دھند موت کی سزائیں دینے پر تلے بیٹھے تھے۔ تانتیا کا خون بھی ہمارے نزدیک خونِ ناحق تھا۔

شخصیت

تانتیا کی شخصیت کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یقیناً وہ کوئی بڑا جرنیل نہ تھا۔ اُس نے کسی بھی جنگ میں سپہ گری کے جوہر نہ دکھائے۔ جھانسی کے سامنے اس کے ساتھ بائیس ہزار جنگجو تھے جو ایک ہلّے میں انگریزی فوج کا قلع قمع کر سکتے تھے، لیکن وہ وہاں بھی کچھ نہ کر سکا۔ بے شک سپاہی اچھے نہ تھے، لیکن اچھے سپہ سالار معمولی سپاہیوں سے بھی اعلےٰ کام لیتے رہے ہیں۔

انگریزوں نے جھانسی اور کونچ سے اس کی مراجعت کی بڑی تعریف کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ بوزا علی پور کی شکست کے بعد گرفتاری تک اُس نے ایک بار دو سے بھی زیادہ دفعہ راجپوتانہ اور مالوہ کا چکر لگایا اور یہ علاقہ ایک لاکھ اکسٹھ ہزار سات سو مربع میل ہے۔ تاہم اُس نے ایسا کوئی کارنامہ انجام نہ دیا، جس میں اس کی ممتاز حیثیت نمایاں

---

[1] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۲۱۶۔

ہوئی۔ رانی لکشمی بائی بھی تاکام رہی، کامیاب نہ ہو سکی، لیکن وہ جہاں لڑی، اس مردانگی سے لڑی کہ دشمن بھی اعتراف پر مجبور ہو گئے۔

تانتیا کی عظمت اس کے خاص جوہروں میں نہیں بلکہ ایک بڑے مقصد کے لیے جان کی بازی لگانے میں ہے۔ یہ شرف بھی بہت کم آدمیوں کو حاصل ہوتا ہے کہ کسی بلند نصب العین کے لیے قدم اٹھائیں تو آخری سانس تک روگردانی نہ کریں۔

لندن کے ایک میوزیم میں تانتیا کی ایک اچکن اب تک محفوظ ہے۔ یہ سیاہ رنگ کی اونی اچکن ہے . . . . ہندوستانی فوج کے ایک انگریزی افسر نے پنسل سے اس کا خاکہ بھی بنایا تھا[1] جو ویسے کا ویسا موجود ہے۔ شاید اس کے سوا تانتیا کی شبیہ کا اندازہ کرنے کی کوئی صورت نہیں۔

---

[1] موجدار ص ۱۶۳

مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں

تمہید ان دونوں بزرگوں کے حالات یکجا بیان کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ آزادی کے جہاد میں ان دونوں نے اکٹھے کام کیا: وجہ یہ ہے کہ اول ایک مذہبی مجاہدے میں یہ رفیق تھے، دوسرے جنگ آزادی ناکامی پر منتج ہوئی تو دونوں یکے بعد دیگرے حجاز پہنچ گئے اور باقی زندگی اسی مقدس سرزمین میں پوری کر کے مالک حقیقی سے جا ملے اور دونوں کے زیادہ تر حالات اسی دور کے متعلق ملتے ہیں جب انھوں نے اکٹھے کام کیا۔

مولانا رحمت اللہ مولانا کا وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا، اس لیے کیرانوی مشہور ہوے۔ والد کا نام مولوی نجیب اللہ، اجداد کا اصل وطن پانی پت تھا، جہاں ان کی خاصی جایداد بھی تھی، یہ بعد میں ضبط کر لی گئی۔ ان کے جد اعلیٰ کا نام شیخ عبدالرحمان عثمانی گازرونی بتایا گیا ہے۔ مولانا کے اخلاف میں سے ایک صاحب مولانا محمد عارف الاسلام، مخدوم جلال الدین کبیر الاولیا کو اپنے اجداد میں شمار کرتے ہیں۔

مولانا کی پیدائش ۱۲۳۳ھ بمطابق ۱۸۱۸ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ پھر دہلی چلے گئے جو اس زمانے میں علم و فضل کا سب سے بڑا مرکز تھا اور وہاں بے شمار درسگاہیں تھیں۔

مولوی محمد حیات کی درسگاہ میں شامل رہے جو لال قلعہ کے پاس تھی۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دہلی سے لکھنؤ جا کر مفتی سعداللہ سے تکمیل علوم کی۔ مولانا کے والد بیرونِ شہر میر منشی تھے۔ پھر ہند و ملوک مرہٹہ کے دیوان رہے۔ ۱۲۵۲ھ میں وہ اتنے بوڑھے ہو چکے تھے کہ ملازمت چھوڑ کر وطن چلے گئے۔

ڈاکٹر وزیر خاں

ڈاکٹر وزیر خاں کے پورے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی فرماتے ہیں کہ:

> شرفائے افاغنہ میں سے تھے۔ ان کے والد محمد نذیر خاں بہار کے بڑے زمیندار تھے۔ وزیر خاں علوم رسمیہ سے فراغت کے بعد مرشدآباد میں انگریزی کی تعلیم پائی۔ کچھ مدت تک وہیں ڈاکٹری پڑھتے رہے۔ پھر ولایت چلے گئے۔ جہاں سے اسسٹنٹ سرجن کی ڈگری لی اور اپنے شوق سے عبرانی و یونانی بھی پڑھ لی۔ اس زمانے میں مذہبی مباحث کا زور تھا۔ پادریوں کی طرف سے اسلام پر اعتراض ہو رہے تھے۔ مسلمان بھی بڑے زور سے جواب دیتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر خاں نے انجیل و توراۃ کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے ہی کی غرض سے عبرانی اور یونانی میں مہارت حاصل کی تھی اور کہا جاتا ہے کہ ولایت سے واپس آتے تو انجیل و توراۃ کے مختلف نسخے، شرحیں، تفسیریں وغیرہ ساتھ لائے اور یہ سب کتابیں ایک سو سے کم نہ ہوں گی[۱]

پہلے کلکتہ کے ہسپتال میں متعین ہوئے۔ پھر انھیں آگرہ بھیج دیا گیا۔ وہ جب انھوں نے

---

[۱] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۲۰۰، بہتر مشاہیر جنگ آزادی صفحہ ۱۲۹

مستقل سکونت اختیار کر لی۔ تاج گنج کے محلہ کاغذیاں میں رہتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے انھیں "اکبر آبادی" لکھا گیا۔

یکساں ذوق اور دوستی مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی کے علمی اور عملی ذوق میں یکسانی کے کئی پہلو تھے۔ مثلاً دونوں آزادی وطن کے شیدائی تھے۔ حسب موقع دونوں نے جنگ میں سرگرم حصّہ لیا۔ دونوں کو عیسائیت کے مآخذ پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور پادریوں کے ساتھ مناظروں میں ان کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ اس وجہ سے دونوں کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔

عیسائیت کی تبلیغ ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا تو ہر ملک سے عیسائی مبلّغ ہندوستان پہنچ گئے اور انھوں نے جگہ جگہ مشن قائم کر لیے۔ مقصود یہ تھا کہ یہاں کے باشندوں کو جلد سے جلد عیسائی بنا لیا جائے تاکہ انگریزی حکومت کی بنیادیں مستحکم ہو جائیں۔ اس غرض سے چھاپے خانے قائم کر لیے گئے تھے۔ جہاں عیسائیت کی تبلیغ کے متعلق ضروری کتابیں بکثرت چھاپ چھاپ کر نشر کی جاتی تھیں اور ان کی قیمت بہت کم تھی۔ اخبار اور رسالے بھی نکلنے لگے تھے۔ لطف یہ کہ کتابیں مختلف حصص ملک کی مروجہ زبانوں میں چھاپی جاتی تھیں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ پڑھ سکیں۔ دوسرے مذاہب خصوصاً اسلام پر اعتراضات بھی کیے جاتے تھے اور مناظرے بھی ہوتے تھے۔

پادری فنڈر سنہ ۱۸۵۴ء میں یورپ سے فنڈر نام ایک پادری آیا، جسے عربی اور فارسی میں خاصی مہارت حاصل تھی اور وہ اکثر اسلامی کتابیں بالواسطہ یعنی ترجموں کے ذریعے سے نہیں بلکہ بلا واسطہ پڑھ چکا تھا۔ ہمارے عام علماء بیچارے سادہ سے لوگ تھے۔ تورات، زبور اور انجیل یا عیسائیت کی دوسری کتابوں سے چنداں آگاہی نہ تھی۔

اور نہ عیسائیوں کے اعتراضات سے واقفیت تھی۔ اس لیے وہ مناظروں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتے تھے اور فنڈر کے متعلق مشہور ہو چکا تھا کہ کوئی اس کے اعتراضات کا جواب دے ہی نہیں سکتا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے عیسائیت کے متعلق ایسی معلومات حاصل کرلی تھیں، جو اکثر پادریوں کو بھی حاصل نہ تھیں، پھر عیسائیت کی تردید اور اسلام کی حقانیت کے اثبات میں غیر معمولی کمال بہم پہنچایا۔

فنڈر نے مناظرے کا اعلان کیا تو ڈاکٹر وزیر خاں نے مولانا رحمت اللہ کو کیرانہ سے بلوا لیا وہ دراصل فنڈر کو ایک مرتبہ ایسی شکست دینا چاہتے تھے کہ پھر اس کے لیے کہیں ٹھہرنے کا موقع باقی نہ رہے۔

مناظرہ

۱۱۔ رجب ۱۲۷۰ھ (۹۔ اپریل ۱۸۵۴ء) کو آگرہ میں مناظرے کا انتظام ہوا۔[1] چونکہ یہ بڑے معرکے کا مناظرہ تھا، اس لیے ہندوستان کے اکثر حصوں سے علماء، امراء اور عام لوگ آگرہ پہنچے۔ بڑے بڑے انگریز افسر بھی شریک مجلس تھے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے دو دو مناظر مقرر ہوئے۔ عیسائیوں کی طرف سے مناظر اول پادری فنڈر اور مناظر دوم پادری فرنچ، مسلمانوں کی طرف سے مناظر اول مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور مناظر دوم ڈاکٹر وزیر خاں۔ مولانا فیض احمد بدایونی بھی اس مناظرے میں مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کے معاون تھے۔ موضوع مناظرہ یہ تھا کہ مسلمان اثبات رسالت صلعم اور محفوظیت قرآن کے دلائل دیں نیز تثلیث کا ابطال کریں اور ثبوت دیں کہ انجیل و تورات محرف ہیں۔ عیسائیوں کا موقف اس کی ضد تھا۔

مفتی انتظام اللہ کیفیت یوں بیان فرماتے ہیں۔

---

[1] بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا آگرہ گئے تھے تو کچلی اینٹ میں قیام پذیر ہوئے تھے (مشاہیر جنگ آزادی ص۱۲۲)

پہلا مسئلہ جس پر بحث ہوئی، انجیل و تورات کی تحریف کا تھا۔ بحث
و تمحیص کے بعد علانیہ سب کے سامنے پادری فنڈر کو اعلان کرنا پڑا
کہ ہماری کتابیں (انجیل و تورات) محرف ہو چکی ہیں، لیکن صرف مسئلہ
تثلیث میں تحریف نہیں ہوئی۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ جس کتاب کو
خود مشکوک مان رہا ہے۔ اس پر ایمان لانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔
الغرض شکست فاش کے ساتھ فنڈر کو مجلس سے اٹھنا پڑا اور آگرہ
سے چلتا بنا۔[1]

غرض ہندوستان میں پادری فنڈر اور دوسرے پادریوں کو ناکام بنانے والے مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں ہی تھے۔ پھر یہ ذوق عام ہوا۔ سیکڑوں، ہزاروں، مسلمانوں نے عیسائیت کی کتابوں سے گہری واقفیت حاصل کر لی اور عیسائیوں یا دوسرے مبلغوں سے مناظرے کرنے لگے۔

جنگ آزادی

میرٹھ میں ہنگامہ برپا ہوتے ہی مظفر نگر میں حالات نے نازک صورت اختیار کر لی اور مختلف قصبوں میں آزادی کا پرچم بلند کر دیا تھا۔ مثلاً تھانہ بھون، کیرانہ، شاملی بڑھانہ وغیرہ۔ مولانا رحمت اللہ نواح کیرانہ میں مجاہدین کی فوج کے سالار تھے۔

مجاہدین کیرانہ میں مسلمان گوجروں کی اکثریت تھی اور ان کی قیادت چودھری عظیم الدین[2]

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۲۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا نے انجیل و تورات کے کثیر التعداد نسخے کھول کر رکھ دیے تھے اور ہر نسخے کی عبارتیں پڑھ پڑھ کر اختلاف کے ثبوت دیتے جاتے تھے۔ اس کیفیت پر سب حیران رہ گئے۔ پھر فنڈر اور مولانا میں خط و کتابت بھی ہوئی۔ خط و کتابت امین الدین ہندی نے چھاپ دی تھی، مناظرہ کی روئداد سید عبداللہ اکبرآبادی نے شائع کی (مشاہیر جنگ آزادی صفحہ ۲۲)۔

[2] معلوم ہوتا کہ چودھری صاحب بھی بعد ازاں مولانا کے پاس حجاز چلے گئے تھے۔

کر رہے تھے۔ لیکن تمام احکام مولانا رحمت اللہ ہی سے حاصل کیے جاتے تھے۔ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر نقارہ بجایا جاتا، جس کی آواز سن کر لوگ جمع ہو جاتے۔ پھر اعلان ہوتا۔ "ملک خدا کا، حکم مولوی رحمت اللہ کا" اس کے بعد جو کچھ بتانا ہوتا بتا دیا جاتا۔

انگریزوں کی آمد

قریباً چار مہینے تک یہ سلسلہ اطمینان سے جاری رہا۔ پھر انگریزی فوج کیرانہ پہنچی۔ محلہ دربار کے دروازے کے سامنے توپیں لگا دی گئیں اور مختلف گھرانوں کی تلاشی شروع ہو گئی۔ چونکہ مولانا کی قیادت کا علم انگریزوں کو ہو چکا تھا، اس لیے انھیں کو ڈھونڈا جا رہا تھا۔ مولانا کو پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی اور وہ اپنے خاص رفیقوں کو لے کر پاس کے ایک گاؤں پنجیٹھ میں پہنچ چکے تھے۔ جب کیرانہ میں مولانا نہ ملے تو کسی مخبر نے پنجیٹھ کے بارے میں اطلاع دے دی کہ وہاں تلاش کرنا چاہیے۔ چنانچہ انگریزی فوج نے ادھر کا رُخ کر لیا۔

مولانا کا بچاؤ

انگریزی فوج ابھی راستے ہی میں تھی کہ پنجیٹھ کے نمبردار نے مولانا کا عالمانہ لباس اتروا دیا، گھسے کھدروں یا کسانوں کا لباس پہنایا، کھرپا ہاتھ میں دیا اور کھیت میں گھاس کھودنے کے لیے بٹھا دیا۔ مولانا فرمایا کرتے تھے کہ میں جس کھیت میں گھاس کھود رہا تھا، انگریزی فوج اس کے ساتھ کی پگ ڈنڈی سے گزری۔ بلکہ گھوڑوں کی ٹاپوں سے جو کنکریاں اڑتی تھیں، وہ میرے جسم کو لگ رہی تھیں۔ پنجیٹھ پہنچ کر ایک ایک گھر کی تلاشی ہوئی اور مولانا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ یوں مولانا بچ کر وطن سے نکلے۔ غالباً اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان میں نہ رہیں گے۔ تاہم کیرانہ سے باہر جانا سہل نہ تھا۔ اس لیے کہ ہر طرف دور دور تک انگریزوں کی عملداری تھی اور کہیں بھی وہ گرفتار ہو سکتے تھے۔

مولوی ذکاء اللہ کا بیان

مولوی ذکاء اللہ دہلی کے حالات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ باہر سے جو پلٹنیں ہتھیاروں

کے بغیر آتی تھیں، اُنھیں دہلی کے میگزین سے ہتھیار مل جاتے تھے:

مولوی رحمت اللہ اسی تو وہ میں آئے کہ دہلی میں جہاد کی صورت کیا ہے۔ وہ بڑے عالم فاضل تھے، عیسائی مذہب کے رد میں صاحب تصنیف تھے۔ وہ قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے۔ اس دانشمند مولوی کے نزدیک دہلی میں جہاد کی کوئی صورت نہ تھی۔ بلکہ ایک ہنگامۂ فساد برپا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے وطن چلا گیا۔[1]

غور طلب حقائق

ظاہر ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہوگا جب دہلی میں مجاہدین کی خاصی تعداد مقیم تھی اور مقابلہ ہو رہا تھا۔ مطلب یہ کہ مولانا نے اپنے ہاں جہاد کا بندوبست کرنے کے علاوہ اس امر کی بھی کوشش کی کہ دہلی کے مرکز کی حالت دیکھیں، اُسے ہر ممکن ذریعے سے تقویت پہنچائیں یا باہم مشورے سے تنظیمات کا بندوبست کریں۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ علمائے کرام کے نزدیک یہ ہنگامہ نہ جہاد تھا اور نہ اسے وہ بے تمیز قرار دے سکتے تھے۔ وہ صحیح اصول و ضوابط کے مطابق انگریزوں سے لڑ کر اُنھیں نکالنا چاہتے تھے۔ یہ غرض نہ تھی کہ بے وجہ قتل و غارت کا طوفان اٹھا دیں۔

---

[1] ذکاء اللہ صفحہ ۔ یہ بیان درست ہے تو یقیناً اس سے مولانا رحمت اللہ کی بالغ نظری کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسے مقاصد و آداب جہاد سے کوئی مناسبت نہیں۔ دوسرے بعض دوسرے بالغ نظر لوگوں کا احساس بھی یہی تھا لیکن جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا، غالباً ان کی رائے یہ تھی کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھنا مناسب نہ ہوگا اور اصلاح بہرحال سعی و ہمت ہی کی متقاضی ہے۔

ہجرت مولانا نہ مل سکے تو انگریزوں نے انھیں مفرور قرار دیا اور گرفتاری کے لیے گراں قدر انعام کا اعلان کر دیا۔ اب مولانا کے لیے بچ نکلنا اور بھی مشکل ہو گیا۔ بایں ہمہ انھوں نے کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے "مصلح الدین" نام اختیار کیا۔ خدا جانے کن غیر معروف راستوں اور کن بنجر علاقوں میں سے مشقتیں اٹھاتے ہوئے گزرے اور سورت پہنچے۔ وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ چلے گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ستمبر ۱۸۵۸ء میں کیرانہ سے نکلے تھے۔ معلوم نہیں انھیں حجاز پہنچنے میں کتنا وقت لگا۔

جائداد کی ضبطی ادھر حکومت نے جائداد کی ضبطی کا اعلان کر دیا۔ اس بارے میں مخبری کرنے والے شخص کا نام کمال الدین تھا۔ ۲۰۔ جنوری ۱۸۶۲ء کو مولانا کی ضبط شدہ قصباتی جائداد نیلام ہوئی۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ سراے کھجور

۲۔ سراے چوڑھے

۳۔ سراے شیخ فضل الٰہی

۴۔ سراے قصاباں

۵۔ سراے لوہ آباد

۶۔ سراے مایاں

ان کی قیمت لاکھوں روپے تھی لیکن یہ سب ایک ہزار چار سو بیس میں نیلام کر دی گئیں۔ زرعی زمینیں ان کے علاوہ تھیں[1]

مجاہد ڈاکٹر ڈاکٹر وزیر خاں آگرہ سے دہلی پہنچ گئے تھے اور جب تک جنگ

---

[1] "الجمعیۃ" مورخہ ۱۰۔ دسمبر ۱۹۵۶ء

جاری رہی، دہلی ہی میں ٹھہرے رہے۔ حکیم احسن اللہ نے اپنے بیان میں کہا ہے:

ایک فرمان کے ذریعے سے (بہادر شاہ نے) ڈاکٹر وزیر
خاں کو اودھ کا گورنر بنایا تھا۔ لیکن نہ ڈاکٹر صاحب دہلی
سے گئے اور نہ انھوں نے اپنے عہدے کا چارج لیا۔[1]

اگر یہ درست ہے تو مجھے یقین ہے کہ یہ فرمان بالکل ابتدائی دور میں جاری ہوا۔ جب برجیس قدر کی طرف سے سفیر آ گیا اور اودھ نے مرکز دہلی سے باقاعدہ تعلق پیدا کر لیا تو کسی نئے آدمی کو گورنر بنا کر بھیجنے کی ضرورت نہ رہی۔ برجیس قدر ہی کی حکومت پر منظوری کی مُہر لگا دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب دہلی سے نہ گئے۔

بعض بیانات مظہر ہیں کہ ڈاکٹر وزیر خاں آگرہ سے مولوی فیض احمد بدایونی کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے اور وہاں ایک جنگی کونسل بنی ہوئی تھی، جس میں میرزا مغل، میرزا خضر سلطان، میرزا جواں بخت، میرزا عبداللہ، حکیم احسن اللہ خاں، نواب زینت محل، مفتی صدرالدین، مولوی امام بخش صہبائی شامل تھے، ڈاکٹر صاحب کو بھی مجلس شوریٰ میں داخل کر لیا گیا۔ بخت خاں نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہمراہ لے لیا اور مولوی فیض احمد میرزا مغل کے پیش کار مقرر ہوئے۔

میرے نزدیک یہ بیان بوجوہ محل نظر ہے، مثلاً جواں بخت کی عمر اتنی نہ تھی کہ اسے جنگی کونسل میں شامل کیا جاتا۔ مفتی صدرالدین نے کسی کام میں حصّہ لینے سے صاف انکار کر دیا تھا اور وہ خانہ نشین رہے، صرف ایک فتوے پر دستخط کیے تھے اور مجبوراً۔ جیسا کہ انھوں نے بعد میں خود واضح کر دیا۔ زینت محل کو جنگی کونسل میں شامل کرنا سراسر بے معنی تھا۔

---

[1] مقدمہ بہادر شاہ (انگریزی) ص ۲۷۰

مطلب یہ نہیں کہ ڈاکٹر وزیر خاں مشوروں میں شریک نہیں ہوتے تھے یا بخت خاں سے انھیں مخصوص تعلق نہ تھا۔ حاشا وکلا۔ وہ یقیناً مشوروں میں شریک ہوتے ہوں گے اور بخت کے ساتھ تو وہ دہلی سے لکھنؤ گئے تھے۔ اگر دونوں میں گہرا تعلق نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ اکٹھے لکھنؤ جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔

ایک بیان مظہر ہے کہ ڈاکٹر وزیر خاں کو آگرہ کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔

ہجرت

بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر وزیر خاں اس وقت دہلی سے نکلے جب انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی اور جنرل بخت خاں کے ہمراہ لکھنؤ چلے گئے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں کب تک ٹھہرے رہے۔ جب امید کی کوئی بھی کرن باقی نہ رہی تو ہجرت کا مصمم ارادہ کر لیا۔ معلوم نہیں کن کن ذریعوں اور کن کن راستوں سے گئے، ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ مولانا رحمت اللہ کے بعد وہ بھی حجاز پہنچ گئے۔

فنڈر سے ایک اور مناظرہ

پادری فنڈر کو مولانا رحمت اللہ ہندوستان سے بھگا چکے تھے۔ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء) میں وہ قسطنطنیہ پہنچا تو مولانا کو سلطان کے حکم سے مناظرے کے لیے بلایا گیا۔ فنڈر نے وہاں بھی شکست فاش کھائی۔ مولانا قسطنطنیہ سے مکہ معظمہ واپس آ گئے تو مدرسہ صولتیہ کے نام سے ایک دینی درسگاہ قائم کر دی جو خدا کے فضل سے اب تک کامیابی کے ساتھ جاری ہے[1] اور مکہ معظمہ کی مشہور درسگاہ ہے۔ سلطان نے ان کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر مولانا نے اپنے حقیقی بھتیجے مولانا بدرالاسلام کو اپنے پاس بلا لیا اور تعلیم و تربیت دے کر سلطان کے خاص ملازموں میں

---

[1] اخبار "نورالانوار" (۱۷ جنوری ۱۸۷۴ء) سے معلوم ہوا کہ ۱۸۷۳ء میں مدرسہ قائم ہوا اور اس کے لیے ابتداء میں پچاس روپے کی مستقل آمدنی تھی۔ ایک حافظ قرآن مصری، ایک حافظ قرآن ہندوستانی اور دو مدرس مقرر کیے گئے تھے۔ ہندوستان کا چندہ حکیم فرزند علی ملازم سرکار بھوپال کے پاس جمع ہوتا تھا۔

شامل کرادیا۔

مولانا آخری دنوں میں مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے۔ وہیں ۲۴۔ رمضان ۱۳۰۸ھ (۲۔ مئی ۱۸۹۱ء) کو وصال ہوا اور مدینہ منورہ کی خاک پاک کے دامن میں آسودگی پائی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ عمر چوہتر یا پچھتر سال کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب

ڈاکٹر وزیر خاں نے علاج معالجہ شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بدوی سردار کی اہلیہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا تھی۔ ہر معالج سے مایوس ہو کر وہ ڈاکٹر وزیر خاں کے پاس پہنچا۔ ان کے علاج سے خدا نے شفا بخشی تو سردار نے کہا جو خدمت فرمائیں انجام دوں، ڈاکٹر صاحب نے شکریہ ادا کیا اور کہا مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

کچھ مدت کے بعد حکومت برطانیہ نے حکومت ترکیہ سے گفت و شنید کر کے ڈاکٹر صاحب کی حوالگی کا پروانہ حاصل کر لیا۔ جب بدوی سردار کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے شریف مکہ کے پاس پیغام بھیجا کہ ڈاکٹر وزیر خاں میری امان میں ہیں، جب تک میرے قبیلے کے بیس ہزار افراد کٹ نہ جائیں گے، کوئی شخص ڈاکٹر صاحب پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ چنانچہ حکومت ترکیہ نے پروانۂ اجازت منسوخ کر دیا۔ ایک بیان مظہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے شریف کے ایماء سے اس بدوی سردار کی پناہ کا انتظام کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پندرہ سال زندہ رہے۔ ۱۲۹۰ھ یا ۱۸۷۳ء میں بہ مقام مدینہ منورہ وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

ڈاکٹر سیین کا بیان

ڈاکٹر سیین نے ڈاکٹر وزیر خاں کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جو حاکم ینبع کے نام تھا۔ اس میں موصوف نے اپنے متعلق لکھا تھا۔ کہ میں نہ باغی ہوں نہ سرکش۔ خاص حالات میں مجھے اپنی جگہ چھوڑنی پڑی۔[1] ایک اور مقام پر بتایا گیا ہے کہ

---

[1] سیین کی کتاب صفحہ ۱۳۷۵، ۴

ڈاکٹر وزیر خاں شہزادہ فیروز شاہ کا ملازم خاص بن گیا تھا اور شہزادے نے انگریزوں کے سامنے مصالحت کی جو شرطیں پیش کی تھیں، وہ براہ راست نہیں بھیجی تھیں بلکہ ڈاکٹر وزیر خاں ہی کو اس باب میں پروانہ لکھا تھا جس پر ۳۔ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ (۴۔ جون ۱۸۵۹ء) کی تاریخ ثبت تھی۔[1] گویا جون ۱۸۵۹ء تک ڈاکٹر وزیر خاں یقیناً ہندوستان میں تھے۔ جب دیکھا کہ انگریزوں سے صفائی کی کوئی صورت نہیں تو پھر خشکی یا تری کے راستے حجاز مقدس پہنچ گئے۔

---

[1] سین کی کتاب ص ۴۱۱ ؛

بزرگانِ دیوبند

پہلا درجہ

بزرگانِ دیوبند میں سے جن مقدس ہستیوں کو اوّلین درجہ احترام و اعزاز حاصل ہے، وہ حضرت حاجی امداد اللہؒ تھانوی، حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمدؒ گنگوہی ہیں۔ ان کے اسماءِ گرامی اس سرزمین کے آسمان پر اُن درخشاں ستاروں کی طرح روشن ہیں، جو تاریکی کے وقت صحراؤں میں مسافروں اور سمندروں میں ملاحوں کو راستے بتاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگیوں میں علم و ہدایت کے مشعل بردار تھے، جب اس دُنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے پاکیزہ عملی نمونے چھوڑ گئے۔ جو دلوں اور روحوں میں دینِ حقہ کے ولولے پیدا کرتے رہیں گے۔ خصوصاً حضرت مولانا محمد قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کی تو ایک یادگار ——— دارالعلوم دیوبند ——— ایسی ہے جو قریباً ایک صدی سے پاک و ہند کی وسیع سرزمین میں دینی علوم کے قیام و بقا کا ایک بہت بڑا سرچشمہ رہی ہے۔ اس کی آغوش میں سینکڑوں ایسی مقدس ہستیوں نے تربیت پائی جن کے کارنامے دین و سیاست دونوں دائروں میں قابلِ فخر ہیں۔

ان بزرگوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں حصہ لیا تھا، افسوس کہ صحیح تفصیلات آج تک معلوم نہ ہو سکیں اور جن حضرات نے کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی، وہ بعض وقتی مصالح سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ جو کچھ کہا اس سے صورتِ حالات کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔

مولانا عاشق الٰہی کا بیان

مولانا عاشق الٰہی میرٹھی واقعات کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں کہ قاضیوں کے جس خاندان کو تھانہ بھون میں رئیس اعظم کی حیثیت حاصل تھی، اس میں سے قاضی سعادت علی خاں کے پسر قاضی نجابت علی خاں نے دو فرزند تھے، ایک قاضی عنایت علی خاں اور دوسرے قاضی عبدالرحیم خاں۔ بڑے بھائی نے جاگیر کا پورا کام سنبھال لیا تھا، چھوٹا بھائی اطمینان سے ایزانہ زندگی گزار رہا تھا۔ دونوں میں باہم بے حد محبت تھی، گویا ایک دوسرے کے جاں نثار اور عاشق زار تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران میں ایک مرتبہ قاضی عبدالرحیم خاں چند احباب کے ساتھ ہاتھی خریدنے کی غرض سے سہارن پور گیا اور کسی سرائے میں ٹھہر گیا۔ ایک بنیے کو بیچارے عبدالرحیم سے دشمنی تھی۔ اس نے سپنکی[۱] صاحب کے پاس رپورٹ کر دی کہ دیکھیے تھانہ بھون کا رئیس بھی باغی ہو گیا ہے اور اس کا بھائی اس غرض سے ہاتھی خریدنے آیا ہے کہ دہلی بھیجے اور کئی روز سے سرائے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

خون ناحق

یہ افواہ گلی کوچوں میں بھی پھیل گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فکل الحسن انگریزوں نے ایک گارد عبدالرحیم خاں اور اس کے احباب کی گرفتاری کے لیے سرائے میں بھیج دی اور بے گناہوں کو گرفتار کر کے جیل میں پہنچا دیا۔ بغاوت کا مقدمہ چلا اور کوئی خاص ثبوت فراہم کیے بغیر عبدالرحیم خاں اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔[۲]

یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی انگریزی حکومت تھی، جو اس غرض سے سات ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آئی تھی کہ حق و انصاف کی بخشش کا فرض انجام دے گے

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد

---

[۱] SPANKIE صحیح نام ہے۔ یہ ضلع سہارن پور کا سول افسر تھا۔ مولانا عاشق الٰہی نے نے اسے "پنکی" لکھا ہے۔ [۲] تذکرۃ الرشید حصہ اول صفحہ ۷۵

قاضی عنایت علی خاں

قاضی عنایت علی خاں ان حالات سے بالکل بے خبر گھر میں بیٹھا تھا۔ حق ناشناس اور بے گناہ کش انگریزوں نے اُسے اطلاع تک نہ دی، ورنہ وہ بھائی کو موت کی سزا سے محفوظ رکھنے کے لیے تک دوڑ ہی کر لیتا۔ اسے جب اس واقعۂ الیمہ کا علم ہوا تو دنیا نظروں میں تیرہ و تار ہو گئی۔ بھائی کے جوشِ انتقام میں فوراً آدمی فراہم کیے۔ جب معلوم ہوا کہ چند سوار کہاروں کے کندھوں پر کارتوسوں کی بہنگیاں رکھے ہوئے سہارن پور سے کیرانہ کی طرف جا رہے ہیں تو قاضی عنایت علی خاں اپنے جانبازوں کو لے کر شبیر علی کے باغ کے پاس گھات میں جا بیٹھا۔ اچانک سواروں پر حملہ کر کے سب کچھ لوٹ لیا اور انھیں زخمی کر کے بھگا دیا۔ ؎۱

سامان ہاتھ آیا تو جمعیت فراہم کی اور شاملی پر ہلہ بول دیا۔ وہاں خزانہ لوٹا اور بڑی تباہی پھیلائی۔ مولانا عاشق علی فرماتے ہیں کہ:

> حاکم شاملی پہنچا اور چاروں طرف نعشوں اور سب مکانات کی ویرانی و بربادی دیکھ کر غصے سے تھرا اُٹھا۔ آخر یہ کہہ کر "تھانہ بھون بھی اسی طرح مسمار کرا کر چھوڑوں گا" مظفر نگر واپس چلا گیا۔

نظم و نسق

جب تسخیر دہلی کی افواہ پھیلی تو قاضی صاحب کو حفاظت کا خیال آیا، یہاں تک کہ تھانہ میں خبر گرم ہوئی، انگریزی فوج پہنچ رہی ہے۔ قاضی صاحب تھانہ بھون سے رخصت ہو کر نجیب آباد کی طرف چلے گئے۔ وہاں سے خدا جانے کہاں گئے اور کیا ہوئے؟ کچھ پتہ نہ چلا۔ گویا ایک بھائی کو انگریزوں نے پھانسی پر لٹکا دیا، دوسرے نے اس کے انتقام

؎۱ تعجب ہے۔ بعض اصحابِ علم نے اس واقعے کو قاضی عنایت علی خاں کے بجائے مولانا رشید احمد مرحوم سے منسوب کر دیا۔ حالانکہ مولانا مرحوم کو اس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسی طرح شاملی پر ہلہ بھی قاضی عنایت علی خاں نے بولا تھا نہ کہ مولانا نے۔

کی پریشانی میں گھر بار اور زندگی تباہ کر ڈالی۔

مولانا عاشق الٰہی فرماتے ہیں کہ اس بدامنی کے زمانے میں لوگ حضرت حاجی امداد اللہ مرحوم و مغفور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کسی حاکم کی سرپرستی کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔ آپ ہمارے دینی سردار ہیں، دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر پر رکھیں۔ چنانچہ حضرت کو ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ چونکہ حکومت کے فیصلوں اور شرعی قضا میں مولویوں کی ضرورت تھی، اس لیے مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم بھی تھانہ بھون ہی میں حضرت حاجی صاحب کے پاس ٹھہر گئے۔ [1]

ایک واقعہ مولانا عاشق علی کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب، مولانا رشید احمد، مولانا محمد قاسم اور حافظ ضامن کا ایک مقابلہ بندوقچیوں سے ہو گیا:

> یہ نبرد آزما جتھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتا پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے، وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے۔ گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔ [2]

---

[1] تذکرۃ الرشید حصہ اول ص ۷۴، [2] ایضاً ص ۷۵،

• مبادا "سرکار کے باغیوں" کے الفاظ سے غلط فہمی پیدا ہو۔ یہاں "سرکار" سے مراد خود حضرت حاجی صاحب ہیں اور مقابلہ ان لوگوں سے تھا جو انگریزوں کے طرفدار ہو کر آئے تھے۔ لیکن "سرکار" کا لفظ ایسے طریق پر استعمال کیا کہ بظاہر اس سے حکومت مراد لی جاسکتی ہے۔ کتاب "تذکرۃ الرشید" ایسے زمانے اور ایسے حالات میں مرتب ہوئی تھی جب انگریزوں کا اقتدار اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا اور نازک واقعات کی ترتیب میں رموز طریق و اسلوب سے کام لیے بغیر چارہ نہ تھا۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ میری رائے اور میرا تاثر ہے اور میں اسے قطعی طور پر صحیح سمجھتا ہوں، نہیں کہہ سکتا کہ مصنف مرحوم کے پیش نظر کیا بات تھی؟

حافظ محمد ضامن

حافظ محمد ضامن، جو میرے اندازے کے مطابق انگریزی لشکر کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے تھانہ جون کے باشندے اور حضرت حاجی صاحب کے خواجہ تاش یا پیر بھائی تھے یعنی دونوں بزرگ حضرت میاں جی نور محمدؒ جھنجھانوی کے مُرید تھے۔ حافظ صاحب کے کمالات کا اندازہ بعض روایات سے ہو سکتا ہے، مثلاً:

۱۔ جب کوئی شخص ان کے پاس آتا تو فرماتے، بھائی اگر مسئلہ پوچھنا ہے تو مولوی شیخ محمد کی طرف اشارہ کر کے کہتے) مولوی صاحب سے پوچھ لے، اگر تجھے مرید ہونا ہے تو وہ بیٹھے ہیں حاجی صاحب، ان سے مرید ہو جا۔ اگر حقہ پینا ہے تو یاروں کے پاس بیٹھا رہ[1]

۲۔ اپنے مرشد طریقت حضرت میاں جیؒ صاحب کے ہمراہ ان کا جوتا بغل میں لے کر اور توبرہ گردن میں ڈال کر جھنجھانہ جاتے۔ حافظ صاحب کے صاحبزادے کی سسرال وہیں تھی۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اس حالت میں جانا مناسب نہیں۔ ہو سکتا ہے سمدھیانے کے لوگ حقیر سمجھ کر رشتہ توڑ ڈالیں۔ حافظ صاحب نے

---

[1] ارواح ثلاثہ صفحہ ۱۵۹، ۶

فرمایا: رشتے کی پروا نہیں، لیکن میں جس طرح صحیح جانتا ہوں، اسے اپنی سعادت سمجھتا ہوں، اپنی سعادت ہرگز نہ چھوڑوں گا۔[1]

میلی سن کا پیش کردہ نقشہ

اب آپ میلی سن کا پیش کردہ نقشہ سامنے رکھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ شاملی کے ایک ہندو زمیندار مہاسنگھ نے ہنگامہ بپا کیا تھا اور دربار دہلی سے تعلقات مکاتبت پیدا کر لیے تھے۔ انگریز اُسے دبا سکتے تھے، البتہ شاملی کو کھلم کھلا بغاوت سے محفوظ رکھا۔ پھر سپنکی صاحب نے گورکھوں کا ایک جیش بھیج دیا اور ایڈورڈز نے اس کمک سے فائدہ اٹھا کر شاملی پر قبضہ کر لیا۔ اس پر قناعت نہ کی بلکہ اپنے ایک وفادار مسلمان ماتحت ابراہیم خاں کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ شاملی میں چھوڑا اور ایڈورڈز خود بڑھتا چلا گیا۔ یہ ۱۲۔ ستمبر کا واقعہ ہے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قاضی عنایت علی خاں نے اپنے جانباز جوان ساتھ لیے اور شاملی پر یلغار بول دیا۔ ابراہیم خاں نے مقابلہ کیا۔ لیکن آخر وہ ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہو گیا۔ میلی سن لکھتا ہے کہ ابراہیم خاں کے ساتھ عہد ہوا تھا کہ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی عزت و جان کو کوئی گزند نہ پہنچے گا، لیکن حوالگی کے بعد ایک سو سترہ آدمیوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔[2]

بعد کے حالات

ایڈورڈز لوٹا تو اُسے بڑا غصہ آیا، لیکن مظفر نگر سے تشویشناک خبریں ملیں تو اُدھر چلا گیا۔ بعد ازاں ایک جیش تھانہ بھون بھیجا گیا جو سکھوں اور گورکھوں پر مشتمل تھا۔ کپتان سمتھ اور لفٹنٹ کیولر اس کے کماندار تھے۔ چونکہ اس جیش کی تعداد کم تھی، اس لیے مجاہدین نے اُسے مار بھگایا۔ مزید چند روز گزر گئے تو ڈنلاپ آیا۔ تھانہ بھون پر قبضے کے بعد وہ شاملی پہنچا اور وہاں بھی انگریزی حکومت بحال کر دی۔

---

[1] ارواح ثلاثہ صفحہ ۱۵۹، [2] جلد ششم صفحہ ۱۲۴۔

میرا اندازہ ہے کہ حافظ محمد ضامن کپتان سمتھ اور لفٹنٹ کیولر کے مقابلے میں شہید ہوئے۔ جس افسر کے متعلق کہا گیا ہے کہ اسے شاملی کی ویرانی دیکھ کر غصہ آیا، وہ ایڈورڈ ونڈق۔ ڈنلاپ کے حملے کے بعد سب کو منتشر ہونا پڑا۔

حاجی صاحب اور مولانا قاسم

انگریزی حکومت کی بحالی کے بعد حضرت حاجی صاحب نے چند مہینے انبالہ، نگری، پنجلاسہ وغیرہ مواضعات وقصبات میں چھپ چھپا کر گزارے، پھر سندھ اور کراچی کے راستے عرب تشریف لے گئے۔ روانگی سے پیشتر گنگوہ بھی پہنچے تھے تاکہ مولانا رشید احمد سے ملاقات کرلیں اور وہاں راؤ عبداللہ خاں رئیس کے اصطبل میں قیام کیا تھا۔ مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد باقی عمر مبارک وہیں گزار دی۔ مولانا محمد قاسم کے بھی وارنٹ جاری ہوئے تھے، وہ کچھ مدت گرفتار نہ ہوئے، پھر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

مولانا رشید احمد

مولانا رشید احمد تھوڑی دیر چھپے رہے۔ گنگوہ میں پولیس پہنچی تو مولانا کے چچیرے بھائی مولوی ابوالنصر کو گرفتار کرلیا اور یہ سمجھ کر بہت تکلیفیں دیں کہ یہی مولانا رشید احمد ہیں۔ جب غلط فہمی آشکارا ہوئی تو ایک اور مخبر کی اطلاع پر پولیس رام پور گئی اور وہاں سے مولانا کو گرفتار کرکے سہارن پور لے گئی۔ یہ ۱۲۷۵ھ کے اواخر یا ۱۲۷۶ھ کے اوائل کا واقعہ ہے، یعنی وسط ۱۸۵۹ء کا۔ مولانا کی اہلیہ نے یہ زمانہ بے مثال صبر سے گزارا۔ اُن کے والد مولوی محمد تقیؒ، کچھ ہی دن پیشتر نواب جھجر کی ملازمت میں شہید ہو چکے تھے۔ پھر یکایک یہ مصیبت نازل ہو گئی۔

مقدمہ

مولانا نے تین چار دن کال کوٹھڑی میں گزارے اور پندرہ دن حوالات میں رہے۔ مقدمہ پیش ہوا تو حکم ہوگیا کہ انھیں مظفر نگر لے جانا چاہیے۔ قریباً چھ ماہ بعد انھیں رہائی ملی۔

میلی سن لکھتا ہے کہ تھانہ بھون کے واقعے کے بعد جو گرفتاریاں ہوئیں اُن کے متعلق

پہلے ہی سے حکم دیا تھا کہ تمام مقدمے سول افسروں کے سامنے پیش ہوں اور سزا صرف انھیں لوگوں کو دی جائے جن کے خلاف ارتکاب جرم قطعی طور پر ثابت ہوجائے۔ مولانا کے خلاف ایسے اثبات کا کوئی بھی امکان نہ تھا۔ لہٰذا وہ سزا سے محفوظ رہے۔

"تذکرۃ الرشید" میں تین مخبروں کا ذکر جا بجا آیا ہے۔ جنھوں نے مولانا کے متعلق مخبری کی، یعنی قاضی محبوب علی خاں تھانوی، غلام علی ساکن قصبہ ملی پور اور حکیم احمد بخش رام پوری۔

نواب علی بہادر اور نواب تفضّل حسین

باندہ

باندہ صوبہ جنوب و شمال کے الٰہ آباد ڈویژن کا ایک ضلع ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً تین ہزار مربع میل اور آبادی ۱۸۵۱ء میں چھ لاکھ تھی۔ اس کی شمالی اور شمالی و مغربی سرحد دریائے جمنا پر واقع تھی۔ مغرب میں ضلع ہمیر پور اور جنوب اور جنوب و مشرق میں پنا، چرکھاری اور ریواں کی ریاستیں تھیں۔ باندہ، کیروی اور راجا پور اس ضلع کے بڑے بڑے قصبے تھے۔ سرزمین پاک و ہند کے چند مشہور قلعوں میں ایک کالنجر بھی تھا جس کے لیے زبردست لڑائیاں ہوتی رہیں۔ سلطان محمود غزنوی نے یہاں جنگ کی تھی، شیر شاہ سوری نے بھی یہ قلعہ فتح کر لیا تھا لیکن اس کے سامنے وہ گولوں میں آگ لگ جانے سے جل جانے کے باعث فوت ہوا۔ کالنجر باندہ ہی میں تھا۔

نوابانِ باندہ

چھتر سال بندیلہ کے خاندان کی ایک لڑکی کسی لڑائی میں محمد خاں بنگش کے ہاتھ قید ہوئی۔ باجی راؤ پیشوا نے قیدی رہا کر دیئے تو چھتر سال نے لڑکی کو واپس لینے میں پس و پیش کی، اس لیے کہ وہ مسلمانوں کی قید میں رہ چکی تھی نیز وہ مسلمان ہو چکی تھی۔ باجی راؤ نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا اور اس سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جس کا نام شمشیر بہادر تھا۔ باجی راؤ کی وفات کے بعد مرہٹوں نے اسے پیشوا کے خاندان کا فرد قرار دینے سے انکار کر دیا، البتہ بندھیل کھنڈ کا علاقہ جاگیر میں دے دیا۔ شمشیر بہادر نے کھلم کھلا اسلام کا اعلان کر دیا۔ پانی پت کی لڑائی میں وہ مرہٹوں کی طرف سے لڑا تھا۔ سخت زخمی ہوا اور بھرت پور

پہنچ کر وفات پائی۔

اس کے بیٹے علی بہادر اوّل نے سندھیا کی امداد سے بندھیل کھنڈ کے کئی علاقے فتح کیے۔ ماہی مراتب کا اعزاز حاصل کیا، دہلی میں وفات پائی اور قطب صاحب میں اسے دفن کیا گیا۔ علی بہادر کے فرزند ذوالفقار بہادر نے ۱۸۱۲ء میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے نواب کا خطاب اور باندہ کی جاگیر حاصل کی۔ یہ ذوالفقار بہادر میرزا غالب کی ممانی کی ہمشیرہ کے بطن سے تھا۔ چنانچہ میرزا انورالدولہ شفق کو لکھتے ہیں:

> میرا ایک بھائی، ماموں کا بیٹا، نواب ذوالفقار بہادر کی حقیقی خالہ کا بیٹا ہوتا تھا اور مسند نشین حال (علی بہادر) کا چچا تھا اور وہ میرا ہم شیر بھی تھا یعنی میں نے اپنی ممانی اور اس نے اپنی پھوپھی (والدۂ غالب) کا دودھ پیا تھا۔[1]

نواب بہادر علی ثانی

نواب علی بہادر ثانی انہی ذوالفقار بہادر کا صاحبزادہ تھا۔ ۱۲۶۵ھ (۱۸۴۹ء) میں مسند نشین ہوا۔ منیر شکوہ آبادی نے جلوس کی تاریخ کہی:

علی بہادر عالم پناہ بندہ نواز — نہاد چوں بہ سرِ خویش افسرِ شوکت
منیر مصرعِ تاریخ ایں عمل گفتہ — جلوس باد مبارک بمسند نصرت
۱۲۶۵ھ

جلوس کے بعد گورنر کی طرف سے خلعت آیا تو منیر فرماتے ہیں:

---

[1] خطوط غالب مرتبہ مصنف ص ۲۵۔ میرزا غالب کے فارسی کلیات میں قطعہ ۲۵ بھی انہی ذوالفقار بہادر کی مدح میں ہے:

نواب ذوالفقار بہادر کہ بودہ است — یادِ تو در مصاف فلک ذوالفقار من
دانی کہ در فراق تو از رشک مہر و مہ — روزم سیہ تر است ز شبہائے تار من

کہی برجستہ میں نے یہ تاریخ
آج آیا ہے خلعت اقبال

۱۲۶۵ھ

یہی علی بہادر تھے جن کے لیے میرزا غالب نے ایک غزل کے مقطع میں کہا تھا:

غالب ندا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

۱۸۵۷ء باندہ میں اس وقت ہنگامہ بپا ہوا جب فتح پور سے مجاہدینِ آزادی وہاں پہنچے۔ یہ ۸۔ جون ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے، لیکن جلد ہی ہنگامہ فرو کر دیا گیا۔

جو سپاہی باندہ میں مقیم تھے، وہ کان پور کی رجمنٹوں سے متعلق تھے۔ وہاں ہنگامہ بپا ہونے کی خبریں ۱۴۔ جون کو باندہ پہنچیں تو سراسیمگی پیدا ہوئی۔ نواب کی امداد سے ان سپاہیوں کو ہتھیار رکھ دینے کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن کامیاب نہ ہو سکی، البتہ نواب نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر انگریز عورتوں اور بچوں کی جانیں بچا لیں اور انھیں اپنے محل میں محفوظ رکھا۔

سپاہیوں نے بنگلوں کو لوٹا، خزانے پر قبضہ کیا، سازو سامان جنگ ساتھ لیا اور کان پور روانہ ہو گئے۔ نواب نے نظم حکومت قائم کرنے کی انتہائی کوششیں کیں، لیکن معاملات قابو سے باہر نکل چکے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے جگہ جگہ دوعملی کی صورت قائم کر رکھی تھی۔ کچھ اختیارات خود سنبھال رکھے تھے، کچھ مقامی روساء کو دے دیے تھے۔ اس دوعملی کے اثرات کو افراتفری میں دور کرنا آسان نہ تھا۔

نواب کی کوششیں مارچ ۱۸۵۸ء میں انگریزی فوج باندہ پہنچی تو نواب کے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ کالپی چلا جائے، جہاں راؤ صاحب رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپے موجود تھے۔ چنانچہ اس نے کالپی کی جنگ میں حصّہ لیا۔ وہاں شکست کھائی تو اپنے رفیقوں کے ساتھ گوالیار کا رُخ کر لیا۔ فارسٹ نے لکھا ہے کہ گوالیار سے

پندرہ میل کے فاصلے پر ان لوگوں نے آیندہ طرزِ عمل کے متعلق مشورہ کیا۔ رانی کی تجویز تھی کہ جھانسی کے قلعہ کو واپس لے لیا جائے۔ تانتیا ٹوپے کی رائے تھی کہ ہمارے لیے بندیل کھنڈ بہتر ہے۔ نواب راؤ صاحب نے کہا کہ بندیل کھنڈ میں نہ ہمیں ضرورت کے مطابق سامان رسد مل سکے گا اور نہ بندیلے ہمارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں گے۔ بہتر یہ ہے کہ دکن چلیں، جہاں سب لوگ ہمارے ساتھ مل جائیں گے۔ تاہم اس سے پیشتر ہمیں گوالیار جانا چاہیے۔ وہاں کی فوج کو ساتھ لے کر بیدری کے راستے آگے بڑھنا مناسب ہوگا۔ سندھیا اور رانی بیجا بائی ہمارے ساتھ ہو جائیں گے اور تمام مالکانِ ریاست انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔[1]

آخری دور

بہر حال نواب علی بہادر گوالیار کی جنگ میں موجود تھا۔ پھر تانتیا ٹوپے کے ساتھ وسط ہند میں چلا گیا۔ ملکہ وکٹوریا کا اعلان عفو عام ہوا تو نواب علی بہادر نے نومبر ۱۸۵۸ء میں اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

اس امر سے بحث نہیں کہ نواب کے دلی افکار و خیالات کیا تھے، تاہم اس نے شخصی کسی انگریز کو قتل نہ کیا تھا بلکہ ایک ایک کی جان بچائی تھی۔ میلی سن لکھتا ہے کہ اس نے ۱۴۔ جون کے ہنگامے میں افسروں کی جانیں بچائیں۔ ہمیر پور اور فتح پور سے جو انگریز بچ کر آئے تھے، انھیں بھی اپنی حفاظت میں لے لیا۔

> اس کی ایمانداری اور حفاظت حتی الامکان ہر اس یورپی پناہ گیر کے لیے وقف رہی جو اس کے پاس پہنچتا رہا۔ جب فوج کی سرکشی نے اس کے لیے مزید حفاظت کی گنجایش نہ چھوڑی تو اس نے مہمانوں کو اس علاقے میں صحیح سلامت پہنچا دیا، جو

---

[1] فارسٹ جلد سوم صفحہ ۱۵۶ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے میلی سن نے بڑی تفصیل سے بتایا ہے، گوالیار پر قبضے کی تجویز رانی نے پیش کی تھی اور یہی بہترین تجویز تھی۔

اس وقت انگریزوں کے قبضے میں تھا۔[1]

اس عدور جہ شریفانہ اور وضعدارانہ طرز عمل کے باوجود نواب سے ریاست چھین لی گئی اور اُسے اندور میں نظر بند کر دیا گیا۔ صرف تین سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔[2] ۱۸۷۲ء میں اسے بمبئی بلایا گیا اور دربار میں جگہ دی گئی۔

وفات

۱۲۹۰ھ (۱۸۷۳ء) میں بمقام اندور ہی اس نے وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ منیرؔ نے تاریخ وفات کہی جو نواب کی سیرت کا بھی ایک جامع مرقع ہے؛

نواب علی بہادر، اے بحرِ کرم — یوسف طلعت، شجاع یکتا ہے ہے
اے قدر شناس و ناز بردارِ منیرؔ — اے اہلِ سخن کے عزت افزا، ہے ہے
اے صدر نشینِ خلق و اقبال و شکوہ — اے بزم کرم کے مسند آرا، ہے ہے
اُٹھ جائے جواں جو تو زمانے سے لگے — صد حیف، افسوس، وادریغا، ہے ہے

تاریخ تری یہ رو کے کہتا ہے منیرؔ
فیاض زماں، امیر زیبا، ہے ہے[3]

۱۲۹۰ھ

فیاضی و دوست نوازی

یقیناً علی بہادر بڑا ہی فیاض اور دوست نواز تھا۔ اندور میں اگرچہ صرف تین سو روپے وظیفہ ملتا تھا، لیکن دوستوں کو تحائف بھیجتا رہتا تھا۔ مثلاً ۱۸۶۶ء میں بیگم نے جس کا لقب افتخار محل تھا، زمرد کی انگوٹھی منیرؔ کو بھیجی اور خود نواب نے سفید دوشالہ ارسال کیا۔ اس نے دونوں کی تاریخ الگ کہی:

نواب افتخار محل کے حضور سے — تحویہ التفات و عنایات آئی آج

---

[1] سیلی سن جلد سوم ص ۱۳۱۔ [2] ڈاکٹر حسین نے وظیفے کی مقدار چار سو بتائی ہے (ص ۲۷۵)۔ [3] کلیات منیرؔ ص ۵۳۵

بھیجی انگوٹھی ڈاک میں اندور سے یہاں — صد شکر شانِ لطف کریمی دکھائی آج

تاریخ اس عطیے کی میں نے کہی منیرؔ
انگشترِ زمردِ پاکیزہ آئی آج!

۱۲۸۳ھ

دوشالہ کی تاریخ یہ ہے:

بھیجا علی بہادرِ مسکیں نواز نے — اندور سے جو میرے لیے تحفۂ شریف
ممکن نہیں کہ شکرِ عنایات کر سکوں — جز وِ ضعیف میں ہوں یہ شے نادر و لطیف

تاریخ اس عطیے کی میں نے کہی منیرؔ
باریک ہے سفید دوشالہ بہت لطیف

۱۲۸۳ھ

فرخ آباد

صوبہ غرب و شمال کے آگرہ ڈویژن کے ایک ضلعے کا نام فرخ آباد ہے، صدر مقام کا نام بھی یہی ہے۔ یہ دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے۔ چند میل پر فتح گڑھ میں انگریزی فوج رہتی تھی۔

فرخ آباد کی ریاست محمد خاں بنگش نے فرخ سیر کے عہد میں قائم کی تھی، جس کا خطاب غضنفر جنگ تھا۔ ریاست ۱۸۰۲ء سے کمپنی کے حوالے ہو چکی تھی۔ مسند نشین کو ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے بطور وظیفہ ملتے تھے۔ مگر نوابوں کا ٹھاٹھ ایسا تھا کہ بادشاہ معلوم ہوتے تھے۔

اس خاندان کے رئیسوں میں سے نواب تجمل حسین کا نام اس وجہ سے زیادہ مشہور ہے کہ میرزا غالب نے ایک غزل کے آخر میں اس کی مدح کے اشعار شامل کر دیے تھے:

دیا ہے اور کو بھی تا اسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

---

[1] کلیاتِ منیر ص۵۰۸

نصیر الدولہ، معین الملک اور ظفر جنگ اس کے خطابات تھے۔ ۱۰ نومبر ۱۸۲۶ء کو وفات پائی۔

تفضل حسین خاں

نواب تفضل حسین خاں، نواب تجمل حسین خاں کا بھتیجا اور نصرت جنگ کا بیٹا تھا۔ سلسلہ نسب یہ تھا: تفضل حسین خاں بن عنایت حسین خاں نصرت جنگ، بن خادم حسین خاں شوکت جنگ، بن امداد حسین خاں ناصر جنگ، بن دلیر ہمت خاں مظفر جنگ، بن احمد خاں غالب جنگ، بن امام خاں، بن قائم خاں، بن محمد خاں بنگش غضنفر جنگ بانی ریاست فرخ آباد۔ چونکہ تجمل حسین خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی، اس سبب سے تفضل حسین خاں کو ریاست کا والی تسلیم کیا گیا۔ ۵۔ ربیع الثانی ۱۲۴۳ھ (۲۶۔ اکتوبر ۱۸۲۷ء) کو ولادت ہوئی۔ تفضل حسین خاں کی آغوش میں پرورش پائی۔ ۴۔ دسمبر ۱۸۴۶ء کو مسند نشین ہوئے جب قریباً انیس سال کی عمر تھی۔ ۱۸۴۶ء کو مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی۔

مولانا ابو الکلام آزاد کے والد ماجد مولانا خیر الدین فرماتے تھے، تفضل حسین خاں اتنا شوقین اور خوش پوشاک رئیس تھا کہ کشمیر کے تاجر سب سے پہلے اسی کے پاس جاتے۔ پھر لکھنؤ کا رخ کرتے۔ یہ نواب تھا جس کے لیے ۱۸۵۷ء میں جہاد آزادی کو تقویت پہنچانے کا کام مقدر ہو چکا تھا۔

۱۸۵۷ء

۱۰ رجمنٹ نے فتح گڑھ میں سرکشی اختیار کی اور نواب کو اپنا رئیس بنا لیا۔[۱] آغا حسین سیتاپور سے ڈیڑھ ہزار فوج لے کر آیا۔ احمد یار خاں اور محسن علی خاں مجاہدین فرخ آباد کے رئیس تھے۔ میلسن نے دسمبر ۱۸۵۷ء کی ایک لڑائی کا ذکر کیا ہے جس میں فرخ آباد کے بشتی کمانڈر "حکیم" صاحب کا ذکر بطور خاص کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "حکیم" پٹیالی میں شہید ہوا۔ اس کے ساتھی تفرقی ہو دے اور انگریز نے قبضہ کر لیا گیا۔[۲] اگست ۱۸۵۸ء میں نواب کے

---

[۱] مشاہیر جنگ آزادی ص ۲۲۵، [۲] میلسن جلد چہارم ص ۲۰۵، ۶

پاس لشکر فراہم ہوا وہ تین ہزار کے لگ بھگ تھا۔[1]

مفتی انتظام اللہ نے لکھا ہے کہ غداروں نے ہر جگہ دھوکے دیئے اور پانسا الٹا پڑا۔[2]
نواب نے انجام کار اپنے آپ کو جاں بخشی کے وعدے پر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

میلی سن کہتا ہے:

> حکومت اپنے ایک افسر کے حتمی وعدے سے پھر نہ سکتی
> تھی۔ اگرچہ نواب کو زندگی کی مہلت مل گئی، لیکن وہ اپنے
> تمام منصوبوں کی کامل تباہی دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔[3]

وہ منصوبے کیا تھے؟ انگریزوں کا اخراج۔ یہ منصوبہ ۱۸۵۸ء میں بے شک پورا نہ ہوا، لیکن نواب کی عظمت سعی و کوشش میں تھی نہ کہ منصوبے کی تکمیل میں اور میلی سن زندہ ہوتا تو ہم بتاتے کہ انگریز نہ صرف ہندوستان سے نکلے بلکہ جس عظمت پر وہ فخر کر رہے تھے، اس کا پرچم قریباً ہر جگہ سرنگوں ہوا۔

فارسٹ کا بیان ہے کہ کالن کیمپل نے اودھ کی مہم ختم کی تو حضرت محل اور نانا نیپال چلے گئے۔ جن لوگوں نے جاں بخشی کے وعدے پر اپنے آپ کو حوالے کیا، ان میں سے ایک مہدی حسین تھا اور دوسرا تفضل حسین خاں والی فرخ آباد۔ یہ یکم جنوری ۱۸۵۹ء کا واقعہ ہے۔[4] نواب پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ چونکہ جاں بخشی کا وعدہ ہو چکا تھا، اس لیے پھانسی نہیں دی جا سکتی تھی۔ ہندوستان میں آزاد چھوڑنا بھی خارج از بحث تھا۔ کہا جاتا ہے کہ نواب نے پھانسی کی سزا کے

---

[1] میلی سن جلد سوم ص ۲۳۴۔ [2] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۹۵۔ [3] جلد سوم ص ۲۳۱۔
[4] فارسٹ جلد سوم ص ۵۴۳۔ مہدی حسین اودھ کا چکلہ دار تھا۔ اس کے لیے دو سو روپے پنشن منظور ہوئی۔ البتہ یہ حکم دے دیا گیا کہ اپنے پرانے وطن فیض آباد میں نہ رہے اور جہاں چاہے مقیم ہو جائے۔

خلاف وائسرائے کے ہاں اپیل کی تھی، اس پر حکم ہوا کہ نواب مقبوضات برطانیہ سے باہر کسی ملک میں جا بسے۔

چنانچہ نواب سے پوچھا گیا کہ جہاں جانا چاہو، بھیج دیا جائے گا۔ اس نے مکہ معظمہ کو منتخب کیا۔ اس طرح وہ حجاز چلا گیا۔

جلا وطنی کی زندگی مولانا ابوالکلام کے والد ماجد مکہ معظمہ پہنچے تو دیکھا، جس نواب کی خوش پوشاکی کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا، اس کا یہ حال تھا کہ چھینٹ کا ایک میلا کچیلا انگرکھا جسم پر تھا۔ یہ دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، فرماتے ہیں :

> میں نے ہر چند کوشش کی کہ نواب کی ضروریات کا انتظام کر دوں، مگر انھوں نے قبول نہ کیا۔ وہ کہتے تھے، میں آپ کے خاندان سے ارادت رکھتا ہوں۔ میری جگہ نذر پیش کرنے کی ہے، نہ کہ لینے کی۔

مولانا کے والد نے نواب کی ملاقات شریف مکہ سے بھی کرا دی۔ بے نوائی کی حالت میں بھی اس نے گوارا نہ کیا کہ تحفے کے بغیر ملے۔ ایک قیمتی تسبیح اس کے پاس رہ گئی تھی، وہی تحفے میں پیش کر دی۔[1]

نواب صدیق حسن مرحوم (وار جاہ امیر الملک) شعبان ۱۲۸۵ھ (دسمبر ۱۸۶۸ء) میں حج کے لیے گئے تھے، انھوں نے بھی قیام مکہ معظمہ کے دوران میں نواب تفضل حسین خاں سے ملاقات کی تھی۔ والا جاہ نواب تفضل حسین خاں کا دورِ عروج خود دیکھ چکے تھے، اس لیے مکہ معظمہ کی زندگی میں نواب شکستہ حالی اور فقر و تہی دستی سے سخت متاثر ہوئے۔ چنانچہ ریاست

---

[1] مصنف کی کتاب "غالب" کے مختلف مطالب کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کے افادات، جو اب مصنف کی کتاب "نقشِ آزاد" میں شامل ہو کر چھپ چکے ہیں۔

کی طرف سے جو اعلیٰ طبوعات تقسیم کے لیے گئے تھے، ان میں سے ایک بیش قیمت لباس بہ کمال اصرار نواب کی نذر کیا۔[1]

پھر شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال نے نواب کے لیے ایک رقم مقرر کر دی۔ میرا خیال ہے کہ یہ انتظام نواب صدیق حسن خاں ہی کی تحریک پر ہوا۔ معمول یہ تھا کہ نواب ظہر کے اوّل وقت حرم شریف میں آتا اور عشا پڑھ کر گھر جاتا۔

۱۸۸۴ء میں وفات پائی اور مکّہ کی خاک مقدس میں آسودۂ خواب ابدی ہے۔

نواب سخاوت حسین

معاملہ نواب تفضل حسین پر ختم نہ ہوا بلکہ ان کے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں کو بھی ۱۸۵۷ء ہی کے واقعات کی پاداش میں انگریزوں نے پھانسی کی سزا دی۔ منیر شکوہ آبادی نے اس حادثۂ الیمہ کی تاریخ کہی:

ریاضِ خُلق، سخاوت حسین خاں نواب　　　نہالِ باغِ کرم، زیبِ مسندِ شوکت

جوانِ قابل و فرزندِ خاصِ نصرت جنگ　　　غلامِ آلِ نبیؐ، سرورِ تمسّرِ طلعت،

سخاوت اور مروت میں بے نظیرِ جہاں　　　ریاست اور امارت کے واسطے زینت

ہر ایک دل میں جگہ اس کی، جان سے بڑھ کر　　　ہر اک زبان پہ اس کا وظیفۂ مدحت

زمانہ اس کی مروت پہ اس طرح شیدا　　　مشامِ روح ہو جیسے طرح عاشقِ نکہت

وہ بے گناہ ہوا تیغِ مرگ سے مقتول　　　عنایت اس کو کیا حق نے گلشنِ جنّت

منیرؔ نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ
ہوا شہید امیرِ دلیرِ باہمت

---

[1] "مآثرِ صدیقی" یعنی نواب صدیق حسن مرحوم کے سوانح جو ان کے صاحبزادے نواب علی حسن خاں نے مرتب فرمائے: حصہ دوم صفحہ ۷۸، ۷۹۔ نواب علی حسن خاں نے خدا جانے کس وجہ سے اس واقعے کو نواب تجمل حسین خاں سے منسوب کر دیا۔ حالانکہ وہ ۱۸۶۲ء میں وفات پا چکے تھے۔ یہ واقعہ نواب تفضل حسین خاں کا تھا۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۶۸ پر)

دو اور مظلوم[۲]

فرخ آباد کے دو اور رئیسوں کو بھی اسی سلسلے میں انگریزوں کے حکم سے پھانسی دی گئی، یعنی نواب اقبال مند خاں بہادر اور نواب غضنفر حسین خاں بہادر۔

ان کا علم بھی منیر[۳] کے قطعہ تاریخ سے ہوا۔ فرماتے ہیں:

اقبال مند خان و غضنفر حسین خاں دونوں دُرِ محیطِ عطا، آہ، آہ، ہائے
دونوں جوانِ نیک، امیرانِ با حشم مقتولِ تیغِ تیزِ قضا، آہ، آہ، ہائے
تاریخ ان کے قتل کی کافی ہے یہ منیرؔ
دونوں شہیدِ راہِ خدا، آہ، آہ، ہائے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۶) "مشاہیر جنگ آزادی" کے فاضل مؤلف نے معلوم نہیں کیوں اس واقعہ میں بے اصل مبالغہ ضروری تصور فرمایا یعنی لکھا کہ نواب صدیق حسن خاں مکہ معظمہ پہنچے تو نواب تفضل حسین خاں بھی فقرا کی صف میں کھڑے ہوئے تھے اور مثل گداگروں کے متمنی امداد تھے۔ نواب صدیق حسن یہ حال دیکھ کر رو پڑے۔ تفضل حسین کو اپنی قیام گاہ پر لے گئے اور ایک نیا جوڑا تیار کر دیا۔ (ص ۲۳)

مآثر صدیقی میں کہیں یہ تفصیل مرقوم نہیں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ نواب صدیق حسن خاں خود ان سے جا کر ملے اور ایک بیش قیمت پوشاک بہ کمال اصرار ان کی نذر کی۔ بلاشبہ تفضل حسین خاں شکستہ حال و قلاش تھے، لیکن ان کی غیرت کبھی گوارا نہ کر سکتی تھی کہ فقیروں کی صف میں کھڑے ہو کر متمنی امداد ہوں۔

۲ کلیاتِ منیر ص ۲۹۱ ، ۳ کلیات منیر ص ۲۹۱

خان بہادر خاں

ابتدائی حالات

خان بہادر خاں ابن ذوالفقار خاں ابن حافظ الملک حافظ رحمت خاں، کی تاریخ پیدائش ۱۲۰۵ھ بتائی جاتی ہے یعنی ۱۷۹۰-۹۱ء۔ اگرچہ خاندانی ریاست مٹ چکی تھی، تاہم امیری کے آثار باقی تھے۔ انھیں کی آغوش میں تربیت ہوئی، وقت کے رواج کے مطابق تعلیم پائی اور بریلی میں صدر الصدور کے عہدے پر مامور رہے۔ ملازمت کی مدت پوری کرکے پنشن لی۔ ۱۸۵۷ء میں ان کی عمر تقریباً سرسٹھ سال کی ہو چکی تھی۔

۱۸۵۷ء میرٹھ میں سپاہ کی سرکشی کا حال معلوم ہوتے ہی مختلف مقامات پر ہنگامے کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ چنانچہ ۳۱۔مئی ۱۸۵۷ء کو بریلی سے سلسلہ شروع ہوا۔ پھر شاہ جہاں پور، بداؤں اور مرادآباد میں بھی انگریزی اقتدار ختم ہو گیا۔ خان بہادر خاں اس خاندان میں سے تھے، جو پہلے روہیل کھنڈ کا مالک رہ چکا تھا۔ اپنی عمر اور ناموری کے لحاظ سے بہت معزز سمجھے جاتے تھے اور چونکہ ساری زندگی سرکاری ملازمت میں گزاری تھی اس لیے نظم و نسق کا تجربہ بھی انھیں خاصا تھا۔ انھیں اوصاف کی بنا پر ان کی حکمرانی کا اعلان ہو گیا۔ انگریز سب کچھ چھوڑ کر نینی تال چلے گئے۔

دوسری روایت

مفتی انتظام اللہ خاں فرماتے ہیں کہ بریلی کے کمشنر الگزانڈر صاحب نے خود خان بہادر خاں کو بلا کر کہا تھا کہ آپ انتظام سنبھال لیں،

ہم آپ کو مسند نشین کرتے ہیں۔ خان بہادر نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ میں ضعیف العمر ہوں اور اس بار کو سنبھال نہیں سکتا۔

جب کمشنر نینی تال چلا گیا اور ضلع بے سردار رہ گیا تو جنرل بخت خاں تیز فوجی افسروں اور عمائد شہر نے متفق ہو کر خاں بہادر خاں کو روہیل کھنڈ کا نواب منتخب کیا۔ بہادر شاہ نے انتظام الدولہ محافظ الملک خاں بہادر خاں ہزبر جنگ کے خطابات عطا کیے[1]

نظم و نسق

جنرل بخت خاں دہلی چلے گئے، اس لیے مرکز کو تقویت پہنچانی لازم تھی اور یقیناً وہاں قابل و کار دان سپہ سالار کی اشد ضرورت تھی۔ خان بہادر خاں کے نظم و نسق کی کیفیت یہ بتائی گئی ہے:

نام	عہدہ
سوبھا رام	دیوان ریاست
نیاز محمد خاں	جنرل
مدار علی خاں	سپہ سالار
مولوی خاں	افسر تمپو
عبدالرحمان خاں رام پوری	"
اکبر علی خاں	کوتوال شہر
نظام علی خاں	نظامت شاہ جہاں پور
فتح علی شاہ	نظامت بدایوں[2]

---

[1] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۲۸-۱۲۶۔ سید الطاف علی صاحب نے ہزبر جنگ کی جگہ تہور جنگ لکھا ہے۔

[2] غدر کے چند علماء صفحہ ۱۲۷ - ۱۲۸۔

عام کیفیت

خان بہادر خاں نے شہروں اور اضلاع کا انتظام درست کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن انگریزوں کا بیان یہی ہے کہ علاقے کی تمام بستیوں نے خان بہادر کی حکومت تسلیم نہ کی اور فرقہ وار کشمکش بھی شروع ہو گئی، اس لیے کہ مسلمان ہندوؤں پر سختیاں کرتے تھے اور ہندوؤں کی آرزو یہ تھی کہ جلد سے جلد انگریز واپس آ جائیں۔

خدا جانے یہ بیانات کن اطلاعات پر مبنی ہیں۔ جس شخص نے دیوانی کا عہدہ ایک ہندو کارکن کے حوالے کر دیا تھا، اس پر فرقہ وار کشمکش پیدا کرنے کا الزام لگانا سراسر ناقابلِ فہم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ انگریزوں سے متعلق تھے اور ان کے کارندوں کی حیثیت میں کام کر رہے تھے، ان پر یقیناً سختیاں ہوئی ہیں، خواہ وہ ہندو تھے یا مسلمان، لیکن مذہبی اختلافات کی بنا پر سختیوں کا بیان سراسر افسانہ بافی کا کرشمہ ہے۔ خان بہادر خاں نے ہندوؤں کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ساتھ ہو کر انگریزوں سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ تو میں ذبیحہ گاؤ بالکل روک دوں گا۔[1]

جنگ بریلی

خان بہادر خاں نے تقریباً ایک سال حکومت کی۔ مئی ۱۸۵۸ء میں کالن کیمبل شاہ جہان پور کو فتح کرتا ہوا بریلی آیا۔ مراد آباد کی طرف سے بریگیڈیئر جونز فوج لے کر آ رہا تھا۔ میلسن نے لکھا ہے کہ خان بہادر خاں نے بچ نکلنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن حافظ رحمت خاں کے اخلاف کی رگوں میں جو گرم روہیلا خون موجزن تھا، وہ کبھی گوارا نہ کر سکتا تھا کہ دشمن سے مقابلہ کیے بغیر کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ چنانچہ خان بہادر خاں نے ۴۔ مئی کو اپنی فوج جنگ کے لیے آراستہ کی۔ اس نے نکٹیا ندی سے گزر کر ایک اونچے مقام پر توپیں نصب کیں اور پیادہ فوج کے دونوں بازوؤں پر رسالے کے پرے جمائے۔ ۵۔ مئی کو بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ کالن کیمبل کے پاس رسالہ زیادہ تھا، اس لیے وہ کامیاب ہوتا نظر آیا۔

---

[1] سین کی کتاب صفحہ ۹۳۔

غازیوں کی ترکتاز

خان بہادر خاں کی فوج میں ایک جیش غازیوں کا بھی تھا جو حلف اٹھا چکے تھے کہ خود مریں گے اور دشمن کو ماریں گے۔ جب تک زندگی کی رمق باقی ہے، تلوار نہ چھوڑیں گے اور نہ پیچھے ہٹیں گے۔ عین اس موقع پر اس جیش نے حملہ کیا۔ عینی شاہد کا بیان ہے کہ وہ لوگ بڑے وجیہ تھے۔ جوانی ڈھل چکی تھی اور بڑھاپا شروع ہو چکا تھا۔ ڈاڑھیوں کے بال سفید ہو رہے تھے۔ سبز رنگ پگڑیاں اور سبز رنگ کے کمر بند باندھ رکھے تھے۔ ہاتھوں میں چاندی کی انگوٹھیاں تھیں، جن پر آیات منقوش تھیں۔ وہ گھوڑوں پر سوار بجلی کی تیزی سے حملہ کے لیے آئے۔ سر نیچے کر رکھے تھے اور انہیں ڈھالوں سے چھپا رکھا تھا۔ تلواریں بلند تھیں۔ "دین" "دین" پکار رہے تھے[1] اور اس گاؤں پر حملہ آور ہوئے جہاں پنجابی سکھوں کا لشکر جما بیٹھا تھا۔ سکھ اس سیل کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہ نکلے۔ پھر غازی گھاگرا پلٹن پر جا گرے۔ میلی سن کہتا ہے کہ ان میں سے ایک بھی واپس نہ ہوا۔ سب نے میدانِ جنگ ہی میں جانیں دے دیں۔ تین غازی بریگیڈیر میرڈتھ پر جا گرے اور اسے گھوڑے سے کھینچ کر نیچے گرا لیا۔ اس کی موت میں کوئی شبہ باقی نہ رہا تھا۔ عین وقت پر دو غازی سنگین سے شہید ہو گئے اور ایک گولی سے۔ اسی طرح بریگیڈیر والپول کی جان بڑی مشکل سے بچی[2]

ایک اور چال

اب بہ ظاہر انگریزوں کی کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہا تھا لیکن یکایک کالن کیمبل نے اپنی فوج کو ٹھہر جانے کا حکم دے دیا۔ کیوں؟ اس وجہ سے کہ غازیوں کی ترکتاز سے فائدہ اٹھا کر خان بہادر خاں کے رسالے نے انگریزی فوج کے تیسرے کا چکر کاٹا اور وہ فوج کے عقب میں پہنچ گیا تاکہ انگریزوں کا کیمپ اور ساز و سامان

---

[1] انگریز مورخوں نے بار بار "دین" "دین" کے نعرے کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں میں ایسا کوئی نعرہ مروج نہ تھا۔ وہ عموماً تکبیر کہتے تھے۔ بعض لوگ حضرت علی مرتضیٰؑ کی دلاوری کے جوشِ اتباع میں "یا علی" بھی پکارتے تھے۔ [2] CAMERON، میلی سن جلد چہارم صفحہ ۳۶۸ - ۳۶۹۔

لوٹ لے۔ اس سے کیمپ میں شدید خوف و ہراس پیدا ہو گیا اور ہر شخص سراسیمہ وار اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ اس اثناء میں غازیوں کے ایک اور مختلف جیش نے حملہ کر دیا اور وہ سب بھی شہادت سے سرفراز ہوئے۔

غرض اس جوانمردانہ مقابلے نے کالن کیمبل کو رک جانے پر مجبور کر دیا۔ ادھر تاریکی کا دور دورہ شروع ہوا ادھر خان بہادر خاں بریلی سے نکل کر پیلی بھیت چلا گیا جو تیس میل شمال مشرق میں تھا۔

آخری دور

مولانا احمد اللہ کی شہادت کے بعد مجاہدوں اور آس پاس کے زمینداروں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راجہ پوائیں کو غداری اور بدعہدی کی عبرتناک سزا دیں۔ اس موقع پر جہاں نظام علی خاں، نواب تفضل حسین خاں، ولایت شاہ، علی خاں میواتی اور بعض دوسرے مجاہد فوج لے کر جمع ہوئے وہاں خان بہادر خاں بھی چار ہزار جانبازوں کے ساتھ ان کے ہمراہ تھا۔ نظام علی خاں اور علی خاں میواتی نے اس سلسلے میں پیلی بھیت پر بھی حملہ کیا۔[1]

۱۸۵۹ء میں کوہستان نیپال کے دامن کی ایک لڑائی میں خان بہادر خاں گھوڑے سے اتفاقیہ گر پڑا اور گرفتار ہو گیا۔ انگریز اُسے لکھنؤ لائے۔ چیف کمشنر کے روبرو پیش ہوا تو زمین پر بیٹھ گیا۔ کرسی پیش کی گئی تو فرمایا: مدتوں کرسی پر بیٹھے اب قیدیوں کی جگہ بیٹھنا چاہیے۔ چیف کمشنر نے اُسے بزور کرسی پر بٹھایا۔

بیان

جب پرسش شروع ہوئی تو بڑی مردانگی سے فرمایا:

میں نے از خود بغاوت پر کمر نہیں باندھی۔ سرکار انگریزی کی فوج باغی ہو گئی اور جس ملک کا یہ ذمے دار تھا اس کا رئیس گردانا گیا۔ بریلی، شاہ جہان پور، پیلی بھیت وغیرہ یعنی

---

[1] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۱۹۱ / ۱۹۲ / ۔

کل مدہیل کھنڈ ہمارا موروثی ملک تھا۔ اس وجہ سے بخت خاں اور جملہ رعایا نے مجتمع ہو کر مجھے مسند نشین ریاست کیا۔ میں نے بلوانہ کرایا اور نہ کسی انگریز زن و بچہ کو قتل کیا۔ جس وقت آپ صاحبان نے فوج کے ظلم سے مجبور ہو کر ملک چھوڑ دیا، تب میں نے قبضہ کیا۔ باقی بلوائیوں کی روک تھام اس دم میرے اختیار میں نہ تھی، اُنھوں نے جو چاہا سو کیا۔

بعدازاں لڑائیاں جابجا سرمیدان میری اور آپ کی فوج کی البتہ ہوئیں۔ ان میں طرفین کا کشت و خون ہوا، اس میں میری کیا خطا؟

عروس ملک کسے در کنار گیرد تنگ
کہ بوسہ برلب شمشیر آبدار زند!

اب آپ کے بس میں ہوں، جو چاہیے میری نسبت حکم دیجیے۔[1]

تبصرہ خان بہادر خاں پر بعض انگریزوں کے قتل کا بھی الزام تھا۔ اس کے جواب میں اس نے جو کلمات عذر فرمائے تھے اور جو کچھ کہا وہ یقینی اور قطعی طور پر درست تھا یعنی نواب نے نہ کسی عورت یا بچے کو قتل کرایا، نہ کسی انگریز افسر کو بطور خود سزائے موت دی۔ سپاہ تمام امور میں اپنے رئیسوں اور حاکموں کی بات مانتی تھی، لیکن انگریزوں کے قتل کے متعلق کسی کا حکم شاذ ہی مانا گیا، کیوں؟ اس لیے کہ اوّل سپاہ کو انگریزوں کے غلط اور جابرانہ طرزِ عمل کے باعث سخت غصہ تھا۔ دوم انگریز جہاں جہاں کامیاب ہوتے رہے، اس ملک کے باشندوں پر نہایت خوفناک اور ہول انگیز ظلم کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ اہل

---

[1] تاریخ بلھانی بحوالہ حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۲۶۳، ۲۶۴۔

ملک کے سینے انتقام کے جذبات سے بے طرح بھر جاتے اور انھیں انگریزوں کے خلاف کسی بھی کارروائی سے روکنا ممکن نہ رہتا۔ یہی ہوا لیکن جیسا کہ میں بارہا کہہ چکا ہوں اسے افعالِ قتل کے لیے معذرت نہ سمجھا جائے۔ غلط فعل بہر حال غلط ہوتا ہے خواہ اسباب کچھ ہوں۔ تاہم یہ ضرور مان لینا چاہیے کہ جن حالات میں واقعاتِ قتل پیش آئے وہ سراسر غیر معمولی تھے۔ اور اس ضمن میں غیر معمولی اشتعال خود انگریزوں نے پیدا کر دیا تھا۔ خان بہادر خاں نے جہاں یہ کہا تھا کہ مجھے کسی واقعہ قتل سے کوئی تعلق نہیں، وہاں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر میں مجرم ہوتا تو اپنے آپ کو حوالے کیوں کرتا؟

پھانسی خان بہادر خاں کے لیے پھانسی کی سزا غالباً پہلے سے تجویز ہو چکی تھی۔ پھر انگریزوں کی شقاوت اور سنگ دلی ملاحظہ ہو کہ یہ سزا لکھنؤ میں نہ دی بلکہ خان بہادر خاں کو بریلی لے گئے اور وہاں کوتوالی کے سامنے پھانسی پر لٹکایا۔

آخری وقت میں اُن سے کہا گیا کہ کچھ نصیحت و وصیت کرنی ہو تو کر دیجیے۔ فرمایا مجھے کچھ نہیں کہنا۔ پھر آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا:

بجرم عشق توام می کشند غوغائیست
تو نیز بر سرِ بام آ کہ خوش تماشائیست

چونکہ اندیشہ تھا ممکن ہے شورش ہو جائے، اس لیے انگریزی فوج اور توپ خانے نے شہر کی ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔

پھانسی کے بعد نعش اس وجہ سے متعلقین کے حوالے نہ کی گئی کہ وہ لوگ باہر دفن کریں گے تو قبر زیارت گاہِ عام بن جائے گی۔ ڈسٹرکٹ جیل بریلی ہی میں اس بہادر مجاہد کو دفن کرا دیا۔ سید الطاف علی بریلوی کے ایک بزرگ اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے نعش کو بلا کفن قبر میں رکھتے ہوئے دیکھا تو اپنا رومال مرحوم کے چہرۂ مبارک پر ڈال دیا۔ خان بہادر کی مہر پر "الحکم للّٰہ والملک للّٰہ" کے الفاظ کندہ تھے۔[1]

---

[1] حیاتِ حافظ رحمت خاں صفحہ ۲۶۴۔

انتظامی کیفیت

ڈاکٹر حسین لکھتے ہیں کہ خان بہادر خاں نے نواب اعظم روہیل کھنڈ بن جانے کے بعد ہندوؤں کو عموماً اور راجپوت ٹھاکروں کو خصوصاً راضی اور مطمئن کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ٹھاکروں میں سے جیل سنگھ خاص ممتاز تھا۔ اس نے سب سے پہلے خان بہادر خاں کی حکومت تسلیم کر لی۔ سوبھارام بنیا تھا۔ وہ دیوان مقرر ہوا تو اس کا پورا عملہ ایک فرد کے سوا کافی ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ آٹھ آدمیوں کا انتظامی بورڈ بنایا گیا تھا جس کے ممبروں میں سے دو[2] ہندو تھے۔ ایک سوبھارام اور دوسرا جیل سنگھ۔ اس نے ذبیحہ گاؤ بالکل روک دیا تھا۔ مگر وہ محلہ کے تیلیوں پر قابو نہ پا سکا۔ وہ فرقہ وار جھگڑے اٹھاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مسلمانوں کا ہجوم سوبھا رام کے گھر میں گھس گیا۔ عندیہ رکھا کہ وہاں انگریز چھپے ہوئے ہیں اور گھر کا سارا سامان لوٹ لیا۔ خان بہادر خاں کے ایک رشتہ دار میر عالم خاں نے گوسائیں جو گیر کے گھر پر حملہ کر دیا۔ گوسائیں نے میر عالم کو قتل کر ڈالا۔ وہ گرفتار ہوا، مقدمہ چلا۔ قاضی نے اسے بری کر دیا مگر میر عالم خاں کے بھائی نے گوسائیں کو قتل کر ڈالا۔

محاصل لگانے والی کمیٹی تمام کی تمام ہندوؤں پر مشتمل تھی اور خان بہادر خاں نے محاصل کے لیے مسلمان عالموں اور ہندو پنڈتوں سے مذہبی پروانے حاصل کر لیے تھے لیکن کاروباری آدمیوں کے دل انگریزوں کی طرف مائل تھے۔ مصر بیج ناتھ اور گنجیت لال سے چون ہزار روپے وصول کیے گئے۔ بیج ناتھ نے ان انگریز افسروں سے خفیہ نامہ و پیام جاری رکھا جو نینی تال چلے گئے تھے[1]

غرض خان بہادر خاں کی مخلصانہ اور سرگرم کوششوں کے باوجود کوتہ اندیشوں نے معاملات روبراہ نہ ہونے دیے۔ مصر بیج ناتھ نے مالی نقصان یقیناً اٹھایا لیکن انگریزی حکومت بحال ہوئی تو نہ صرف اس کے نقصان کی تلافی کر دی گئی بلکہ اسے راجا کا خطاب دیا

---

[1] حیات حافظ رحمت خاں ص ۳۶۲ ۔ [2] ڈاکٹر حسین کی کتاب ص ۲۴۹ ، ،

گیا اور خاصی بڑی جاگیر اس کے حوالے کر دی گئی۔[1]
سو بھا رام بھی گرفتار ہوا۔ اسے عمر قید کی سزا دے کر مولمین (برما) بھیج دیا گیا۔[2]

---

[1] ڈاکٹر سین کی کتاب صفحہ ۳۵
[2] " " صفحہ ۳۷۱

نواب محمود خاں

خاندان

نواب محمود خاں جنھیں عام طور پر "جنرل" محمود خاں کہا جاتا ہے، نواب جلیل خاں (ابن ضابطہ خاں ابن نجیب الدولہ) کے فرزند اور غلام قادر خاں روہیلہ کے بھتیجے تھے۔ نواب نجیب الدولہ کے خاندان کی بلندی اور اثر و رسوخ کی وسعت کسی تصریح کی محتاج نہیں اگرچہ پہلی شان اور پہلی ریاست باقی نہ رہی تھی، تاہم محمود خاں اپنے آبائی وطن نجیب آباد میں زندگی امیرانہ طور طریق پر گزار رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ عمر بھی خاصی ہو چکی تھی، جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رونما ہوا اور محمود خاں کو ضلع بجنور کا نظم و نسق سنبھال کر انگریزوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔

حالات کے ماخذ

بجنور میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو فراز و نشیب کے چند مراحل سے گزرنا پڑا۔ ان کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے ہمارے پاس دو ذریعے ہیں، اوّل وہ کتابیں جو انگریزوں نے لکھیں اور ان میں اپنے نقطۂ نگاہ سے تمام حالات بیان کیے۔ دوم سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور کے بیانات جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت بجنور کے صدر امین تھے اور انھوں نے انگریزی حکومت کی تائید و حمایت میں سرگرم حصہ لیا تھا، اس لیے کہ وہ دیانتداری سے ایک طرزِ عمل کو درست سمجھتے تھے۔ ان کی پختہ رائے تھی کہ ہنگامے کا نتیجہ حسب مراد نہ نکلے گا اور اس سے ملی و قومی مقاصد کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچے گا۔ سر سید کی رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو، لیکن ان کے بیانات کی درستی اور

صحت میں غالباً کسی کو بھی تامل نہ ہوگا۔

آغاز

میرٹھ کے ہنگامے کی خبر ۱۲ مئی کو بجنور پہنچی تھی۔[1] اگرچہ دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ صرف چالیس میل تھا۔ خواجہ حالی نے غالباً سر سید کے بیان کی بنا پر فرمایا ہے کہ یہ خبر ۱۲ کو پہنچ گئی تھی۔[2] اس وقت سے حالات بگڑنے لگے۔ وہاں تھوڑے سے انگریز تھے۔ کلکٹر اور مجسٹریٹ کا نام شیکسپیئر تھا۔ اسے تین ایسے مسلمان عہدیدار مل گئے تھے، جیسے غالباً کسی بھی انگریز افسر کو نہ مل سکے، اوّل محمد رحمت خاں ڈپٹی کلکٹر، دوم سر سید صدر امین، سوم مولوی نواب علی تحصیلدار۔ ان تینوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر جس مردانگی سے انگریزوں کی حفاظت کی اور جس حسن تدبیر سے ضلع کو ہنگامے سے بچائے رکھنے کی کوششیں کیں، اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

یکے بعد دیگرے مختلف مقامات سے خبریں آتی رہیں کہ لوگوں نے حکومت کا جوا اتار پھینکا ہے اور جیل خانے کے دروازے کھول دیے ہیں۔ غیر ممکن تھا کہ بجنور ان خبروں کے اثرات سے محفوظ رہتا۔ شیکسپیئر کلکٹر کو خیال تھا کہ سب سے پہلے خزانے پر یورش ہوگی۔ اس نے خزانے کا روپیہ پہلے ایک کنوئیں میں ڈلوا دیا۔ پھر باہر سے ہاتھی منگوا کر پچاس ہزار کی رقم محفوظ مقام پر پہنچا دی۔

کہا جاتا ہے کہ نواب محمود خاں پہلے تین سو پٹھانوں کے ساتھ بجنور آیا تھا مگر واپس چلا گیا۔ ۲۱ مئی کو بریلی میں بھی آگ بھڑک اٹھی اور بجنور میں قیام ان کی طرف سے بالکل مایوسی ہوگئی تو اوائل جون میں محمود خاں دوبارہ آگیا۔

نواب سے فیصلہ

اس پوری مدت میں سر سید انگریزوں کی حفاظت کرتے رہے۔ ایک موقع پر شدید اندیشہ پیدا ہو گیا تو سر سید اپنے کسن بھتیجے

---

[1] میلی سن جلد ششم ص۱۰۴۔ [2] حیات جاوید حصہ اوّل ص۶۱۔

کو ملازم کے حوالے کرکے خود پہرے کی غرض سے کلکٹر کے بنگلے پر چلے گئے اور ملازم کو تاکید کر گئے کہ میں مارا جاؤں تو بچے کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دینا۔

جب شیکسپیر کو بجنور میں بیٹھے بیٹھے حالات کے سدھارنے کی کوئی صورت نظر نہ آئی بلکہ باہر سے مخابرت کے سلسلے میں منقطع ہو گئے تو اس نے خود نواب سے فیصلہ کر لینا مناسب سمجھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دس روز کے لیے شیکسپیر اور اس کے ساتھی باہر چلے جائیں، نواب تمام انتظامات کا ذمہ دار ہے۔ مگر اسے مالیہ وصول کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ چونکہ انتظام کے سلسلے میں خاصا روپیہ خرچ کرنا لازم تھا، لہٰذا خزانے میں جتنا روپیہ باقی تھا، اس کے حوالے کر دیا گیا۔ البتہ یہ کہہ دیا گیا کہ خرچ کا حساب کتاب باقاعدہ رکھا جائے۔

سرسید کی کوشش

یہ فیصلہ یقیناً سرسید کی کوششوں سے ہوا۔ خواجہ حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے نواب محمود خاں سے گفتگو کی اور کہا:

> چند انگریزوں کے مار ڈالنے سے کیا ہاتھ آئے گا؟ بہتر ہے کہ ان کو صحیح و سالم یہاں سے جانے دو اور تم ملک کے مالک ہو جاؤ . . . . اس معاملے کے متعلق تمام نشیب و فراز ایسی خوبی سے سمجھائے کہ اس نے فوراً منظور کر لیا[1]

خواجہ صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سرسید نے کلکٹر کی طرف سے جو تحریر نواب محمود خاں کو دی تھی، اگر وہ اس کے مطابق عمل کرتا تو اسے کسی طرح کا اندیشہ نہ تھا۔[2] یہ وہی تحریر تھی جس کے مضمون کا خلاصہ ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔ غرض شیکسپیر اور دوسرے انگریز ۲۰ جون کو بجنور سے روانہ ہو گئے اور ۲۱ کو بہ خیر و عافیت رڑکی پہنچ گئے۔

---

[1] حیات جاوید حصہ اول ص۷۵ ، [2] ایضاً ایضاً ۔

سرسید اور میر تراب علی بھی بالکل باہر نکل گئے۔ محمد رحمت اللہ خاں ڈپٹی کلکٹر پہلے ہی باہر تھے۔ محمود خاں نے انتظام سنبھالا تو سرسید، میر تراب علی اور رحمت خاں تینوں کو بلا لیا اور کہا کہ وہ معمول کے مطابق کام کریں۔ نواب کی خواہش تھی کہ وہ انگریزی حکومت کے کارکنوں کی حیثیت میں نہیں بلکہ نواب کے کارکنوں کی حیثیت میں رہیں۔ سرسید نے یہ شرط پیش کی کہ آپ انگریز کلکٹر سے منظوری منگوا لیں، تو ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نواب کے کارندوں نے سرسید اور میر تراب علی کے مکان چھین لیے اور ان کا سامان بھی لے لیا[1]۔

نااتفاقی کے بعد اتفاق

ضلعے کا انتظام خود کلکٹر نے نواب کے حوالے کیا تھا۔ اب بہترین صورت یہی تھی کہ اس انتظام کی درستی اور اچھائی پر خاص توجہ مبذول کی جاتی اور رعایا کے لیے امن و راحت اور خوشحالی و فارغ البالی کے اسباب فراہم کیے جاتے، لیکن افسوس کہ بعض افراد کی نااتفاقی کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔ ہندو چودھری ایک فریق بن گئے خصوصاً بجنور اور ہلدور کے چودھری، نواب کے آدمی دوسرا فریق بن گئے[2]۔ حیات جاوید سے معلوم ہوتا ہے ہلدور کے چودھریوں نے ایک انبوہ کثیر جمع کر کے نواب محمود خاں کی فوج پر حملہ کر دیا اور نواب شکست کھا کر بجنور سے نجیب آباد چلا گیا[3]۔ میل سن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حملہ ۹۔ اگست کو ہوا تھا، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چودھریوں کے ساتھ جو انبوہ تھا، اس نے بے قابو ہو کر لوٹ مار شروع کر دی۔ مسلمانوں نے یہ حالت دیکھی تو نگینہ کو لوٹا۔ ہلدور میں چودھریوں کو شکست دی اور بجنور پر قبضہ کر لیا۔ بعض چودھریوں کو بھاگ کر جان بچانی پڑی۔ آخر فیصلہ ہو گیا کہ نواب کو حکومت کا مختار تسلیم کیا جائے اور بارہ ہزار روپے ماہانہ کی رقم اسے دی جائے۔ نواب کا خلعت اکبر، نیز اس کا بھانجا اور ماڑے خاں خاص کارندے قرار پائے۔ اس کے بعد نواب نے حدود ضلع سے باہر بھی حملے کیے[4]۔

---

[1] حیات جاوید ص ۷۲۔ [2] میل سن جلد ششم ص ۱۱۱-۱۱۲ [3] ایضاً [4] ایضاً۔

انگریزوں کا اقدام

وسط فروری ۱۸۵۸ء کے بعد انگریزوں نے بجنور میں فوجی اقدام کی تیاری شروع کی۔ اپریل میں وہ بڑھے۔ اب ایک نئی مصیبت برپا ہوئی۔ جو ہندو چودھری مسلمان کے مقابلے میں شکست کھا کر بھاگ گئے تھے وہ انگریزوں کے ساتھ ہو گئے اور سرگرم کوششیں شروع کر دیں کہ جو مسلمان ان کے خلاف لڑائیوں میں شریک رہے تھے، ان سب کو انگریزوں کے روبرو باغی ثابت کریں، انھیں سزائیں دلائیں اور خود انگریزوں کے وفادار و خیر خواہ قرار پائیں۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ اگر اس وقت بھی   ہو جاتا تو ضلع بجنور خاک سیاہ اور مسلمانوں سے خالی ہو جاتا[1]۔

سرسید کی راستبازی

سرسید ہنگامے کے حق میں نہ تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ہندو رئیس ذاتی اغراض کے ماتحت مسلمانوں کو خواہ مخواہ ہدف مصائب بنانے کے لیے کوشاں ہیں، تو انھوں نے بے باکانہ کلکٹر اور افسران فوج سے گفتگو کی اور واضح کر دیا:

> سرکار کے نزدیک باغی صرف وہی لوگ قرار پانے چاہئیں جو اب سرکار سے مقابلے کے ساتھ پیش آئیں۔ باقی جو لڑائیاں اور فسادات رعایا نے ایک دوسرے سے کیے۔ قانون کی رو سے ان کی نسبت جو کچھ تجویز ہو سو ہو مگر ان کی وجہ سے کسی کو سرکار کے مقابلے میں باغی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے نزدیک بروقت داخل ہونے پر سرکاری فوج اگر کوئی مقابلہ نہ کرے اور سب لوگ مع نواب محمود خاں کے حاضر ہو جائیں تو ضلع بجنور کے کسی شخص کو باغی قرار دینا نہیں چاہیے[2]۔

---

[1] حیات جاوید حصہ اول ص ۷۷ ، ۹

[2] ایضاً ایضاً ، ۹

انگریزوں سے مقابلہ

آخر اسی رائے کے مطابق فیصلہ ہوا لیکن جو لوگ یقین کیے بیٹھے تھے کہ بھی انگریزوں کا مقابلہ کرنا چاہیے اسی میں ... کی بہتری ہے اور یہی شریعت کا تقاضا ہے، وہ چپ چاپ ہتھیار ڈالنے پہ آمادہ نہ ہو سکتے تھے۔ احمد اللہ خاں اور ماڑے خاں نے آسم سونت، نجیب آباد اور نگینہ میں انگریزی فوج کا مقابلہ کیا۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ ہزاروں ان لڑائیوں میں جان بحق ہو گئے۔[1] مفتی انتظام اللہ لکھتے ہیں کہ احمد اللہ خاں نے جہاد کا علم بلند کیا تھا، شفیق اللہ خاں بھی احمد اللہ خاں کا ہم نوا بن گیا تھا، اور اس نے چند ہزار سپاہ فراہم کر لی تھی۔[2]

فوج کا چشم دید حال

سید ظہیر دہلوی نے بھی "داستان غدر" میں نواب محمود خاں کا سرسری ذکر کیا ہے، جس سے فوج کی کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سید موصوف جب پانی پت سے چل کر لکھنؤ جا رہے تھے تو لکھتے ہیں کہ گنگا کو عبور کر کے فیروز آباد پہنچے اور نمبردار کے ہاں ٹھہرے تو:

> نجیب آباد والے نواب کا آدمی آیا کہ رات کون آدمی گنگا اتر کر تمہارے ہاں آئے ہیں؟ کوئی انگریزی مخبر تو نہیں ہیں؟ ہم نے کہا کہ ہم آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ تم میں سے ایک آدمی ہمارے ساتھ چلو، غرضیکہ میں ہی اس کے ہمراہ ہو لیا۔ تھوڑی دور فوج پڑی ہوئی تھی، ڈیرے خیمے لگے ہوئے تھے۔ وہ آدمی مجھے ایک ڈیرے پر لے گیا۔ وہاں چند لوگ عزت دار کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ انھوں نے مجھ سے حال پوچھا، میں نے مختصر بیان کیا کہ تباہی زدہ دلی کا رہنے والا ہوں۔

---

[1] حیات جاوید حصہ اول ص۵۵، [2] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص۱۳۲۔

انگریزوں کے خوف سے ہم لوگ جان بچاتے پھرتے ہیں۔
ان میں سے ایک آدمی بولا کہ تم لوگ نوکری کر لو، یہاں شہر جبوہ
میں نے جواب دیا کہ ہم نوکری کے لائق نہیں، ہم لوگ لکھنؤ کو
جائیں گے[1]

بھی فوج بے سر و سامان بھی نہ تھی اور ہر لحظہ چوکس بھی رہتی تھی۔ چونکہ پہرے کا خوب انتظام تھا اور ہر آیندہ و روند کے متعلق آگاہی حاصل کی جاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ آدمی ملازم رکھنے کا بھی خاص اہتمام تھا۔

آخری دور

غرض نواب نے معاملات کو سنبھالے رکھنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ دہلی سے بھی تعلق پیدا کر لیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے امیر الدولہ، ضیاء الملک محمود خاں بہادر مظفر جنگ کا خطاب دیا تھا۔ منشی جیون لال نے ۴ جولائی کے حالات میں لکھا ہے کہ نواب محمود خاں رئیس نجیب آباد نے بجنور، دھام پور، نگینہ اور آدم پور پر قبضہ کر لیا۔[2]

انگریز بجنور پر قابض ہو گئے تو نواب کے خلاف مقدمہ چلا اور حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی لیکن ابھی انڈیمان بھیجے نہ گئے تھے کہ قید ہی میں وفات پائی۔ ان کے چھوٹے بھائی جلال الدین خاں اور سعد اللہ خاں نور پور میں ۱۹ ۔ اپریل ۱۸۵۸ء کو پھانسی پر لٹکائے گئے اور ان کا دیوان خانہ بارود سے اڑوا دیا گیا۔

---

[1] داستانِ غدر ص ۱۳۲ ۔ [2] روزنامچہ انگریزی ص ۱۴۱ ۔

کنور سنگھ اور امر سنگھ

انگریزوں کی بدسلوکی

کنور سنگھ جگدیش ضلع شاہ آباد بہار کا راجپوت رئیس تھا جس کا خاندان زمانہ قدیم سے جاگیر کا مالک تھا۔ اس کی آمدنی تین لاکھ سالانہ سے کم نہ تھی۔ ایک لاکھ اڑتالیس ہزار روپے وہ مالیہ ادا کرتا تھا۔ اسے کارندوں نے تباہ کر ڈالا اور کنور سنگھ تیرہ لاکھ کا مقروض ہو گیا۔ قرضخواہوں نے تجویز پیش کی کہ جاگیر کو سرکار اپنی نگرانی میں لے لے اور آہستہ آہستہ قرضے ادا کر دے۔ لیکن جو لوگ اس جاگیر سے فائدہ اٹھا رہے تھے انھوں نے یہ تجویز منظور نہ ہونے دی یا تو سرکاری کارکنوں سے کہہ سن کر یا کچھ دے دلا کر اس تجویز کو مسترد کرا دیا۔ ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ شاہ آباد کا انگریز مجسٹریٹ، جس کا نام کنلف[1] تھا قرض خواہوں کو بالواسطہ اکساتا رہا۔

آخر ریونیو بورڈ نے تجویز پیش کی کہ کنور سنگھ دس لاکھ روپے قرض لے کر واجب الادا رقمیں ادا کر دے۔ سود ساہوکار مدن نرائن راؤ اور مادھو راؤ سے قرض کے لیے گفتگو کی گئی، مگر مناسب شرطیں طے نہ ہو سکیں اور معاملہ ختم ہو گیا۔ کمشنر کنور سنگھ کی جاگیر بچانے کے حق میں تھا۔ اس نے کہا کہ تشدد مطالبات معمولی قرضے لے کر ادا کر دیے جائیں اور سید عظیم الدین حسین خان ڈپٹی کلکٹر

---

[1] CUNLIFFE

شاہ آباد کو جاگیر کی نگرانی پر مقرر کر دیا جائے۔ اس اثنا میں چھ لاکھ روپے ادا ہو چکے تھے اور صرف دو لاکھ ساڑھے چھپن ہزار روپے قرض لینے پڑے تھے۔ بورڈ نے کمشنر کی یہ تجویز منظور نہ کی[1] اور اچانک حکم جاری ہو گیا کہ ایک مہینے کے اندر اندر پورا روپیہ ادا کر دو تو ٹھیک ہے، ورنہ جائداد کی نیلامی نہ رک سکے گی۔ پٹنہ کے کمشنر نے اس حکم سے اختلاف کیا۔ حقیقت بالا دست افسروں پر واضح کی کہ ایسے قدیم رئیس کو یوں برباد نہ کرنا چاہیے، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ میلی سن نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں صرف اس کا ایک مقبوضہ باقی رہ گیا تھا، اگر اس کا بھی فیصلہ کنور سنگھ کی امید کے مطابق ہو جاتا تو غالباً وہ سنبھلا رہتا۔ لیکن ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو جانے کے بعد یہ فیصلہ بھی خلاف ہوا تو کنور سنگھ نے، جس کی عمر ستر سال سے متجاوز ہو چکی تھی، انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دینے کا پختہ فیصلہ کر لیا۔ پھر دم واپسیں تک اس نے اپنی سرگرمیاں اسی نہج پر جاری رکھیں اور ایک لمحے کے لیے بھی نہ دبا۔

لڑائیاں

دانا پور کی سپاہ سرکشی اختیار کر چکی تھی اور سامان جنگ کے ساتھ دریائے سون کے کنارے پہنچ چکی تھی۔ اس کے لیے دریا سے پار اترنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ عین اس موقع پر کنور سنگھ نے اپنے کاشتکاروں کو اٹھا دیا۔ کشتیوں کا انتظام کیا۔ ۲۶ جولائی کو سپاہی دریا کے پار اترے اور کنور سنگھ نے ساتھ ہو کر آرہ پر حملہ بول دیا۔ یہ لوگ بڑی مردانگی سے لڑے۔ انگریزوں کو بار بار شکستیں دیں لیکن ۲-۱ اگست کو مزید انگریزی فوج آ گئی لہٰذا کنور سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو مجبوراً جگدیش پور کی طرف ہٹنا پڑا۔

پھر انگریزوں سے جگہ جگہ مڈبھیڑ ہوئی۔ آخر کنور سنگھ اپنے ساتھیوں کو لے کر ضلع شاہ آباد سے نکلا، جس کا مرکزی مقام آرہ تھا اور ضلع مرزا پور میں داخل ہو گیا۔ وہاں بھی خوب ہنگامہ بپا رکھا۔ مختلف مقامات پر افراتفری پڑی رہی۔ جب انگریز بڑی تعداد میں تعاقب کے لیے پہنچ گئے تو

---

[1] میلی سن کی کتاب ص ۲۵۶۔

کنور سنگھ مرزاپور سے نکل کر ضلع الٰہ آباد میں داخل ہوگیا۔ اب یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی منزلِ مقصود اودھ ہے، جہاں انگریزوں کے خلاف سرگرمی سے لڑائیاں جاری تھیں اور جگہ جگہ مجاہدین کی فوجیں پھیلی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ وہ دہلی جانا چاہتا تھا۔ اس خیال سے ریوا کی طرف بڑھا، لیکن اس اثنا میں انگریزوں نے دہلی کو مسخر کر لیا اور ریوا کے راجا کو انگریزی پولٹیکل ایجنٹ نے مزاحمت پر آمادہ کر لیا۔[1]

انگریزوں میں سراسیمگی

اچانک کنور سنگھ کو خیال آیا کہ انگریزی فوجیں ہر طرف سے لکھنؤ پر بڑھ رہی ہیں اور اودھ کے مشرق میں جتنے انگریزی علاقے واقع ہیں، وہ قریباً خالی ہو چکے ہیں لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ان پر حملہ کیا جائے۔ چنانچہ وہ اترولی پہنچا جو ضلع اعظم گڑھ کی سرحد سے قریب ہے۔ وہاں اسے کچھ اور سپاہی مل گئے۔ ۲۰۔ مارچ ۱۸۵۸ء کو اس نے اعظم گڑھ کی طرف پیش قدمی کی۔ راستے میں انگریزی فوج سے ٹکر ہوئی اور انگریز سالار کے لیے اس کے سوا چارا نہ رہا کہ پیچھے ہٹ جائے۔ اسی طرح کنور سنگھ اسے دباتا ہوا اعظم گڑھ تک لے گیا۔ انگریز سالار نے ہر طرف کمک کے لیے پیغام بھیج دیے۔

ہومز لکھتا ہے کہ جب کنور سنگھ کے مقابلے میں انگریزوں کی شکست کی خبر الٰہ آباد پہنچی تو گورنر جنرل وہاں آیا ہوا تھا۔ چنانچہ سراسیمگی پیدا ہوگئی، اس لیے کہ خطرہ تھا کنور سنگھ بنارس پر حملہ کر کے کلکتہ اور لکھنؤ کے درمیان حمل و نقل کے سلسلے منقطع کر دے گا۔ فوراً ایک فوج الٰہ آباد سے اس کے مقابلے پر بھیجی گئی۔ ۶۔ اپریل کو اعظم گڑھ کے سامنے سخت لڑائی ہوئی۔ ساتھ ہی مزید انگریزی فوجیں آگئیں اور کنور سنگھ اعظم گڑھ سے چلا تو دریائے گنگا کو عبور کر کے دوبارہ اپنے وطن جگدیش پور کے جنگلوں میں جا بیٹھا۔ وہاں اس کا بھائی امر سنگھ بھی بہت سے کسانوں کو جمع کر کے

---

[1] ڈاکٹر سین کی کتاب صفحہ ۲۶۱۔

کر پہنچ گیا تھا۔

عبورِ گنگا

اس سلسلے میں دریائے گنگا سے پار اُترنے کا واقعہ ایک داستان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، لہٰذا اسے قدرے تفصیل سے بیان کرنا چاہیے۔

اعظم گڑھ سے جگدیش پور پہنچنا سہل نہ تھا۔ کنور سنگھ نے اپنی فوج کو اس طرح تقسیم کیا کہ منزلِ مقصود کی طرف پیش قدمی بھی جاری رہے اور انگریزوں کو یہ احساس بھی ہوتا رہے کہ وہ کہیں جانے کے لیے تیار نہیں بلکہ مقابلہ جاری رکھے گا۔ اسی انتظام کے ساتھ وہ ضلع غازی پور سے گزرا۔ اب اس کے پاس آدمی بہت زیادہ نہ رہے تھے، لہٰذا اس نے دشمن کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے عجیب و غریب تدبیریں اختیار کیں۔ عام افواہ پھیلادی کہ کشتیاں نہیں ملتیں، لہٰذا دریا ہاتھیوں کے ذریعے سے عبور کیا جائے گا اور گھاٹ کا پتا بھی بتادیا۔ تعاقب کرنے والے انگریز افسر نے اپنی فوج اسی گھاٹ کے آس پاس گھات میں بٹھادی۔ کنور سنگھ نے اس مقام سے سات میل نیچے گنگا عبور کیا۔ انگریز افسر کو یہ حقیقت معلوم ہوئی تو تیزی سے اس گھاٹ پر پہنچا جہاں سے کنور سنگھ گزر رہا تھا اور ایک کشتی بھی پکڑلی تھی جس میں فوج کا آخری دستہ جا رہا تھا۔

کلائی گنگا کی نذر

خود کنور سنگھ نے ابھی دریا عبور نہ کیا تھا۔ جب وہ روانہ ہوا تو گولیوں کی بارش شروع ہوگئی۔ دریا کے عین بیچ میں ایک گولی اس کی کلائی پر لگی۔ زخم اتنا سخت و شدید تھا کہ کلائی کاٹے بغیر بچاؤ کی صورت کوئی نہ تھی۔ بہادر کنور سنگھ، جس کی عمر ستر اور اسی کے درمیان تھی، دوسرے کنارے پر پہنچا تو اُسے یقین ہوگیا کہ کلائی بہرحال کاٹنی پڑے گی۔ چنانچہ اس نے اپنی تلوار میان سے کھینچی اور زخمی کلائی والا بازو ایک ہی ضرب میں کہنی سے کاٹ کر پھینک دیا۔ پھر کٹا ہوا بازو دریا میں ڈالتے وقت گنگا سے مخاطب ہو کر بولا:

ماتا! اپنے سپوت کی اس آخری قربانی کو شرفِ قبول عطا کر۔

ساورکر نے خوب لکھا ہے کہ بے شمار اور بے حد و حساب آدمی گنگا کو ماتا کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن کنور سنگھ جیسے غیر معمولی بہادر بیٹوں ہی کی بدولت گنگا کی موجوں میں عظمت و شان پیدا ہوتی ہے۔ آسمان پر ان گنت ستارے ہیں، لیکن چاند ہی کا طلوع اس کے لیے زیب و زینت کا باعث ہوتا ہے۔[1]

لی گرانڈ کی شکست

کنور سنگھ جگدیش پور کے جنگل میں جا بیٹھا تو کیپٹن لی گرانڈ نے اس پر حملے کا فیصلہ کیا۔ وہ فوج کے ساتھ ۲۲۔ اپریل ۱۸۵۸ء کو آرہ سے نکلا۔ پہلے اس جگہ توپوں سے گولے برسائے جہاں کنور سنگھ کے متعلق خبر ملی تھی، پھر فوج کو آگے بڑھایا۔ کنور سنگھ نے جب دیکھا کہ دشمن زد میں آگیا ہے تو اچانک کمین گاہ سے نکل کر حملہ بول دیا۔ انگریزوں نے لکھا ہے کہ اس وقت کسی نے انگریزی فوج کے لیے مراجعت کا بگل بجا دیا حالانکہ لی گرانڈ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ بہرحال انگریزی فوج پیچھے کی طرف بھاگی۔ نظم کا شیرازہ کھل گیا۔ ذرہ تک کسی کو ہوش نہ رہا کہ کیا ہوا۔ اس فوج میں ایک سو ننانوے گورے تھے، صرف اسی باقی بچے۔ زخمیوں کو ہاتھیوں پر لاد کر لائے، لیکن مرہم پٹی کی کوئی صورت نہ تھی اس لیے کہ کنور سنگھ نے شفاخانے پر قبضہ جما لیا تھا۔[2]

وفات

اس شاندار فتح سے تین روز بعد ۲۶۔ اپریل ۱۸۵۸ء کو کنور سنگھ نے وفات پائی۔ وفات کے صحیح حالات معلوم نہ ہو سکے۔ قیاس یہ ہے کہ اس نے دریائے گنگا پر اپنے ہاتھ سے اپنا بازو کاٹا تھا،[3] اس کی وجہ سے خون زیادہ بہ گیا۔ نتیجہ موت کے سوا کیا ہو سکتا تھا۔ تاہم وہ جب تک زندہ رہا آزادی کی فضا میں سانس لیتا رہا، جب مرا تو آزاد تھا اور آزادی ہی کی حالت میں اس کی ارتھی جلائی گئی۔

شخصیت

ساورکر نے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلابیوں میں ویسی جنگی صلاحیت کا شخص کوئی

---

[1] ساورکر صفحہ ۳۴۹، ۳۵۰۔ [2] ایضاً صفحہ ۳۵۲۔ [3] ڈاکٹر سین نے تاریخ وفات ۲۴۔ اپریل بتائی ہے۔

نہ تھا۔ میلی سن کہتا ہے کہ انقلابیوں میں سے تین آدمیوں نے جنگی صلاحیت کا ثبوت دیا، ایک مولانا احمد اللہ دوسرا تانتیا ٹوپے اور تیسرا کنور سنگھ۔ ہمیں باہم مقابلے کی ضرورت نہیں لیکن یقیناً تانتیا ٹوپے کی حیثیت اتنی بلند نہیں جتنی مولانا احمد اللہ شاہ اور کنور سنگھ کی ہے اور عزم و شجاعت میں رانی لکشمی بائی کا مقابلہ بہ آسانی نہیں ہو سکتا۔

امر سنگھ

جانبازوں نے متوفیٰ سردار کے بھائی امر سنگھ کو جانشین بنا لیا۔ انگریزی بیانات کے مطابق اسے مئی ۱۸۵۸ء میں کم و بیش چار مرتبہ پے در پے شکستوں سے سابقہ پڑا اور بظاہر سمجھا جانے لگا کہ کنور سنگھ اپنے ساتھ مزاحمت کی قوت و ہمت بھی لے گیا۔ لیکن امر سنگھ نے بہت جلد اپنی غیر معمولی صلاحیت کے عملی ثبوت پیش کر دیے۔ اس نے سوچا، ساری فوج کو اکٹھا رکھ کر لڑانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریز بھی اپنی قوت مجتمع کر لیں گے، لہٰذا اس نے تمام ساتھیوں کو چھوٹے چھوٹے جتھوں میں تقسیم کر کے ہر طرف پھیلا دیا اور ایک ایک وقت میں کئی کئی مقامات پر چھاپوں کا تانتا باندھ دیا۔ جگدیش پور پر بھی وہ قابض ہو گیا۔ پھر آرہ کے لیے شدید خطرہ پیدا کر دیا۔ بلکہ کہا جاتا ہے آرہ کی بیرونی چوکیوں پر بھی امر سنگھ نے کئی مرتبہ ترکتازیاں کیں۔

آخری دور

آخر انگریزوں نے ایک خاص نقشہ عمل بنا کر مختلف سمتوں سے فوجیں جگدیش پور بھیجیں تاکہ امر سنگھ کو گرفتار کر لیا جائے۔ جب اس نے دیکھا کہ نرغے کا حلقہ لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتا جا رہا ہے تو اپنے تین چار ساتھیوں کے ہمراہ بھیس بدل کر نکلا اور گنے کے ایک کھیت میں چھپ گیا، اسی طرح اس کے ساتھی بھی بچ نکلے اور کیمور کی پہاڑیوں میں پہنچ گئے جو ضلع شاہ آباد کے جنوب و مغرب میں واقع ہیں۔

امر سنگھ کے متعلق بعد کے انگریزی بیان بالکل خاموش ہیں، صرف اتنا بتاتے ہیں کہ اسے بہار سے نکال دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے وہ دیر تک چھاپہ مار جنگ کرتا رہا اور آخر نیپال کی طرف چلا گیا۔ کنور سنگھ کا تیسرا بھائی دل مست سنگھ تھا جو غالباً کنور سنگھ کی وفات اور امر سنگھ کے نیپال چلے جانے کے بعد بھی لڑتا رہا، آخرکار گرفتار ہو گیا اور ۱۸۶۲ء میں اسے انڈیمان بھیج دیا گیا۔[1] غالباً وہیں

---

[1] کشف الاخبار بمبئی ۲۶ فروری ۱۸۶۳ء

اس نے وفات پائی۔

ممتاز رفیق! ڈاکٹر سین نے کنور سنگھ کے خاص رفیقوں میں مندرجہ ذیل اصحاب کا ذکر کیا، امر سنگھ، دت بھجن سنگھ برادر زادہ کنور سنگھ، تحصیلدار ہر کشن سنگھ، نشان سنگھ، دلاور خاں، سرنام سنگھ۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، شاہ آباد کے راجپوت ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہماری قومی بہادری ماضی کا افسانہ نہیں بلکہ اب بھی زندہ و پائندہ ہے۔ یقیناً کنور سنگھ اور امر سنگھ نے اس کے درخشاں ثبوت بہم پہنچا دیئے۔

نواب ممّوں خاں اور جمی گرین

نام اور عہدہ

اصل نام علی محمد خاں تھا لیکن لوگ "ممو خاں" کہتے تھے۔ برجیس قدر مسند حکومت پر بیٹھا تو حضرت محل نے ممو خاں کو دولہ کا خطاب بھی دیا تھا لیکن وہ آخری وقت تک "ممو خاں" ہی کے عرف سے مشہور رہا۔

حضرت محل کی ڈیوڑھی میں داروغہ تھا۔ گویا سارا کاروبار اسی کے ذریعے انجام پاتا تھا۔ مزاج کا ذرا تیز تھا اور خود رائی بھی اس میں بہت زیادہ تھی۔ چونکہ حضرت محل کے کاموں کو ہمیشہ بڑے اہتمام، خلوص اور وفاداری سے انجام دیتا رہا اس لیے خاص معتمد علیہ بن گیا۔

برجیس قدر کی مسند نشینی

برجیس قدر کو مسند حکومت تک پہنچانے میں ممّوں خاں کی کوششوں کو خاص دخل تھا۔ فوج نے پہلے اور شہزادوں کو تجویز کیا، جب ان میں سے کوئی بھی تیار نہ ہوا تو ممو خاں اور شیخ احمد حسین نے راجا جے لال سنگھ نصرت جنگ سے برجیس قدر کا ذکر کیا۔ راجا نے کہا کہ تمام بیگمات اتفاق رائے سے فیصلہ کر دیں تو فوج برجیس قدر کو بھی منظور کرے گی۔ بیگمات متفق نہ ہو سکیں۔ پھر ممو خاں نے راجا سے مل کر یہ صورت پیدا کی کہ فوج کے افسر برجیس قدر کو دیکھ کر اور بات چیت کر کے خود فیصلہ کر لیں۔ چنانچہ اس طرح خاص شرطوں کے ماتحت فیصلہ ہوا جس کی تفصیل حضرت محل کے حالات میں پیش کی جا چکی ہے۔

فیصلے میں شام ہو گئی تھی۔ غروب آفتاب میں صرف چند منٹ باقی تھے۔ اس وقت جلوس کے لیے ساعت نیک کا سوال پیدا ہوا۔ ایک رئیس نے کہا کہ آج شب دوشنبہ اور قمر در عقرب ہے، بہتر ہے، نیک ساعت کا انتظار کیا جائے۔ ممو خاں نے کہا کہ تم حرام میں حجت کی ایک شق نکالتے ہو۔[۱] چنانچہ ساعت کے سعید و غیر سعید ہونے کا سوال خارج از بحث قرار دیا۔ اسی وقت رسم جلوس ادا کی گئی۔

دورِ جنگ آزادی

اس وقت سے ممو خاں کو داروغہ دیوانِ خاص بنا دیا گیا۔ گویا تمام معاملات کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں تھی، اگرچہ فیصلے حضرت محل کے حکم سے ہوتے تھے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ممو خاں نے کئی کمیدانوں کو موقوف کر کے ان کی جگہ اپنے متوسلین رکھے۔ روپے کے لیے بڑی تگ و دو کی۔ امرا اور دوسرے اصحاب سے بھی سختی کے ساتھ خاصی بڑی بڑی رقمیں وصول کیں۔ جب اس بارے میں سختیاں بڑھ گئیں تو مولانا احمد اللہ شاہ نے اس طرز عمل کو غیر مناسب قرار دیا اور اعلان کر دیا کہ ممو خاں جہاں اپنے آدمی تحصیل زر کے لیے بھیجے گا ہم اطلاع ملتے ہی انھیں گرفتار کر لیں گے۔ اس بنا پر ممو خاں نے خود مولانا احمد اللہ شاہ سے بھی لڑائی چھیڑ دی اور مصالح عمومی کا کچھ خیال نہ کیا۔

لکھنؤ سے جانے کے بعد

انگریز لکھنؤ پر قابض ہوئے تو حضرت محل کے ساتھ ممو خاں بھی نکلا۔ خاصی دیر تک اودھ کے شمالی حصے میں جنگ جاری رکھی۔ جولائی یا اگست میں یہ کیفیت تھی کہ حضرت محل اور ان کے ساتھیوں کے پاس ساٹھ ستر ہزار سے کم فوج نہ ہوگی۔ فوج کا بڑا حصہ حضرت محل اور ممو خاں کے ساتھ چوکا گھاٹ میں تھا، جو دریائے گھاگرا کے کنارے فیض آباد سے تھوڑے فاصلے پر ہے۔ باقی فوج رام بخش، بھونا تھ

۱۔ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۲۲۰، ۲۲۶۔

سنگھ، چندا بخش، گلاب سنگھ، نرپت سنگھ، بھوپال سنگھ اور شہزادہ فیروز شاہ کی سرکردگی میں تھی[1]

ستمبر تک صورت حال یہ تھی کہ اودھ کے وسطی حصے میں مشرق سے مغرب تک ایک تنگ خطہ انگریزوں کے قبضے میں تھا اس کے شمال میں حضرت محل، ممو خاں، نرپت سنگھ اور فیروز شاہ آمادہ جنگ تھے۔ اس کے جنوب میں بینی مادھو، بسنت سنگھ، ہری چند اور دوسرے مجاہد سرگرم پیکار تھے۔ ان میں سے ہری چند نے سندیلہ پر بھی حملہ کیا[2]

نیپال کا رُخ جب کوئی امید باقی نہ رہی تو حضرت محل نیپال چلی گئی۔ برجیس قدر بھی ساتھ تھا۔ وہاں جانا نیپال کے فوجی افسروں کی اجازت پر موقوف تھا۔ ممو خاں نے ان افسروں سے بہت نامناسب گفتگو کی تھی اس لیے وہ ممو خاں کو اجازت داخلہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ سید کمال الدین حیدر فرماتے ہیں:

> یہ (ممو خاں) فوج جنگی کے ساتھ رہے۔ جب فوج شکست کھا کر گھبرا کر پہاڑ پر چڑھنے لگی تو سو گھوڑے سواروں کے گر کر مر گئے۔ سیکڑوں اونٹ مع بار عظیم گر کر مر گئے۔

گرفتاری یہ نیپالی افسروں سے نامناسب گفتگو کر ہی چکے تھے، لہٰذا علم کھلا نیپال جانے کی اُمید نہ تھی۔ مجبوراً حضرت محل کی قیام گاہ کے قریب ٹھہرے رہے۔ موقع پایا تو ملازموں کے بھیس میں قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ رانا جنگ بہادر حضرت محل کی ملاقات کے لیے آیا تو اس نے برجیس قدر کو صاف صاف کہہ دیا کہ آپ بہ آرام و راحت جہاں چاہیں رہیں، لیکن باقی لوگوں کو، جن پر بغاوت کا الزام ہے، ہم نہ رہنے دیں گے، اس لیے کہ انگریزوں سے ہمارا عہد نامہ ہے اور ہم انگریزوں کے دشمنوں کو اپنا دشمن اور انگریزوں کے دوستوں کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ گویا ممو خاں کے لیے نیپال میں قیام کی کوئی صورت نہ رہی۔

---

[1] میلی سن جلد پنجم صفحہ ۱۸۹۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۹۹۔

تاہم یہ پھر چپ چاپ اُٹھے اور حضرت محل کی قیام گاہ سے قریب ایک گھاٹی میں جا ٹھہرے۔ پھر رانا جنگ بہادر کے بھائی نے انھیں اپنی نگرانی میں لے لیا۔ خود جنگ بہادر آیا تو ممو خاں سے پوچھا کہ آیا کسی میم یا صاحب کو اپنے ہاتھ سے بھی مارا ہے؟ ممو خاں نے نفی میں جواب دیا۔ جنگ بہادر نے کہا کہ پھر مطمئن رہیے۔ اس اثناء میں ایک انگریز افسر آ گیا اور جنگ بہادر کی اجازت سے ممو خاں کو گرفتار کر کے لکھنؤ لے گیا۔

بتاریخ ۲۱۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۶ھ بروز دو شنبہ (۱۷۔ دسمبر ۱۸۵۹ء) ممو خاں جیل خانے میں داخل ہوا۔ شیخ سکھن رسالدار بھی ساتھ ہی گرفتار ہوا تھا[1] گویا ممو خاں نے حضرت محل کے داخلۂ نیپال کے بعد قریباً ایک سال نیپال یا اس کے حوالی میں گزارا۔

مقدمہ اور سزا

مقدمہ پیش ہوا تو ممو خاں نے بڑے اچھے جوابات دیے۔ بہت سی چٹھیاں بھی دکھائیں، جن سے واضح ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کا بدخواہ نہ تھا۔ پھر اسے جیل خانے سے نکال کر فرح بخش کے ایک کمرے میں رکھا گیا۔ خرچ کے لیے کچھ روپیہ مقرر ہو گیا اور خدمت گار بھی ساتھ رہنے لگے۔ کئی مہینے کی پیشیوں کے بعد پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ جارج کیمبل کے پاس اپیل ہوئی تو اس نے موت کی سزا کو انڈیمان میں قید کی سزا سے تبدیل کر دیا۔ چنانچہ ممو خاں کو انڈیمان بھیجا گیا۔ راستے میں جہاز سے اُتر کر بھاگا مگر پکڑا گیا اس وجہ سے اس کی سزا حبس دوام کی شکل اختیار کر گئی۔[2]

آخری دور

مولوی محمد جعفر تھانیسری ۱۸۶۶ء میں انڈیمان پہنچے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جس زمانے میں کرنیل فورڈ انڈیمان کا سپرنٹنڈنٹ تھا:

> پچاس نفر قیدیان بغاوت واسطے مدد راجا بروکس صاحب کے ۲۱۔ جنوری ۱۸۶۶ء کو جزیرہ سراوک بھیجے گئے کہ ان میں نواب ممو خاں

۱؎ قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۶۷۔ ۲؎ ایضاً ص ۳۶۸، ۶

> نائب بیگم صاحبہ والدہ برجیس قدر بھی تھے کہ مراوک میں جاکر فوت ہو گئے۔[1]

گویا نواب ممو خاں کی حیات اسیری کے قریباً پانچ سال انڈیمان میں بسر ہوئے، پھر وہ مراوک چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ صحیح تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔

جیمی گرین

اصل نام محمد علی خاں تھا کہتے ہیں کہ نواب نجیب الدولہ مرحوم کا پوتا تھا۔ بریلی میں تعلیم پائی۔ رڑکی سے انجینیری کا امتحان پاس کیا۔ اگرچہ امتحان میں انگریزوں سے بھی زیادہ نمبر حاصل کیے تھے مگر ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ملازمت بہت معمولی ملی۔ پھر ایسے افسر سے سابقہ پڑا جو انجینیری میں معمولی حیثیت کا مالک تھا آخر استعفیٰ دے کر جیمی گرین اودھ پہنچا۔ اس زمانے میں نیپال کا مختار جنگ بہادر ولایت جا رہا تھا، اسے ایک انگریزی داں سیکرٹری کی ضرورت تھی۔ محمد علی خاں کو انگریزی میں خاص کمال حاصل تھا چنانچہ مہاراجا کے ساتھ ولایت گیا۔ دوبارہ عظیم اللہ خاں کے وفد میں شریک ہو کر ولایت کا سفر اختیار کیا جسے نانا نے پنشن کے سلسلے میں بھیجا تھا۔ عظیم اللہ خاں کے ساتھ طلب علم کے زمانے سے بڑے گہرے تعلقات تھے۔

۱۸۵۷ء میں جیمی گرین لکھنؤ پہنچا اور وہاں حضرت محل کی حکومت میں چیف انجینیر مقرر ہوا۔ انگریزی فوج کا حال معلوم کرنے کے لیے بھیس بدل کر کانپور گیا۔ فوج میں پھیری کرتا ہوا گرفتار ہوا اور جاسوسی کے جرم میں پھانسی کی سزا ملی۔[2] وہ عموماً اصل نام (محمد علی خاں) سے نہیں بلکہ اختیار کردہ نام جیمی گرین سے مشہور ہے۔

---

[1] تاریخ عجیب ص ۲۴۳-۲۴۲ [2] ماخوذ از العلم ۔ جنگ آزادی نمبر

مولانا پیر علی اور سیّد اکبر زماں

پیر علی خاں لکھنوی

اصل وطن لکھنؤ تھا۔ غالباً کسی خفیہ جماعت کی طرف سے قومی تنظیمات کے سلسلے میں پٹنہ بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں کتابوں کی دوکان کھول لی، تاکہ یہ مشغلہ پٹنہ میں اقامت کے لیے جس پیشہ لوگوں کے لیے سوءِ ظن یا توجہ کا مرکز نہ بن جائے اور اس طرح بھید نہ کھل جائے۔ اصل کام یہی تھا کہ انگریزوں کے خلاف اچھے اور سرگرم کارکن پیدا کریں اور ان کے ذریعے سے قومی تحریک کو جا بجا پھیلایا جائے۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں پیر علی خاں زیادہ دولت مند بھی نہ تھا اور مخلص کارکن زیادہ تر اسی حلقے میں سے اٹھتے ہیں، جن کے مالی وسائل چنداں قابلِ ذکر نہیں ہوتے، اس لیے کہ درد و احساس کی طبعی دولت ایسے ہی قلوب میں محفوظ رہتی ہے، جن کی جیبیں ہلکی ہوں اور سامانِ راحت زیادہ وقیع نہ ہو۔

۳۔ جولائی ۱۸۵۷ء

ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ پیر علی خاں نے کب سے پٹنہ میں کام شروع کیا اور اسے کس حد تک پورا کر سکے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا، جس نے تنظیم و تیاری کے لیے کوئی موقع باقی نہ چھوڑا۔ انگریزی بیانات مظہر ہیں کہ ۳۔ جولائی ۱۸۵۷ء کو پیر علی خاں نے کوئی دو سو دیندار مسلمان جمع کیے اور خود سبز جھنڈا لے کر ان کے آگے چلا۔ ڈھول یا نقارہ بجا کر اعلان کر رہا تھا کہ مسلمانو اٹھو اور میرا ساتھ دو۔ کیتھولک گرجے کا رُخ تھا جو شہر کے عین اندر واقع تھا۔ کمشنر نے یہ خبر سنی تو ایک انگریز کپتان کو

ڈیڑھ سو سکھوں کے ہمراہ پیر علی خاں اور اس کے رفیقوں کی روک تھام کے لیے بھیج دیا اور خود انگریزوں کی حفاظت میں سرگرم عمل ہو گیا۔

ڈاکٹر لی ایل

اس اثنا میں افیون کے ایک انگریز ایجنٹ ڈاکٹر لی ایل[1] کو خیال آیا کہ لوگ یونہی تماشے کی غرض سے جمع ہو گئے ہیں۔ وہ کسی انگریز کی صورت دیکھیں گے تو فوراً منتشر ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور مجمع کے قریب پہنچ گیا۔ اسے دیکھتے ہی مجمع کی طرف سے گولیوں کی باڑ آئی۔ ایک گولی ڈاکٹر لی ایل کا کام تمام ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی نعش اس طرح بگاڑ دی گئی کہ کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔

سکھوں کی آمد

بعد میں جو کچھ پیش آیا، وہ میلی سن کی زبان سے سنیے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ انگریز ۱۸۵۷ء میں بھی تفرقہ پردازی اور اختلاف انگیزی پر کس اہتمام سے کاربند تھے۔ انگریز کپتان سکھوں کو لے کر موقع پر پہنچا:

> مقابل فریقوں (مسلمانوں اور سکھوں) کے درمیان نہ صرف کوئی ہمدردی ہی نہ تھی بلکہ نسل اور مذہب کی منافرت حائل تھی۔ ایک طرف عصبیت کی وہ روح تھی جو ابھی ابھی پیدا ہوئی تھی۔ دوسری طرف بہت سی پوشیدہ بے حرمتیوں کا بدلہ لینے کا موقع آیا تھا جس کی آرزو مدت سے کی جا رہی تھی۔ جو کچھ پیش آیا، اس کے متعلق سوچ لینا بس کرتا ہے۔ صلح کی بات چیت کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مقابل فریق آناً فاناً بکھر گئے چند ہی لمحوں میں سکھوں کی منظم قوت اور بندوقوں نے اس سرکشی کو فرو کر دیا، جو مدت سے پٹنہ کے لیے باعث خطرہ بنی ہوئی تھی۔[2]

---

۱ LYELL

۲ میلی سن جلد سوم صفحہ ۲۶ - ۲۷ ۹

گرفتاریاں اور سزائیں

چوتھی اور پانچویں جولائی کو تلاشیاں شروع ہوئیں تاکہ ہنگامے کے بڑے بڑے لیڈر گرفتار کر لیے جائیں۔ اکتیس آدمی گرفتار ہوئے۔ ان میں پیر علی خاں بھی تھا۔ اس کے علاوہ شیخ گھسیٹا گرفتار ہوا، جو پٹنہ شہر کے سب سے بڑے سیٹھ لطف علی خاں کا ملازم تھا۔ اکتیس آدمیوں میں سے چودہ مجرم قرار پائے اور انھیں بے تامل موت کی سزا دے دی گئی۔ ان میں وارث علی بھی تھا جو پولیس میں عہدیدار تھا اور اسے ترہٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔

بہت سے لوگوں کو قید اور تازیانے کی سزائیں دی گئیں۔ جب ٹیلر کو پٹنہ سے بدلا گیا تو اس کے جانشین نے صرف قید اور تازیانے کی سزائیں پانے والوں کے کاغذات نظامت عدالت میں بھیجے۔ غور و فکر کے بعد فیصلہ ہوا کہ گواہوں کے بیانات سزاؤں کے لیے ہرگز کافی نہ تھے۔ اصل میں ٹیلر نے اندھا دھند سب کو من مانی سزائیں دلادی تھیں وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ جرح اور عدالتی آداب کے تکلفات ملحوظ نہ رکھے گئے۔ اگر رکھے جاتے تو پٹنہ کے مسیحوں کا حشر خدا جانے کیا ہوتا۔ ٹیلر جن اکیس قیدیوں کو موت کی سزا نہ دلا سکا تھا، ان سب کو نظامت عدالت نے رہا کر دیا۔

گویا پٹنہ میں اندھا دھند تعزیر و سزا کا سلسلہ ٹیلر نے شروع کیا تھا جو کشتہ تھا اور جس کے پیش نظر "مسیحوں" کی حفاظت تھی۔ یہی ٹیلر تھا جس نے ۱۸۶۵ء میں ان مجاہد مسلمانوں کو خوفناک سزائیں دلوائیں جو ہمارے ہاں "وہابی" مشہور ہوئے۔

میلی سن نے لکھا ہے کہ وارث علی کو پھانسی دینے کے لیے لے جا رہے تھے تو اس نے پکار کر کہا کہ اگر کوئی شخص شاہ دہلی کی دوستی کا دم بھرنے والا موجود ہو تو سامنے آئے اور مجھے چھڑائے۔[1]

---

[1] میلی سن جلد سوم صفحہ ۲۳۷۔

ان تفصیلات پر تبصرہ غیر ضروری ہے۔ جب سراسیمگی پیدا ہوتی ہے تو سیکڑوں آدمی کامیاب گروہ کی تائید کے لیے سامنے آجاتے ہیں اور الٹی سیدھی گواہیاں دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جب حالات برعکس صورت اختیار کر لیں۔ تو اسی بے تکلفی سے مخالف بھی بن جاتے ہیں۔

پیر علی اور شیخ گھسیٹا

پیر علی خاں اور شیخ گھسیٹا کو ان چودہ آدمیوں میں شامل نہ کیا گیا تھا جنھیں چوتھی یا پانچویں جولائی کو پھانسی دی گئی تھی، اس لیے کہ خیال تھا یہ بڑے کارکن ہیں اور ان سے دوسرے "سازشیوں" کے نام یا "سازش" کی تفصیلات معلوم ہو جائیں گی۔ شیخ گھسیٹا کا بیان ہمارے سامنے نہیں۔ پیر علی خاں سے جب پوچھا گیا کہ اپنے ساتھیوں کے نام بتادو تو اس نے بے توقف جواب دیا:

> زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جن میں جان بچا لینا کار ثواب ہوتا ہے، ایسے موقعے بھی آتے ہیں جن میں جان عزیز دے ہی دینا سب سے بڑی نیکی گنی جاتی ہے۔ تم مجھے پھانسی دے سکتے ہو۔ مجھ ایسے اور آدمیوں کی بھی جانیں لے سکتے ہو، لیکن اس سرزمین سے ہزاروں آدمی تمھارے خلاف اٹھتے رہیں گے اور اطمینان سے حکومت کرنے کا جو مقصد تمھارے سامنے ہے، وہ کبھی پورا نہ ہو سکے گا۔

غور طلب نکتہ

پیر علی خاں زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا اور زیادہ تجربہ کار بھی غالباً نہ ہو۔ اس کی بہادری اور اخفائے راز میں اہتمام کا معاملہ بھی ذہن نشین ہو سکتا ہے، کیونکہ ان اوصاف کے لیے کتابی علم کی ضرورت نہیں، لیکن دیکھیے، اس نے کتنا اچھا اور کتنا عمدہ نکتہ بیان کر دیا، جسے باطل کی بقا و فنا کے سلسلے میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ پیر خاں نے کیوں کہا کہ انگریزوں کے لیے اطمینان سے حکومت کرنے کا موقع قطعاً

نہ آئے گا اور لوگ ان کے خلاف اُٹھتے رہیں گے ؟ اس لیے کہ وہ جانتا تھا ، اجنبی حکومت کا وجود بلا شبہ غیر طبعی ہے اور اہل ملک اسے زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکیں گے ۔ وہ برابر اُٹھتے رہیں گے یہاں تک کہ یہ شیش محل ریزہ ریزہ ہو جائے گا ۔

جس حکومت کی بنیاد عوام کی رائے ، مرضی اور صواب دید پر قائم و استوار نہ ہو ، وہ کتنی ہی تدبیریں اختیار کرتی جائے ، لیکن قائم نہ رہ سکے گی اور اس کا شیرازہ ضرور درہم برہم ہو جائے گا ۔ عوام میں جتنی بیداری پیدا ہو گی اسی تناسب سے اجنبی یا نامرغوب حکومت کے لیے خطرہ بڑھے گا ۔ یہ زندگی کے بنیادی حقائق ہیں ، لیکن بہت کم لوگ ہیں ، جنھیں ان کا احساس ہو ۔ خصوصاً اقتدار کا نشہ ، جسے دراصل خمار سے تعبیر کرنا چاہیے آنکھوں پر ایسی پٹی باندھ دیتا ہے کہ حقیقت نظر آ ہی نہیں سکتی ۔ اس اندھے پن کی مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی طرف اشارے کی بھی ضرورت نہیں ۔

پھر دیکھیے کہ زندگی کے متعلق پیر علی خاں نے سادہ لفظوں میں وہی بات کہہ دی ، جسے حضرت علامہ اقبال نے یوں پیش فرمایا :

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

یعنی بعض اوقات جان بچا لینا ہی اصل کام ہوتا ہے ، لیکن بعض اوقات جان دیے بغیر انسان اپنے انسانی فرائض ادا نہیں کر سکتا ۔

دریافت کردہ امور

مقدمے میں جو امور دریافت ہوئے ، ان میں سے ایک یہ تھا کہ پیر علی خاں ہی دراصل پٹنہ میں سب سے بڑا کارکن تھا ۔ وہی انگریزوں کے خلاف نفرت و حقارت کی آگ بھڑکاتا رہا :

وہ اور شیخ گھسیٹا جنھوں نے بے شمار آدمیوں کو تنخواہیں دیتے رہے تاکہ جب اُنھیں دین کے لیے اور شاہ دہلی کے لیے

جنگ کی غرض سے بلایا جائے تو وہ فوراً تیار ہو کر آجائیں۔
اس کام کے لیے بہت سے روپے کی ضرورت تھی۔ پیر علی
غریب آدمی تھا۔ اس کا رفیق کار گھسیٹا دراصل بہت بڑے
سیٹھ کا ہاتھ تھا۔ پس اگرچہ بہ آسانی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ سیٹھ
بھی اس کام میں شریک تھا۔ لیکن فی الوقت اس کے خلاف
کوئی کارروائی نہ کی گئی۔[1]

سیٹھ لطف علی خاں کے خلاف بعد میں اس بنا پر مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے ایک "باغی" سپاہی کو پناہ دی تھی، لیکن ناکافی ثبوت کی بنا پر وہ بری ہو گیا۔

پیر علی کا اعتراف

ابھی بتایا گیا ہے کہ پیر علی خاں نے جن باتوں کا اقبال کیا، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ تیاری کا پورا موقع نہ مل سکا۔ کمشنر نے جو شدید انسدادی تدبیریں اہتمام اور سختی سے اختیار کی تھیں، ان کی وجہ سے پوری تیاری کے بغیر میدان عمل میں آنا پڑا۔ اگر کمشنر انسدادی تدبیریں شدت اور سختی سے اختیار نہ کرتا تو "سازش" آہستہ آہستہ پختہ تر اور وسیع تر ہوتی جاتی۔ اس وقت دانا پور کی فوج سرکشی اختیار کرتی تو حالات یقیناً خاصے خطرناک ہو جاتے۔

سزائے موت

بالآخر پیر علی خاں اور شیخ گھسیٹا کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی۔ پیر علی خاں ۴۔ جولائی کو مجروح ہو چکا تھا۔ سنگدل انگریزوں نے اس کے علاج معالجے اور مرہم پٹی کا بھی چنداں خیال نہ کیا اور بدستور بیڑیاں پہنائے رکھیں۔ سزائے موت سن لینے کے بعد اس نے انگریز حاکم سے صرف چند سوالات کیے، جو مع جوابات ذیل میں درج ہیں:

---

[1] ملیسن جلد سوم صفحہ ۳۰۔

پیر علی خاں : "میرے مکان کے متعلق تمھارا فیصلہ کیا ہے ؟"

انگریز حاکم : "اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی"

پیر علی خاں : "میری جایداد کے بارے میں کیا حکم جاری کر رہے ہو ؟"

انگریز حاکم : "وہ ضبط کر لی جائے گی"

پیر علی خاں : "میرے بال بچوں کے بارے میں تم نے کیا تجویز کیا ہے" ؟

انگریز حاکم : "فی الحال کچھ نہیں کیا جا سکتا اور نہ کوئی وعدہ کیا جا سکتا ہے"

پیر علی خاں نے جو جرم کیا تھا، اس کے لیے انگریزوں نے سزا دے کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ اس کے مکان یا اہل و عیال نے کیا گناہ کیا تھا؟ مکان ڈھانے اور جایداد ضبط کرنے کا مطلب یہ تھا کہ بال بچے بے یار و مددگار رہ جائیں۔ کیا پیر علی کے جرم کی سزا انھیں دینا جائز تھی؟ کیا لاٹ نزدا مزرۃ وزر اخری کا اصول حق و انصاف کی اساس نہ تھا؟

پیر علی خاں یہ جواب سنتے ہی کسی گھبراہٹ یا پریشانی یا جزع فزع کے بغیر پھانسی کے لیے روانہ ہو گیا۔

میل سن نے لکھا ہے کہ پیر علی خاں دینی حمیت اور انگریزوں سے نفرت میں خاص شہرت کا مالک تھا۔

ڈاکٹر سین نے لکھا ہے کہ پیر علی خاں کے گھر سے ایک خط برآمد ہوا تھا، جس کا مضمون یہ تھا کہ شہر کے بعض معزز افراد قید میں ہیں۔ حکومت نے جو ظلم و جور شروع کر رکھا ہے، اس سے رعایا تنگ آ گئی ہے اور سب لوگ حکومت پر لعنت بھیج رہے ہیں[1]

سید اکبر زماں

سید اکبر زماں اکبر آبادی، بن سید امیر زماں، نبیرہ سید حسین زماں، فارسی اور عربی میں دستور کے مطابق تعلیم پائی۔ شعر گوئی کا بھی

---

[1] ڈاکٹر سین کی کتاب صفحہ ۲۵۰

ذوق تھا۔ مجید تخلص کرتے تھے۔ کچھ دیر آگرہ کالج میں مدرس رہے۔ پھر ہیڈ مولوی ہو گئے۔ بعد ازاں اُنھیں آگرہ کے فوجی محکمے میں میر منشی کا عہدہ مل گیا۔ ۱۸۵۷ء میں اسی عہدے پر مامور تھے۔

طبیعت میں آزادی کا جوش تھا۔ ہنگامہ شروع ہوا تو جس حد تک ممکن ہو سکا، مجاہدین آزادی کی امداد کی، پھر اندور چلے گئے۔ آگرہ میں امن قائم ہو جانے کے بعد آئے، تو ان پر مقدمہ چلایا گیا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی۔

انڈیمان کی زندگی انڈیمان پہنچے تو وہاں پنڈت سالگ رام ہیڈ کلارک لگے ہوئے تھے۔ وہ سید اکبر زماں کے چچا سید منور زماں کے دوست تھے۔ جب پنڈت جی کو سید اکبر زماں کے حالات معلوم ہوئے تو اُنھیں فوراً اپنی پیشی میں لے لیا۔ بعد ازاں سید صاحب اتنے با اختیار ہو گئے کہ انڈیمان میں اُن کے برابر کوئی نہ تھا۔ تنخواہ بھی خاصی ملتی تھی۔

۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۵ء کے مقدمات میں جو علمائے کرام انڈیمان بھیجے گئے تھے۔ مثلاً مولانا احمد اللہ صادق پوری، ان کے بھائی مولانا یحییٰ علی، ان کے بھانجے مولانا عبدالرحیم، مولانا محمد جعفر تھانیسری وغیرہ، سید اکبر زماں نے ان کی خدمت اور راحت رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور انڈیمان کو ان کے لیے زیادہ سے زیادہ خوش گوار بنا دیا۔ روپیہ بھی بہت پیدا کیا۔

مراجعت بیس سال کی قید پوری کر کے واپس ہوئے تو جو کچھ انڈیمان میں کمایا تھا، وہیں چھوڑا، آگرہ آکر خوش ہو زندگی گزارنے لگے۔ آخر میں وہ آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔[1]

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۴۲۔

مولانا فیض احمد، مولانا کافی اور حکیم سعید اللہ

بدایوں کا ایک مرکز علم و فضل

جنگ آزادی کے نامور مجاہدوں میں سے ایک مولانا فیض احمد کے باب میں پادری فنڈر کے ساتھ بمقام آگرہ مناظرہ مذہبی کے تعلق میں آچکا ہے۔

عثمانی بدایونی بھی تھے، جن کا نام مولانا رحمت اللہ اور ڈاکٹر وزیر خاں کے باب میں یوں آچکا ہے کہ آگرہ میں پادری فنڈر کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں کی اعانت کے لیے مولانا فیض احمد بھی مقرر ہوئے تھے۔ مولانا کا سلسلۂ نسب یہ ہے: مولانا فیض احمد بن حافظ حکیم غلام احمد، بن مولانا شمس الدین، بن مولانا محمد علی،

ان کا تعلق بدایوں کے اس خاندان سے تھا جو صدیوں سے علم و فضل کا مرجع چلا آتا ہے اور اس سے متعدد ممتاز علما پیدا ہوئے۔ مولانا کے بزرگوں میں سے مولوی مرید محمد بن عبد الشکور نے عہد عالمگیری میں نانگہ قوم سے جہاد کیا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ نانگہ قوم نے موررج کنڈ (بدایوں) میں ایک مسجد شہید کر ڈالی تھی، جس کی نسبت مشہور تھا کہ وہ عہد غزنوی میں تعمیر ہوئی تھی، مولوی مرید محمد اگرچہ درس و تدریس میں مشغول تھے تاہم جب انھیں اس دردناک واقعے کا علم ہوا تو طلبہ کو لے کر نکلے، مفسدین کو سزا دی اور مسجد دوبارہ تعمیر کر دی۔

اجداد

مولانا فیض احمد کے جد اعلیٰ مولانا محمد علی بڑے بلند پایہ عالم تھے۔ انھیں لوگ بحر العلوم کہتے تھے۔ انھوں نے قاضی خان دہلوی اور قاضی مبارک گوپاموی سے منقول و معقول کی تعلیم پائی اور ایک مدت تک دہلی و بدایوں میں درس دیتے رہے۔ آصف الدولہ والی اودھ نے انھیں موضع شادی پور اور چند مزید قطعات اراضی کی سند دی تھی۔ مولانا فیض احمد کے صاحبزادے حکیم سراج الحق کے زمانے تک ان پر قبضہ رہا۔ ۱۷۸۰ء میں مولانا محمد علی نے لکھنؤ میں وفات پائی مگر جنازہ بدایوں لایا گیا اور انھیں عیدگاہ شمسی کے شمالی جانب دفن کیا گیا۔

ان کے صاحبزادے مولانا شمس الدین کو فقہ میں کمال دستگاہ حاصل تھی۔ حکومت اودھ کی طرف سے ان کے لیے بھی معافیوں کا بندوبست ہو گیا تھا، افسوس کہ وہ والد سے ایک سال پیشتر ۱۷۸۱ء میں واصل بحق ہوئے۔

مولانا حکیم غلام احمد نے معقول و منقول کے علاوہ طب کی بھی باقاعدہ تعلیم پائی۔ اعلیٰ درجے کے طبیب ہونے کے علاوہ خوش نویسی اور تیر اندازی میں کمال حاصل تھا۔ مرشد آباد میں نواب کے پاس ملازم ہو گئے تھے۔ وہیں ۵۔ ذی الحجہ ۱۲۲۶ھ (۲۱۔ دسمبر ۱۸۱۱ء) کو وفات پائی۔

ابتدائی زندگی

حکیم غلام احمد کی شادی مولانا فضل رسول بدایونی صاحب سوانح الرحمانؒ کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ مولانا فیض احمد ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے۔ مقام ولادت مولوی محلہ تھا۔ کم و بیش تین سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ ماموں نے بڑی محبت اور ناز و نعمت سے پالا اس لیے بھی ان سے بڑھ کر قریب تر رشتہ دار کوئی نہ تھا اور اس لیے بھی کہ خود مولانا فضل رسول کے والد کو مولانا فیض احمد کے جد امجد مولانا محمد علی نے پالا تھا۔[1]

---

[1] تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۱۳۲، ۱۳۳

چونکہ حافظہ بہت اچھا تھا۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے، اس کے مطالب ذہن میں محفوظ ہو جاتے تھے، اس لیے چودہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے اور پندرھویں سالگرہ پر مولانا فضل رسول نے درس کی اجازت دے دی۔ علوم کے علاوہ خطاطی میں بھی کمال حاصل کر لیا تھا اور شعر گوئی کا بھی ذوق تھا۔ رسؔوا تخلص اختیار کیا تھا۔ مولانا فضل رسول ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ فیض میری ہمشیرہ کا بچہ ہے۔ وہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ میرے دل کا نور ہے، میرے دل کا ٹکڑا ہے، میرے بازو کی قوت ہے۔ وہ انسانی کمالات کا جامع ہے۔ علوم مروجہ میں تمام معاصرین پر سبقت لے گیا ہے، علاوہ بریں اسے محبان و محبوب خدا کے ساتھ صحیح عقیدت و محبت ہے۔

سرکاری ملازمت

مولانا فیض احمد نے اپنے نانا، مولانا عبدالمجید بدایونی سے بیعت کی تھی[1]۔ ابتدا میں درس دیتے رہے اور بہت سے لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ان کے تلامذہ میں سے ایک سید احمد حسن عرشی قنوجی بھی تھے جو نواب صدیق حسن خاں (امیر الملک والا جاہ) کے بڑے بھائی تھے۔ پھر سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ اس دور میں بھی درس کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا، مثلاً قیام آگرہ کے دوران میں سید اولاد علی اکبر آبادی اور مولوی باسط علی نے مولانا فیض احمد سے تعلیم پائی۔ اس زمانے میں ولیم میور نے عربی پڑھی۔ چونکہ عوام میں آپ کو خاص احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقدمات میں ثالث و مصلح بھی بنتے رہے۔

کچھ معلوم نہیں کہ ملازمت کا آغاز بدایوں سے ہوا یا شروع ہی میں آگرہ چلے گئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے آپ مثل خواں مقرر ہوئے تھے، پھر پیشکار بن گئے، آخری ایویو بورڈ کے سررشتہ دار بنا دیے گئے۔ چونکہ مولانا فرائض منصبی بڑی راستبازی، دیانت، مستعدی اور محنت سے انجام دیتے تھے، اس لیے انگریز افسران کی بہت قدر کرتے تھے۔

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص۱۶۲

آگرہ میں مناظرہ

آگرہ میں اس وقت حسن اتفاق سے علمائے کرام کا ایک گروہ جمع ہو گیا تھا اور وہ عموماً مفتی انعام اللہ خاں صاحب وکیل سرکار کے مکان پر اکٹھے ہوتے تھے۔ تمام لوگ مخلص اور دلدادہ تھے، یقیناً ان میں مسلمانوں کی حالت زار کے متعلق بحثیں اور مذاکرے ہوتے رہتے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ ملکی اور قومی نقطۂ نگاہ سے مسائل و معاملات پر غور و فکر کی ابتداً انھیں مباحث و مذاکرات سے ہوئی۔ پھر مولانا احمد اللہ شاہ مدراسی آ گئے۔ ان کی تو ہر چیز سیاست میں رنگی ہوئی تھی اور علماء کے اس مجمع میں احمد اللہ شاہ نے خاصا اثر و رسوخ پیدا کر لیا۔

مولانا آگرہ ہی میں تھے کہ پادری فنڈر سے مشہور تاریخی مناظرہ ہوا، جس میں موصوف، مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں کے معاون تھے۔ اس کی تفصیل پہلے پیش کی جا چکی ہے اور یہاں اسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

جامع مسجد آگرہ

بیان کیا جاتا ہے کہ نالائق متولیوں نے جامع مسجد آگرہ کی دکانیں بنیوں کے پاس رہن رکھ دی تھیں اور اوقاف کی آمدنی خود اڑاتے تھے۔ مسجد کی انتظامی حالت بڑی خراب تھی۔ مولانا فیض احمد نے کلکٹر کو اس طرف متوجہ کیا تو اس نے حالات پر افسوس ظاہر کیا، ساتھ ہی بتایا کہ قانوناً دخل دینے کی کوئی صورت نہیں۔ مولانا فیض احمد ہی نے یہ تجویز پیش کی کہ بنیوں کی اصل رقم مع سود جوڑ لی جائے اور جب سے دکانوں پر ان کا قبضہ ہے، اس وقت سے مروجہ شرح کے مطابق کرایہ لگا لیا جائے۔ اس تجویز پر عمل ہوا تو دکانیں واگزار ہو گئیں بلکہ مسلمانوں کا کچھ روپیہ بمد کرایہ بنیوں کی طرف نکلا۔

یہ ہو چکا تو مسجد کی مرمت کرائی گئی، لوگ خاص مسجد میں جو سوت کی رسیاں بٹتے تھے، انھیں روک دیا گیا اور انتظام کے لیے ایک مجلس بنا دی گئی۔

۱۸۵۷ء

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوا تو مولانا فیض احمد آگرہ ہی میں تھے۔ مجاہدانہ سرگرمیوں کے مفصل حالات معلوم نہ ہو سکے۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ مولانا موصوف

ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ دہلی گئے۔ وہاں نظم جہاد کا شیرازہ درہم برہم ہوا تو جنرل بخت خاں کے ساتھ لکھنؤ کی طرف چلے گئے۔ پھر احمد اللہ شاہ کے ساتھ شریک رہے۔ شاہ جہاں پور، بریلی، بدایوں، محمدی وغیرہ میں لڑتے بھڑتے رہے۔ کچھ مدت شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ بھی گزاری۔ پھر ڈاکٹر وزیر خاں تو غالباً شہزادے کے ساتھ ہو گئے، مولانا فیض احمد اسی حصے میں رہے۔

انجام انجام کے متعلق بیانات میں اختلاف ہے۔ بعض بیانات مظہر ہیں کہ ۱۲۷۳ھ میں انھوں نے اپنی جان فی سبیل اللہ وقف کر دی۔" بوارق محمدیہ[1] کے خاتمہ میں ہے کہ ۱۲۷۴ھ میں جاں بحق ہوئے۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، یہ سب قیاسی اور تخمینی باتیں ہیں حقیقت حال کا کسی کو علم نہیں۔ بس احمد اللہ شاہ کے آخری معرکے تک قابل اعتماد معلومات ملتی ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر وہ روپوش رہے تو نیپال کی طرف چلے گئے ہوں گے، وہاں سے ان کے متعلق کوئی یقینی اطلاع مل ہی نہ سکتی تھی، اگر ۱۲۷۴ھ میں شہادت ہوئی یا کسی بیماری میں انتقال ہوا تو عمر زیادہ نہ تھی۔

اس زمانے میں ایسی اطلاعات بھی ملی تھیں کہ وہ زندہ ہیں اور قسطنطنیہ یا حجاز پہنچ گئے ہیں۔ مولانا فضل رسول نے خاص ان کی تلاش میں ممالک اسلامیہ کا سفر اختیار کیا اور قسطنطنیہ تک گئے مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو میدان جنگ میں شہید ہوئے یا غربت کی حالت میں کسی بیماری سے انتقال کیا۔

اولاد مولانا کی شادی مولانا فضل رسول کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان سے صرف ایک صاحبزادہ ۲۰۔ رمضان المبارک ۱۲۴۶ھ (۴۔ مارچ ۱۸۳۱ء) کو پیدا ہوا، جن کا نام سراج الحق تھا۔ وہ طبیب بھی تھا۔ ۸ ذی قعدہ ۱۳۲۳ھ (۴۔ جنوری ۱۹۰۶ء)

---

[1] بوارق محمدیہ، طبع سول ملٹری آرٹیفیشل صفحہ ۱۴۳۔

کو انتقال کیا۔ ان کے ایک صاحبزادے منیر الحق تھا جو ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں والد کے ساتھ حج کے لیے گیا، اور اٹھارہ سال کی عمر میں بمقام مکہ معظمہ وفات پائی۔ البتہ حکیم سراج الحق کی صاحبزادوں سے سلسلہ چلا۔ ان کے صاحبزادے ظہور الحق کراچی میں ہیں۔ حکیم سراج الحق نے آخر میں حکیم افتخار الحق کو اپنی آغوش تربیت میں لے لیا تھا۔ وہ بڑے نامی طبیب ہوئے لکھنؤ میں مطب کرتے رہے۔ پھر الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی۔ وہیں وفات پائی۔

تصانیف اگرچہ مولانا فیض احمد کو اطمینان سے علمی کام جاری رکھنے کا موقع نہ ملا لیکن ان کی کئی تصانیف کا ذکر ہوا۔ مثلاً رسالہ تعلیم الجاہل جو شاہ اسحاق دہلوی کے رسالے تعلیم المسائل کے جواب میں تھا۔ حاشیہ شرح ہدایۃ الحکمت، فصوص الحکم فارابی پر تعلیقات۔ مجموعہ نثر و قصائد عربیہ موسوم بہ ہدیہ قادریہ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں ایک ہزار ایک سو گیارہ فقرے اور ایک ہزار ایک سو گیارہ شعر ہیں۔[1]

مولانا کفایت علی کافی مولانا کفایت علی کافی کا اصل وطن مراد آباد تھا۔ جہاں ۱۹۔ مئی ۱۸۵۷ء کو ہنگامے کی ابتدا ہوئی تھی اور جیل خانہ توڑ کر قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا۔ سید گلزار علی ساکن امروہہ مراد آباد کی عدالتوں میں مختار تھے۔ وہ پہلے امروہہ پہنچے ایک عرضداشت دہلی بھیجی، پھر اودھ چلے گئے۔ روپوش رہے اور اسی حالت میں وفات پائی۔

دوسرے مجاہدوں کے علاوہ مولانا کفایت علی کافی نے بھی جہاد آزادی میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ سرجان کراکرافٹ ولسن[2] وہاں کا کلکٹر تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اسے عوام میں وسیع رسوخ حاصل ہے۔ بایں ہمہ ۲۔ جون کو حالات بگڑے۔ ولسن نے پھر پھرا کر اپنے ہم وطنوں اور

---

[1] زیادہ تر حالات محمد ایوب صاحب قادری کی مختصر سی کتاب سے ماخوذ ہیں جس کا نام ہے "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ایک مجاہد، مولانا فیض احمد بدایونی"۔ جا بجا اس کے حوالے نہیں دیے گئے۔

[2] JOHN CRACROER WILSON

ہم مذہبوں کی جانیں بچائیں، لارڈ کیننگ نے بعد میں لکھا کہ ولیانی کے کسی افسر نے ولسن کے[1] بار بار سپیوں کی جانیں بچائیں۔ بعد میں وہ نیوزی لینڈ چلا گیا تھا اور وہاں کے ایوان نمائندگان کا ممبر بنا رہا۔ ۱۸۸۱ء میں وفات پائی۔ مولانا کفایت علی کی سرگرمیوں کے زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ مراد آباد میں انھیں صدر الصدور بنا دیا گیا تھا اور آپ نے شرعی احکام جاری کیے۔ آنولہ (ضلع بریلی) بھی گئے اور وہاں حکیم سعید اللہ کے پاس ٹھہرے۔ اس اثناء میں نشر و تبلیغ جہاد کا سلسلہ جاری رکھا۔[2]

معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جان بچ گئی۔ کچھ معلوم نہیں کب وفات پائی۔ ایک بیان مظہر ہے کہ ان کی قبر شک میں آ گئی تھی۔ مولوی محمد عمر نعیمی مراد آبادی کے نانا شیخ برکت علی نے ان کی میت نکلوا کر جیل کے عقب میں دفن کرائی۔[3]

عبد الغفور خاں نساخ نے "سخن شعرا" مرتب کی تھی تو مولانا زندہ تھے۔ چنانچہ نساخ لکھتے ہیں:

> صاحب علم و فضل و زہد و ورع میں بیشتر اشعار ان
> کے حمد و نعت میں ہیں۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی حضرت مولانا کافی کی نعتیں بڑے شوق سے سنتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ وہ سلطان نعت ہیں۔ ان کی ایک تصنیف "بہار خلد" بتائی گئی ہے یعنی ترمذی کا منظوم ترجمہ۔ اس کا ایک نسخہ ۱۲۔ صفر ۱۲۵۷ھ (۵۔ اپریل ۱۸۴۱ء) کا مخطوطہ انجمن ترقی اردو کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ ۱۲۸۸ھ میں دوسری مرتبہ شائع ہوا تھا۔

مولانا کو طب میں بھی کمال حاصل تھا۔ انھوں نے طب کی تعلیم مولوی رحمان علی صاحب

---

۱ ڈکشنری آف انڈین بائیوگرافی، بک لینڈ۔ ۲ مشاہیر جنگ آزادی صفحہ ۳۱، ۴۲
۳ مشاہیر جنگ آزادی ص ۴۲۔

تذکرہ علماے ہوں کے والد حکیم شبلی سے پائی تھی اور حکیم صاحب کی وفات (۱۲۵۶ھ) پر تاریخ وفات کہی تھی۔[1]

حکیم سعید اللہ

والد کا نام حکیم حافظ عظیم اللہ، دادا کا حکیم حبیب اللہ آنولہ (ضلع بریلی) وطن مالوف تھا۔ ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے۔ رسمی علوم کے علاوہ طب میں بھی دستگاہ خاص بہم پہنچائی اور طب ہی ذریعہ معاش تھی۔

۱۸۵۷ء میں آنولہ کی حکومت نواب کلن خاں کے سپرد ہوئی۔ حکیم سعید اللہ ارکان شوریٰ میں تھے۔ مختلف لڑائیوں میں شریک رہے۔ آخر حکیم سعادت علی خاں مدار المہام رام پور کی سفارش سے جاں بخشی ہوئی۔ ۱۹۰۷ء میں انتقال ہوا۔[2]

---

[1] تذکرہ علماے ہند ص ۷۱ — [2] مشاہیر جنگ آزادی۔

مختلف صاحبان

نواب ولی داد خاں یہ مالاگڑھ، ضلع بلند شہر کے رئیس تھے۔ والد کا نام بہادر خاں اور دادا کا نام حق داد خاں تھا۔ بہادر خاں نے مرہٹوں سے خوب لڑائیاں کی تھیں ۱۸۱۳ء میں وفات پائی۔ حکومت نواب ولی داد خاں کو ایک ہزار روپیہ ماہوار پنشن دیتی تھی۔ غالباً نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بھی قریبی تعلق تھا۔ میرے انداز سے کے مطابق نواب موصوف ولی داد خاں ہی کی وجہ سے ماخوذ ہوئے تھے۔ پہلے تین سال کی قید ہوئی، پھر اپیل پر رہائی پائی۔ نواب ولی داد خاں کو بعض لوگوں نے بہادر شاہ کا سمدھی لکھا ہے، مجھے اس کی مفصل کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت نواب ولی داد خاں دہلی ہی میں تھے۔

نواب معین الدین حسن خاں کے روزنامچے میں مذکور ہے کہ جب منشی موہن لال عرف حسن جان پر دہلی میں آفت آئی اور مجاہدین نے اسے انگریزوں کا آدمی سمجھ کر نقصان پہنچانا چاہا تو اسے ولی داد خاں، تعلقدار مالاگڑھ کی معیت میں دہلی سے باہر بھیجا گیا تھا۔ معین الدین حسن خاں نے اس سلسلے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ولی داد خاں کو شاہی خاندان سے رشتہ داری کا تعلق تھا۔[1]

۱؎ روزنامچے (انگریزی)، ص ۵۰ ۔

تھمتر راو ر کام | بہادر شاہ کے مقدمے میں چار مختلف مقامات پر نواب ولی داد خاں کا ذکر آیا ہے:

۱ - ولی داد خاں کو طلبی کا فرمان پہنچا تو وہ دربار میں حاضر ہوا۔ ارشاد ہوا کہ باقاعدہ حاضر رہا کرے۔[1]

۲ - دریائے جمنا کے مشرقی کنارے پر گوجروں نے بدامنی پھیلا رکھی تھی۔ ولی داد خاں کو حکم ہوا کہ جائے اور بدامنی کو فرو کر دے۔[2]

۳ - ولی داد خاں کی عرضداشت کے جواب میں لکھا گیا کہ جس پہاڑی پر انگریز قابض ہیں، اسے مسخر کر لینے کے بعد فوجی امداد بھیجی جائے گی۔[3]

۴ - ولی داد خاں کے نام فرمان بھیجا گیا کہ علی گڑھ کا مالیہ وصول کرنے کے لیے حسن بخش اور بلند شہر کا مالیہ وصول کرنے کے لیے فیض احمد کو بھیجا جا رہا ہے۔ ان دونوں آدمیوں کو امداد دی جائے۔[4]

انگریزوں کا مقابلہ | غرض جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، نواب کا اوّلین مقصد یہ تھا کہ اپنے علاقے اور جمنا کے درمیان بدامنی کو ختم کر دے۔ وہ مالاگڑھ کی طرف روانہ ہوا تو غازی الدین نگر کے تحصیلدار اور تھانہ دار نے نذر پیش کی۔ نواب نے اپنے سپاہی سڑک کی نگرانی کے لیے متعین کر دیے اور مالاگڑھ پہنچنے کے بعد ضروری انتظامات میں مصروف ہو گیا۔

---

[1] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص ۱۶۲۔ [2] ایضاً ص ۶۶۔ [3] ایضاً ص ۱۴۲۔ [4] ایضاً ص ۱۵۱۔

عین اس موقع پر سانگی پور کا مرزادہ پیادوں اور سواروں کے ساتھ آیا کہ بلند شہر کے کلکٹر نے میرے بیٹے چاند خاں کو کسی ثبوت کے بغیر پھانسی دے دی ہے۔ نواب کو بڑا رنج ہوا اور اس کی دلجوئی کی۔ کلکٹر نے بے تامل نواب کو حکم بھیجا کہ اگر مفسدوں کی طرفداری کی تو تمہیں بھی پھانسی پر لٹکنا پڑے گا۔ اس نہایت غیر ذمہ دارانہ حکم نے نواب کو برافروختہ کر دیا۔[1] اور اکثر انگریز افسر اس زمانے میں اپنی حماقت اور کوتہ اندیشی سے مجبور ہے تھے کہ حاکمیت میں فرعونیت کے انداز قائم رکھے جائیں گے تو رعب قائم رہے گا اور سب ڈر جائیں گے۔ چنانچہ وہ بے توقف نہایت جابرانہ سزائیں دیتے تھے اور فرعونی انداز میں بات چیت کرتے تھے۔ غرض ولی داد خاں نے سرکاری ڈاک روک لی اور انگریزوں سے لڑائیاں شروع ہوگئیں۔

لڑائیوں کی کیفیت

لڑائیوں کی پوری کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔ منشی جیون لال نے ۷۔ جولائی کے حالات میں لکھا ہے کہ نواب ولی داد خاں کی طرف سے عرضداشت آئی، جس میں مذکور تھا کہ مجھ پر بلند شہر کے کلکٹر نے کئی سوگوروں کے ساتھ حملہ کیا، لیکن میں نے مین پور میں اسے شکست دی جو بلب گڑھ سے بارہ میل ہے اور تین توپیں چھین لیں۔[2]

ڈسٹرکٹ گزیٹیر بلند شہر میں بتایا گیا کہ ولی داد خاں ۲۶ مئی کو مالاگڑھ پہنچا تھا۔ بس اس وقت سے جدوجہد شروع کر دی۔ ستمبر تک جگہ جگہ لڑتا رہا، پھر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بریلی چلا گیا۔ بعد ازاں معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں کہاں چھپتا پھرا اور کب وفات ہوئی۔

رفیق

رفیقوں اور معاونوں میں بہت سے نام بتائے جاتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ عبداللطیف خاں بارہ بستی جسے حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔

۲۔ عبداللطیف خاں کا چچا جسے پھانسی کی سزا دی گئی۔

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء صفحہ ۱۹۹ تا ۲۰۰ ۔ [2] روزنامچہ (انگریزی) صفحہ ۱۴۱

۳ - اسماعیل خاں سے چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

۴ - مہدی بخش بہاسے بھی چودہ سال قید کی سزا ہوئی۔

۵ - قاضی فضل علی کی جائداد ضبط کرلی گئی، اس لیے کہ اس نے منصب قضا کا کام انجام دیا تھا۔

رفیقوں میں ایک کھیمن سنگھ کا نام بھی آیا ہے۔ غرض جائدادیں سب کی ضبط ہوئیں۔ مارگڑھ کا قلعہ بارود سے اڑا دیا گیا اور اس سلسلے میں ایک انگریز افسر اور کچھ سپاہی بھی مارے گئے ولی داد خاں کی جائداد بھی ضبط ہوگئی۔

مفتی عنایت احمد کاکوروی مفتی عنایت احمد بن منشی محمد بخش، بن منشی غلام محمد، بن منشی لعمت اللہ۔ ان کی ولادت بہ مقام دیوہ ۹ شوال ۱۲۲۸ھ (۵۔ اکتوبر ۱۸۱۳ء) کو ہوئی۔ تحصیل علم کے لیے پہلے رام پور گئے، جہاں مولوی سید محمد علی رام پوری اور مولوی سید حیدر علی سے پڑھتے رہے۔ پھر دہلی جا کر شاہ اسحاق سے حدیث کی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھ کر سند حاصل کی۔ بعد ازاں علی گڑھ میں مولانا بزرگ علی سے معقول و منقول کی تعلیم حاصل کی۔ ایک سال تک مولانا بزرگ علی کے مدرسے میں مدرس رہے۔ پھر منصف اور مفتی مقرر ہوئے۔ وہاں سے بہ حیثیت صدر امین بریلی میں تبادلہ ہوگیا۔ آخر ترقی کر کے آگرہ میں صدر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ اس اثنا میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔ افراتفری کے باعث آگرہ نہ جا سکے، بریلی اور رام پور ہی میں قیام رہا۔ بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا ملی۔

انڈیمان کی زندگی انڈیمان میں ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی، تاہم حافظے کی بنا پر علم صیغہ، تواریخ حبیب الٰہ وغیرہ کتابیں مرتب کر دیں۔ پھر ایک انگریز کی فرمائش پر تقویم البلدان کا ترجمہ کر دیا اور یہی ترجمہ مفتی صاحب کی رہائی کا ذریعہ بنا[1]۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۱۶۱۔

واپس آکر کان پور میں مدرسۂ فیض عام جاری کیا۔ ۱۲۷۹ھ میں حج کے لیے گئے۔ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے۔ جدہ کے قریب پہنچے تو جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ دوسرے حاجیوں کے ساتھ یہ بھی سمندر میں ڈوب گئے اور درجہ شہادت پایا۔ یہ ۱۷ شوال ۱۲۷۹ھ (۷ اپریل ۱۸۶۳ء) کا واقعہ ہے۔ تذکرہ مشاہیر کاکوری میں مرقوم ہے:

> یہ نہایت ہی متقی و متورع و متبحر فاضل تھے۔ علماء حجاز میں باکمال شمار کیے جاتے تھے۔[1]

چاند پور کے رئیس

میر صادق اور میر رستم علی چاند پور ضلع بجنور کے رئیس تھے۔ انھوں نے ایک عرضداشت بہادر شاہ کے پاس بھیجی تھی۔ بعد فتح دہلی وہ عرضداشت کاغذات دفتر شاہی میں مل گئی۔ بس صرف اس بنا پر ان کا تعلقہ ضبط کر لیا گیا۔

یہی تعلقہ تھا جسے دوسری جائداد کے علاوہ بجنور کے ڈپٹی کمشنر شیکسپیر نے سر سید مرحوم کو ۱۸۵۷ء کی شاندار خدمات کے صلے میں دینا چاہا تھا۔ سر سید نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میرا ارادہ ہندوستان چھوڑ جانے کا ہے لہٰذا جاگیر کو کیا کروں گا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ میں ایک مسلمان بھائی کے خون سے اپنی پیاس نہیں بجھانا چاہتا۔[2]

محمد شفیع بریلوی

یاد ہوگا کہ خان بہادر خاں کو جب بریلی میں حاکم بنایا گیا تھا تو قومی قوت کو اٹھانے اور منظم طریق پر انگریزوں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے جن لوگوں نے امتیازی سرگرمیاں دکھائی تھیں، ان میں بخت خاں کے علاوہ محمد شفیع بھی تھا۔ اسے رسالدار کا منصب حاصل تھا۔ مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ رسالے کے افسر اعلیٰ میکنزی نے محمد شفیع کو روکنے کی ہر چند کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔

---

[1] تذکرہ مشاہیر کاکوری صفحہ ۲۹۶۔ [2] حیات جاوید حصہ اول صفحہ ۷۹، ۸۱۔

توپ خانہ بیلی پر قبضہ کیا اور علم سبز لہرا دیا۔ نواب بہادر خاں کے ساتھ شامل ہو کر انگریزوں سے لڑتا رہا۔ آخری زندگی کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔[1]

لال بہادر خاں میواتی

اصل وطن الور تھا، کچھ مدت الور میں ملازم رہا، پھر سرکار انگریزی میں بھی ملازمت کی۔ اس کے رشتہ دار فتح پور سیکری میں مقیم تھے۔ جب ہر طرف ہنگامے شروع ہو گئے، نیمچ اور نصیر آباد کی فوجیں آگرہ پہنچیں تو لال بہادر خاں بھی ساتھ ہو گیا اور آگرہ کے قلعے تک پہنچ کر لڑتا رہا۔ دہلی کی تسخیر کے بعد انگریزی افواج آگرہ بھیجی گئیں۔ میواتیوں نے فتح پور میں جم کر مقابلہ کیا۔ آخر انگریز کامیاب ہوئے اور میواتیوں کو بری طرح تباہ کیا گیا۔ آگرہ سے دولت شاہ مراکش نے میواتیوں کی سرکردگی قبول کر لی تھی، انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے پھانسی دے دی لیکن لال بہادر خاں ہاتھ نہ آیا۔[2]

اصحاب پٹنہ

پٹنہ میں افراتفری کی خبریں ملیں تو مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق کو بلا کر نظر بند کر دیا گیا۔ پھر ایک مجسٹریٹ مولوی مہدی کو شبہات میں گرفتار کر لیا گیا۔ وارث علی ترہٹ میں پکڑا گیا اور اس کے قبضے سے خط نکلے، جنھیں باغیانہ قرار دیا گیا اور معلوم ہوا کہ پوری تحریک کی روح رواں مولوی علی کریم تھا۔ [illegible] سے قریباً [illegible] میل کے فاصلے پر رہتا تھا اور بڑا ذی اثر مانا جاتا تھا۔ اسے بروقت خبر مل گئی اور گرفتار نہ ہو سکا۔ ہنگامہ ختم ہونے کے بعد مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق رہا ہو گئے۔ آخر الذکر مکہ معظمہ چلے گئے۔ مولانا احمد اللہ، ان کے بھائی مولانا یحییٰ علی اور مولانا عبدالرحیم کو ۱۸۶۴ء اور ۱۸۶۵ء کے مقدمات میں بہ جرم اعانت مجاہدین ضبطی جائداد اور حبس دوام بہ عبور دریائے شور کی سزا ملی۔ وارث علی کو پٹنہ میں پھانسی دی گئی۔ پیر علی خاں لکھنوی، شیخ گھسیٹا اور لطف

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما صفحہ ۱۳۲-۱۳۳۔ [2] ایضاً صفحہ ۱۲۴۔

علی خاں کے حالات پہلے بیان ہو چکے ہیں۔

راجا بینی مادھو بخش یہ ان بہادروں میں سے تھا جنھوں نے جنگ آزادی میں شرکت کی تو نتائج سے بالکل بے پروا ہو کر آخری دم تک لڑتے رہے۔ بیسواڑہ کے علاقے میں شنکر پور کا ناظم تھا۔ سید کمال الدین حیدر لکھتے ہیں:

> اپنی بات پر مستقل و ثابت قدم رہا۔ سرکار انگریزی سے کسی طرح رجوع نہ کی اور جناب عالیہ (حضرت محل) کی رفاقت سے ہاتھ نہ اٹھایا، اگرچہ دامن کوہ میں رہ گیا تھا اور ان کے ساتھ جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ مجبور رہتا۔ آخر کئی سو آدمی ہمراہیوں سے فوج سرکار سے لڑ کر بڑی بہادری سے مارا گیا . . . . بعد رفع ہنگامے کے سرکار انگریزی سے اس کے متعلقین کی بسر اوقات کو کچھ علاقہ ملا، باقی قرق ہو گیا۔[1]

مثالی جوانمردی اس جوانمردی کی ستایش سب کی زبانوں پر جاری ہوئی۔ اپریل ۱۸۵۸ء میں انگریزوں نے مطالبہ کیا تھا کہ مقابلہ چھوڑ دو۔ اس نے جواب دیا کہ میرا جسم میرے آقا کی ملکیت ہے۔ قلعہ میرا ہے، اسے لے سکتے ہو۔ چنانچہ وہ شنکر پور چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر جگہ جگہ سے اس کے بارے میں اطلاعات ملتی رہیں مگر وہ نہ ملا۔ ۲۴۔ نومبر ۱۸۵۸ء اس نے ایک جنگ کی، شکست کھائی مگر بچ نکلا۔ اس کے ساتھی الگ ہوتے گئے۔ آخر میں صرف پانچ ہزار رہ گئے۔ مگر بینی مادھو کے عزم میں فرق نہ آیا وہ بجلی کی طرح ہر طرف کوندتا پھرا اور انگریزوں کو حیران کر دیا۔ آخر مجاہدین کے لیے نیپال کی سرحد کے قریب تھوڑا علاقہ رہ گیا۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم ص ۳۰۳۔

پھر یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں نے حوالگی قبول کر لی مثلاً نواب فرخ آباد، مہدی حسن لکھنؤ کی وغیرہ مگر بینی مادھو اپنے عزم پر قائم رہا۔ ہمیشہ یہی کہا کہ جب تک حضرت محل مخالفت پر قائم ہے میرے لیے حوالگی ممکن نہیں۔ ایک لڑائی دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخری تاریخ کو باکی میں ہوئی۔ بینی مادھو اس سے بھی بچ نکلا۔ زندگی کا آخری دور انتہائی تکلیفوں اور مشقتوں کا دور تھا۔ نیپال پناہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ انگریزوں کے پاس پناہ لینے کے لیے وہ تیار نہ تھا بیان کیا جاتا ہے کہ بینی مادھو اور اس کے ساتھی چتوان، بھٹوال اور نیاکوٹ کے درمیان چکر لگاتے ہوئے بندوقیں دے دے کر چند مٹھی چاول خریدتے تھے۔ گورکھوں نے ان جوانمرد وطن سے نہایت شرمناک سلوک مرعی رکھا۔ آخر بینی مادھو نے گورکھوں سے لڑ کر جان دینا گوارا کر لیا۔ وہ خود بھی مارا گیا۔ اس کا بھائی جوگراج سنگھ بھی مارا گیا۔ ایک بھائی زندہ بچا۔ اس کا بیٹا اور بیوہ دسمبر ۱۸۵۹ء تک نیپال میں تھے، بیٹے کی عمر تیرہ سال کی تھی۔ انگریزوں نے اسے چھ ہزار کی جاگیر دے دی۔ بہرحال بینی مادھو کی جوانمردی کے کارنامے قومی گیتوں میں تبدیل ہو گئے اور یہ اب بھی ہولی کے موقعے پر گاتے جاتے ہیں۔

راجا لال سنگھ

راجا لال سنگھ نصرت جنگ، درشن سنگھ غالب جنگ کا فرزند تھا۔ بڑا قابل شخص تھا اور اکثر اس سے کلکٹری یا انتظام علاقہ جات یا انتظام شہر کی خدمات کی جاتی رہیں۔ جنگ آزادی میں وہ برابر شریک رہا۔ جب انگریز کامیاب ہوئے تو روپوش ہو گیا۔ ملکہ وکٹوریہ کا اعلان عفو عام ہونے پر وہ واپس آیا اور اپنے دیہات پر قابض ہو گیا۔ میجر بیروس افسر پولیس کے سررشتہ دار دیبی پرشاد نے دشمنی کی بنا پر اسے گرفتار کرا دیا اور ایک انگریز کپتان کے قتل کا الزام اس پر عائد ہو گیا۔ کئی مہینے تک قید میں اتنی مصیبتیں جھیلیں کہ جینے سے تنگ آ گیا تھا۔ آخر پھانسی کی سزا سنائی گئی۔

پھانسی کی کیفیت دیکھنے والوں نے پھانسی دیے جانے کی کیفیت یوں بیان کی ہے کہ بتاریخ یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء بروز شنبہ راجا کو اس مقام پر لائے جہاں انگریز کے قتل ہونے کا گمان تھا۔ دستور کے مطابق مجسٹریٹ موقع پر آیا۔ ہزاروں لوگ جمع تھے:

> راجا نے اپنے ہاتھ سے گلے میں پھانسی ڈالی، جب تختہ
> کھینچ لیا، کام تمام ہوگیا۔ ڈیڑھ روپے کا کفن دے کر
> وہیں . . . خاک میں ملا دیا[1]

یہ ان رؤسا سے انگریزوں کے سلوک کی حالت تھی جو پشتوں سے امتیازی درجے کے مالک چلے آتے تھے اور سیکڑوں آدمی ان کے متوسل تھے۔ "جرم" کی سزا بھی سہی لیکن یہ سلوک کہ بہت بڑے امیر اور جاگیردار کے لیے اس کے دھرم کے مطابق آخری مراسم کا انتظام کرنے میں بھی بخل سے کام لیا گیا؟

نواب محمد حسن خاں یہ ارتضیٰ خاں کے فرزند تھے اور انھیں دو سو روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں میرزا خضر سلطان کے مختار اور معتمد علیہ ایجنٹ بن گئے تھے۔ میرزا مغل بھی ان سے کام لیتے رہے۔ ہنڈن ندی اور بادلی کی سرا کی لڑائیوں میں یہ مجاہدین آزادی کے ایک جیش کی کمان کر رہے تھے۔ جھجر کے علاقے سے حکیم عبدالحق اور احمد قلی خاں کے ساتھ گرفتار ہوئے۔[2] انھیں بھی حکیم محمد عبدالحق کے ساتھ ہی پھانسی کی سزا دی گئی۔[3] خواجہ حسن نظامی نے ان کا نام محمد حسین خاں لکھا ہے، نیز فرمایا ہے کہ صحت خراب تھی اور قرضدار ہوگئے تھے۔ کثیر الاولاد تھے۔ ان کے بعد متعلقین بہت پریشان حال رہے۔

---

[1] قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۱۱، [2] میوٹنی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ اول صفحہ ۲۹۲، [3] غدر کا نتیجہ صفحہ ۵۸

عبدالصمد خاں

نواب عبدالرحمان خاں والی جھجر کے خسر تھے۔ ڈھائی سو سوار ان کے ماتحت تھے۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچے تو ہمت و مردانگی سے جنگی کارروائیوں میں حصہ لیتے رہے۔ بہادر شاہ کے مقدمے میں میرزا مغل کی ایک عرضی سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب عبدالصمد خاں سے جنگی مشورے لیے جاتے تھے۔

جب دہلی میں ناکامی ہوئی تو یہ باہر نکل گئے۔ دیر تک اپنے سواروں کو جابجا لڑاتے رہے۔ پھر ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ یہ یقینی ہے کہ نہ کسی جنگ میں مارے گئے اور نہ گرفتار ہوئے۔

نورالہدیٰ

ان کے پورے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ ۲۹- اگست کے "پنجابی" سے معلوم ہوا کہ یہ پونا چھاؤنی میں رہتے تھے اور ان کے ذریعہ سے دکن میں جہاد کے لیے تنظیم کا کام جاری تھا۔ قاضی بلگام اور حیدرآباد شہر کے بعض اکابر سے مولوی نورالہدیٰ نے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔ ان کی خط و کتابت کی نگرانی شروع ہوئی۔ بلگام کے ڈپٹی کمشنر نے چند خط کھولے تو حقیقت حال کا انکشاف ہوا۔ اس نے تار بھیج کر مولوی صاحب کی گرفتاری کی ہدایت کی۔ ایک روز وہ خط لینے کے لیے ڈاک خانہ پہنچے تو انھیں گرفتار کر کے پہلے کوارٹر گارد میں رکھا گیا، پھر تین اور ساتھیوں کے ہمراہ تھانہ جیل میں بھیج دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ تین سال پیشتر وہ جہاد ہی کے مواعظ کی بناء پر احمد نگر سے نکالے گئے تھے۔

انگریزوں کو ان کے خلاف سخت غصہ تھا۔ بار بار پوچھتے تھے کہ انھیں فوراً توپ سے کیوں نہ اڑا دیا گیا؟ یہ جولائی کے اواخر کا واقعہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بعد میں مولوی نورالہدیٰ سے کیا سلوک ہوا۔

طرہ باز خاں اور علاؤالدین

حیدرآباد دکن کی مکہ مسجد بہت بڑی اور مشہور مسجد ہے۔ وہاں شوال ۱۲۷۳ھ (جون ۱۸۵۷ء) میں ایک

جلسہ ہوا تھا، جس میں رشید الدین خاں امیر پائیگاہ بھی شریک تھے۔ اس جلسے سے پیشتر مکہ مسجد اور چار مینار پر اشتہار لگائے گئے تھے، جن میں مسلمانوں سے جہاد کے لیے اپیل کی گئی تھی۔ بعد میں جلسے ہوتے رہے۔ ۱۶ جولائی کو ایک بڑے ہجوم نے ریزیڈنسی پر حملے کی تیاری کی، مولوی علاؤ الدین اس کے لیڈر تھے۔ راستے میں طرہ باز خاں روہیلہ جمعدار بھی اپنے آدمیوں کو لے کر حملہ آوروں میں شریک ہوگیا۔ ریزیڈنسی سے توپیں چلنی شروع ہوئیں۔ حملہ آور پہلے بہل ادھر ادھر چھپ گئے، پھر منتشر ہو گئے۔ مولوی علاؤ الدین اور طرہ باز خاں کی گرفتاری کا حکم صادر ہوگیا اور وہ روپوش ہو گئے۔

۲۲ جولائی کو طرہ باز خاں گرفتار ہوا۔ وہ بیچارہ مقابلے میں سخت زخمی ہو چکا تھا۔ مقدمے میں اس کے لیے کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی۔ جنوری ۱۸۵۹ء میں وہ قید سے نکل بھاگا اور جنگل میں چلا گیا۔ تعاقب کیا گیا۔ دوبارہ گرفتاری سے بچنے کی کوشش میں شہادت پائی۔ نعش حیدر آباد لائی گئی۔ بعد شہادت اس کے پاس سے دو تلواریں، ایک طپنچہ، دس روپے اور کچھ آنے برآمد ہوئے۔ شہادت کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ ۲۴ فروری ۱۸۵۹ء کا واقعہ تھا۔

مولوی علاؤ الدین کے لیے بھی کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی تھی۔ سزا کے وقت اس کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ چنانچہ وہ انڈیمان گیا اور سرسٹھ سال کی عمر میں وہیں وفات پائی۔ گویا بتیس سال انڈیمان میں گزارے۔ بارہا رہائی کے لیے درخواستیں بھیجی گئیں لیکن کوئی درخواست منظور نہ ہوئی۔ مولوی علاؤ الدین کا تعلق ایک پرانے علمی گھرانے سے تھا اور وہ خود اعلیٰ پایے کا عالم اور پرہیزگار بزرگ تھا۔

حکیم محمد عبدالحق حکیم محمد عبدالحق بن محمد حسن بخش، اصل وطن دہلی تھا۔ مدت تک راجا نابر سنگھ والی بلبھ گڑھ کے ایجنٹ رہے۔[1] خواجہ حسن نظامی مرحوم لکھتے ہیں کہ بلبھ گڑھ میں دیوانی پر مامور تھے، خوب روپیہ پیدا کیا اور مالدار ہو گئے۔ بھیر

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء ص ۱۲۷۔

ملازمت سے مستعفی ہوکر گھر آ گئے۔ چونکہ احمد مرزا اور جے سکھ راؤ کے لڑکوں کی وجہ سے نواب حامد علی خاں کے ہاں آنا جانا تھا، اس لیے پھانسی دی گئی۔

میوٹنی ریکارڈس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں حکیم صاحب بہادر شاہ کے ایڈیکانگ بن گئے تھے۔ ان کے ماتحت چار سو سواروں اور پیادوں کا لشکر تھا، جو انگریزی فوج سے لڑتا۔ ان میں سے دس بارہ مقتول و مجروح ہوئے۔ اس فوج میں حکیم صاحب کا ایک عزیز اکبر علی جمعدار تھا۔ وہ بھی زخمی ہوا تھا اور زخموں کی وجہ سے وفات پائی۔[1]

حکیم صاحب باقاعدہ دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ اس کمیٹی کے ممبر تھے، جو جنگ کے لیے روپیہ فراہم کرنے کی غرض سے بنائی گئی تھی۔ ضلع گوڑگانوہ کا انتظام ان کے سپرد تھا۔[2]

بہادر شاہ کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ راجا بلبھ گڑھ نے ۲۲۔ اگست ۱۸۵۷ء کو ایک عرضی دی تھی، جس میں مختلف آدمیوں پر الزام لگایا تھا کہ وہ روپیہ لے کر دہلی چلے گئے۔ اس میں حکیم عبدالحق کے خلاف دس لاکھ روپے کا الزام لگایا گیا تھا۔[3] ایک مقام پر ذکر ہے کہ حکیم صاحب دربار میں آئے اور پانچ روپے نذر کے طور پر پیش کیے۔[4]

ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا اور انھیں پھانسی کی سزا دی گئی۔[5]

جنرل نیاز محمد خاں

یہ بھی بڑے مجاہدوں میں سے تھا۔ خوب لڑتا رہا۔ آخری شکست کے بعد مکہ معظمہ چلا گیا تھا۔ کئی سال وہاں گزارے، پھر ہندوستان آیا تو نواب جوناگڑھ کے پاس ملازم ہو گیا۔ ۱۸۶۲ء میں یہ بھی گیا ہوا تھا۔ وہاں پہچان لیا گیا، گرفتار ہوا اور مقدمہ چلا جس میں پھانسی کی سزا ہوئی۔ ہائی کورٹ نے سزائے موت کو حبس دوام بہ عبور دریائے شور میں بدل دیا۔ انڈیمان ہی کی آغوش میں آسودہ ہے۔

---

[1] میوٹنی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ دوم ص ۲۶۲ — [2] جلد ہفتم حصہ دوم ص ۲۶۲ — [3] بہادر شاہ کا مقدمہ (انگریزی) ص ۵۶ — [4] ایضاً ص ۱۶۰ — [5] میوٹنی ریکارڈس جلد ہفتم حصہ اول ص ۲۶۲

سید محمد اسحاق اصل وطن ٹونک تھا، اسحاق کے والد اور تایا وہاں ملازم تھے اور نواب انھیں بڑے احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اسحاق کے بچپن ہی میں والدوفات ہو چکے تھے، والدہ نے تربیت کی۔ دہلی میں بھی تعلیم پائی۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی پہنچ کر مختلف لڑائیوں میں حصہ لیا۔ پھر ٹونک چلا گیا۔ سرحد پر گرفتاری عمل میں آئی۔ نواب نے خود مداخلت کر کے رہا کرایا۔ بعد ازاں کابل چلا گیا کہ ہندوستان سکونت کے قابل نہیں رہا تھا۔

سید گلزار علی ان کا اصل وطن امروہہ اور والد کا نام سید اکبر علی تھا، (بن سید قرب بن سید عبدالواحد بن سید عبدالباری بن دلوان سید محمود) طبیعت کے بڑے فیاض تھے۔ ساری جایداد ختم کر کے مختاری کا امتحان پاس کیا اور مراد آباد کی عدالتوں میں مختاری کا کام کرتے رہے۔ ۱۹-مئی ۱۸۵۷ء کو مراد آباد کا جیل خانہ ٹوٹا تو سید گلزار علی امروہہ پہنچے اور وہاں قومی تنظیمات شروع کر دیں۔ ایک عرضداشت بھی بہادر شاہ کے پاس بھیجی جس کا مفاد یہ تھا کہ شیخ بشارت علی خاں کو یہاں انتظام کے لیے چھوڑ کر خود چالیس آدمیوں کے ساتھ خدمت گذاری کے لیے دہلی پہنچ رہا ہوں۔
سید گلزار علی کے مکانات منہدم کرا دیے گئے۔ یہ روپوش رہے اور اسی حالت میں وفات پائی۔

میرزا بیدار بخت مفتی انتظام اللہ فرماتے ہیں کہ یہ بہادر شاہ کے پوتے تھے۔ تاناصاحب اور عظیم اللہ خاں کے مشورے کے مطابق ایک اخبار دہلی سے نکالا تھا جس کا نام "پیام آزادی" تھا اور اس نے ۱۸۵۷ء میں بڑی خدمات انجام دیں۔ انگریزی تسلط کے بعد یہ گرفتار ہوئے اور ان کے جسم پر سور کی چربی مل کر پھانسی دی گئی[1]

---

[1] ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما صفحہ ۱۲۷۔ "پیام آزادی" کے نام سے ایک اخبار کے اجرا کا ذکر منشی عظیم اللہ خاں کے حالات میں بھی آچکا ہے۔

سعادت خاں بیان کیا جاتا ہے کہ سعادت خاں اندور کے اس خاندان کا چشم و چراغ تھا جسے ریاست پر بخشی گری کا منصب مدت تک حاصل رہا اور اس کا والد رسالدار تھا۔ نیز اسے جنگی کے محکمے میں بھی عہدہ حاصل تھا۔ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ سعادت خاں کو اندور میں خاصا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے کوئی حیثیت حاصل نہ تھی اور بیکار پھر رہا تھا۔

یکم جولائی کو اندور میں انگریزی ریذیڈنسی پر یورش ہوئی تو مجاہدین میں پیش پیش بھی سعادت خاں تھا۔ یہ اس یورش میں زخمی بھی ہوا لیکن انگریز ریذیڈنسی کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہاراجا اندور نے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ بعدازاں یہ اپنے خاندان کے ساتھ ریذیڈنسی میں رہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا انجام کیا ہوا۔

[illegible] دہلی

تاریخ وسوانح پر منتخب کتابیں

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
رحمۃ للعالمین مولانا قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری	مقبول عام سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تین جلدوں میں۔ سائز ½۶ × ۱۰، ضخامت جلد اول ۳۸۰ صفحات، جلد دوم ۴۷۸ صفحات جلد سوم ۴۸۸ صفحات، کتابت وطباعت نفیس	جلد اول ۴/- جلد دوم ۶/۸ جلد سوم ۶/۸
بہادر شاہ ظفر اور اُن کا عہد سید رئیس احمد جعفری	۱۸۵۷ء کی عالم آشوب تحریک انقلاب کی مکمل، مستند اور مفصل انسائیکلوپیڈیا (دوسرا ایڈیشن) سائز ½۶ × ۱۰، ضخامت ۱۶۳۴ صفحات، ۱۳ رنگین وسادہ تصاویر کے ساتھ۔	۲۰/-
واجد علی شاہ اور اُن کا عہد سید رئیس احمد جعفری	عہد واجد علی شاہ کی مکمل، مستند اور مفصل انسائیکلوپیڈیا سائز ½۶ × ۱۰، ضخامت ۷۲۲ صفحات۔ متعدد نادر تصاویر	۱۲/۸
سیرت محمد علی سید رئیس احمد جعفری	بعض سر بستہ رموز کے انکشافات کے ساتھ سائز ۵ × ½۷، ضخامت ۶۰۰ صفحات	۶/-
کمال اتاترک استاذ محمود محمد توفیق مصری ترجمہ۔ کرم الٰہی خاموش	دنیا میں کمال اتاترک کی سوانح اس سے اچھے پیرایے میں کسی زبان میں نہیں لکھی گئی سائز ۵ × ½۷، ضخامت ۳۶۸ صفحات (ساتواں ایڈیشن)	۴/۱۲
انوار اولیاء سید رئیس احمد جعفری ندوی	بزرگان دین کی سیرت وکردار کا انسائیکلوپیڈیا (تیسرا ایڈیشن) سائز ½۷ × ۱۰، ضخامت ۷۰۰ صفحات	۱۰/-

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران وتاجران کتب کشمیری بازار لاہور ۔ حیدرآباد ۔ کراچی

نام کتاب	مختصر تفصیل	قیمت
خواجہ غریب نواز ادارہ تصنیف وتالیف	حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مکمل و مستند سوانح سائز ۵×۹ ضخامت ۲۰۰ صفحات	۳/-
تاتاریوں کی یلغار تصنیف:- ہیرلڈلیم ترجمہ:- عزیز احمد	تاتاریوں کی مکمل سرگزشت۔ ہیرلڈلیم کی شہرۂ آفاق کتاب "THE MARCH OF THE BARBARIAN" کا مکمل اور مستند اردو ترجمہ۔ سائز ۶×۱۰ ضخامت ۴۰۰ صفحات	۱۲/-
حکمائے عالم تصنیف:- قفطی ترجمہ:- ڈاکٹر غلام جیلانی برق	چارسو گیارہ اسلامی و یونانی فلاسفہ و حکمائے کے حالات کا شاندار مرقع۔ سائز ۵×۹ ضخامت ۴۴۰ صفحات	۱۰/-
حسینؓ ابن علیؓ پروفیسر نکہت شاہجہانپوری	سیرت امام حسین نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے سائز ۳×۸ ضخامت ۱۰۸ صفحات	۲/-
دید و شنید سید رئیس احمد جعفری	زندہ و پائندہ ہستیوں کا بے نظیر مرقع سائز ۵×۷ ضخامت ۶۷۵ صفحات	۶/۸
تذکرۃ الاولیاء سائز ۷×۱۰	شیخ فریدالدین عطار کی مشہور کتاب کا اردو ترجمہ جس میں تمام اولیاء اللہ کے حالات زندگی نہایت عام فہم زبان و انداز میں لکھے گئے ہیں۔	۳/-
سیرت ائمۂ اربعہ سید رئیس احمد جعفری	حضرت امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے مفصل مکمل اور مستند سوانح حیات۔ سائز ۵×۹ ضخامت ۶۲۰ صفحات	۷/۸
انوار انبیاء ادارہ تصنیف وتالیف	انبیاء کرام کے حالات زندگی جن کا ذکر قرآن کریم، احادیث صحیحہ، بائبل و دیگر تاریخی کتب میں آیا ہے۔ سائز ۷×۱۰ ضخامت ۵۱۲ صفحات۔ طباعت آفسٹ	۱۰/-

شیخ غلام علی اینڈ سنز ناشران و تاجران کتب کشمیری بازار لاہور - بندر روڈ کراچی